بالاخانے کی ڈولی

الیاس سیتاپوری



الیاس سیتاپوری

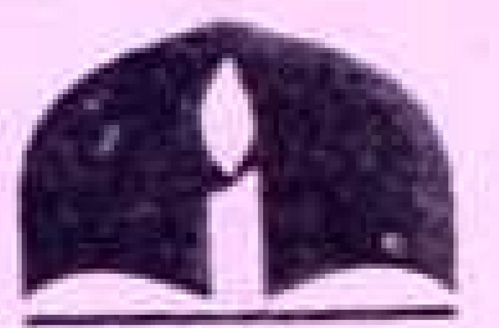
کی

منتخب تاریخی کہانیاں

چھٹا مجموعہ

بالاخانے کی دلہن

شمع بک ڈپو،
آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲



شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

قیمت : ۱۵ روپے

طباعت : لکشمی پرنٹنگ پریس، لال کنواں، دہلی، فوٹو آفسیٹ کے ذریعہ طبع ہوئی۔

زیرِ اہتمام : مظفر الدین احمد

ہندوستان کے لئے :

پہلی بار فروری ۱۹۸۲



جاناں کا مقتل

جب تک نادر کو شہزادے سلیم کا مستقبل تابناک نظر آتا رہا وہ اس کے ساتھ رہا لیکن جیسے ہی اس نے محسوس کیا کہ شہزادہ اپنے باپ اکبرِ اعظم سے مقابلہ کرنے میں مذبذب ہے، اس کی فکر کا انداز ہی بدل گیا۔ اب وہ ان دو ہاتھیوں کی لڑائی کے درمیان نہیں آنا چاہتا تھا اس نے شہزادے سلیم سے نہایت دانائی سے علیحدگی کی اجازت حاصل کر لی اور اسی کی ایما پر بنگالے روانہ ہو گیا۔ ان دنوں بنگال کی صوبے داری پر شہزادے سلیم کا برادرِ نسبتی راجا مان سنگھ فائز تھا۔

اس سرسبز و شاداب دریاؤں کی سرزمین نے اسے بے حد متاثر کیا۔ راجا مان سنگھ نے اسے اپنے اصطبلوں کا نگراں بنا دیا۔ پرانا نگراں بوڑھا ہو چکا تھا۔ قلعے کے اندر ہی اس کا قیام تھا۔ عہدے سے سبکدوشی کے بعد اصولاً اسے اپنی قیام گاہ چھوڑ دینی چاہیے تھی لیکن نادر تنہا تھا اس لیے اس نے اس قیام گاہ کے دو کمرے خالی کرا لیے۔ بقیہ میں بوڑھا نگراں اپنے تین

نفری کنبے اور دو ملازموں کے ساتھ رہتا رہا۔ ملازموں میں ایک عورت بھی اور ایک مرد، وہ بڑے میاں کی منظوری سے مرد ملازم سے اپنے کام بھی لینے لگا۔ بوڑھے نوازش علی کو اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ نادر اس منصب پر شہزادے سلیم کی وساطت سے آیا ہے تو وہ اس کا جینا حرام کر دیتا۔ وہ اس منصب پر اپنے بھتیجے شیر باز کو فائز دیکھنا چاہتا تھا لیکن بار بار بلانے کے باوجود وہ آگرے سے نکلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ مان سنگھ کے دبدبے اور شہزادے سلیم کے خوف سے نوازش علی نے خاموشی اختیار کر لی لیکن اس کے انداز اور تیور میں حسد اور کھسیانا پن صاف محسوس ہوتا تھا۔ اس نے معلوم نہیں کس دل سے نوجوان نادر سے یہ مربیانہ سلوک بھی روا رکھا کہ اس کے کھانے پینے کے معقول بندوبست کے ہونے تک یہ ذمے داری اپنے سر لے لی۔

اصطبل کے عملے اور جانوروں کے تفصیلی جائزے کے بعد اس نے ملازم ننھے کو ساتھ لیا اور قلعے کے باہر گھوم پھر کر علاقے کے جغرافیائی محلِ وقوع اور مقامی لوگوں کے خدوخال اور عادات و اطوار کا جائزہ لینے نکل کھڑا ہوا۔ یہاں اس نے جگہ جگہ ٹیلے کھڑے دیکھے جن کی زیادہ سے زیادہ اونچائی دس گز اور چوڑائی بیس گز تھی۔ اس نے اپنے ملازم رہبر سے پوچھا۔ "یہ یہاں کثیر تعداد میں ٹیلے کیوں تعمیر کئے گئے ہیں؟"

ننھے نے جواب دیا۔ "حضور! یہاں سیلاب اور طوفان کا بڑا زور رہتا ہے، ان کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لئے یہاں والے ان ٹیلوں پر چڑھ جاتے ہیں۔"

اتنے میں چند سیاہ فام عورتیں ان کی طرف بڑھتی نظر آئیں ان کے جسم تقریباً عریاں تھے انھوں نے قریب آتے ہی مقامی زبان میں ننھے سے کچھ پوچھا اور جواب پاتے ہی ان عورتوں نے نادر کے قدموں میں جھک کر سلام کیا۔

نادر کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے ننھا اس کی پریشانی بھانپ گیا۔ ہنستے ہوتے بولا "حضور ابھی نئے ہیں، بغیر بتائے مقامی رسم و رواج نہیں سمجھ سکیں گے۔" پھر ان عورتوں کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا "یہ یہاں کی مقامی سیاہ کی عورتیں ہیں اور یہاں کا یہ دستور ہے کہ اعلا منصب داروں کے روبرو تعظیم و تکریم کے لئے مردوں کی جگہ ان کی عورتیں جایا کرتی ہیں یہ عورتیں بھی اسی غرض سے حاضر ہوئی ہیں۔"

سیاہ چمکتے ہوتے گدرائے جسموں میں تناسب اس غضب کا تھا کہ نادر ان کے رنگ کو بھلا بیٹھا اور ان کے رس میں کھو گیا، ان کی عریاں باہیں آبنوس کی تراشی ہوئی گول شاخیں تھیں اور بیضوی مسکراتے ہوتے چہرے کسی ماہر سنگ تراش کے ایسے شاہکار تھے جو سنگِ اسود (سیاہ پتھر) تراش کر بنائے گئے ہوں، ان کے مدّ و ابھار جسم کی حرکت سے یوں ہلنے لگتے جیسے کپڑے کے اندر دو فاختائیں پھڑ پھڑا رہی ہوں۔

چالاک منشی نادر کی محویت اور انہماک کا مفہوم سمجھ گیا۔ بولا "حضور! یہ بنگال ہے، مقامی زبان میں بنگ جگہ کو کہتے ہیں اور آل کا مطلب ہے ٹیلے، بنگال یعنی ٹیلوں کی سرزمین۔" پھر اپنا مطلب اشاروں میں ادا کرتا ہوا بولا۔ "یہ سرزمین ہی ٹیلوں کی ہے، ٹیلوں کی کیا فکر کرنا، جتنے درکار ہوں گے مل جائیں گے!"

عورتیں تعظیم و تکریم بجا لانے کے بعد چلی گئیں لیکن نادر کے جذبات میں آگ لگ گئیں۔ وہ شمالی ہند سے تعلق رکھتا تھا جہاں عورتیں پردے میں رہتی ہیں لیکن یہاں ان کا جلوہ بے محابا تھا۔ ایک کیف، ایک نشہ، ایک مستی سارے خون کے ساتھ دوڑنے لگی۔

جب وہ کمرے کا قفل کھول کر اندر داخل ہوا تو ایک نہایت حسین اور وحشت زدہ لڑکی کو اندر کھلنے والے دروازے کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا۔ وہ معلوم نہیں کس چیز سے الجھ کر گر گئی۔ نادر تیزی سے آگے بڑھا اور اندرونی دروازے سے پشت لگا کر کھڑا ہو گیا۔ اب لڑکی کے بھاگنے کی راہ بند ہو چکی تھی۔

لڑکی وحشت زدہ سی اٹھی اور اس کی نظریں جو نادر سے ٹکرائیں تو نادر کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو گئی ان میں ایک سحر تھا جس نے نادر کے اندر کی دنیا کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ سینے کا تموج ایک بھونچال تھا جس سے نادر کا وجود ہلنے لگا، گلابی چہرہ شراب تھا جس نے نادر کو بے خود و بے بس کر دیا۔ ابھی وہ کسی نتیجے پر بھی نہ پہنچا تھا کہ کسی نے پشت پر زور سے دھکا دیا اور وہ اپنی جگہ سے دھکتا ہوا آگے کو دوڑ سا گیا۔ دروازہ پاٹوں پاٹ کھل گیا اور لڑکی غڑاپ سے اس میں داخل ہو گئی۔ اس نے پھرتی سے گھوم کر بند ہوتے ہوتے دروازے میں جو دوسری شکل دیکھی وہ گھر کی خادمہ فتے کی تھی۔ تیس بتیس سالہ گدرائے ہوئے جسم اور تیکھے نقوش والی سجی سنوری فتے۔

کمرے میں بیٹھ کر وہ دیر تک اندرونی دروازے سے کان لگائے بیٹھا رہا جہاں اس کی معلومات کے مطابق سابق داروغہ اصطبل کی نوجوان خوبصورت بیٹی حور بانو موجود تھی اس نے حور بانو کی آواز یا چوڑیوں کی کھنک سننے کے لئے گھنٹوں دروازے سے کان لگائے رکھے لیکن اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ اس طرح کئی دن گذر گئے۔ منصبی امور سے فرصت پا کر وہ جب بھی واپس آتا اس کی توجہ کا مرکز حور بانو کا خیال ہوتا۔ حور بانو اپنی ایک جھلک سے اس کے ہوش و حواس پر چھا گئی۔

اندر کی خادمہ فتے اب جب بھی اس کے کمرے میں آتی، ادھر ادھر کی باتوں میں کافی وقت گزار دیتی۔ بظاہر دونوں ہی چند دن پہلے پیش آنے والے حسین حادثے کو بھلا چکے تھے لیکن ابھی نادر کے دل میں ایک آگ لگی ہوئی تھی۔ ایک دن جب فتے آئی تو اس کی گود میں ایک نہایت

خوبصورت بلّی دبی ہوئی تھی۔ نادر نے پوچھا۔ "یہ بلّی پالنے کا کسے شوق ہے؟"

فتّے نے جواب دیا۔ "حور بانو بی بی کو۔ وہ اس سے بہت محبت کرتی ہیں!"

نادر نے بلّی کو اپنی گود میں لے لیا۔ اس نے دو ایک بار میاؤں میاؤں کیا اور نادر کو اجنبیت سے دیکھنے لگی۔ اسے بلّی میں حور بانو کی شبیہہ نظر آ رہی تھی۔ اس نے اسے اپنی ناک سے لگا لیا تو ایک عجیب سی خوشبو محسوس کی۔ حور بانو کے کنوارے جسم کی خوشبو، سارے جسم میں ایک مستی، ایک کیف دوڑ گیا۔ پھر اچانک ایک خیال کے تحت اس نے فتّے سے پوچھا "اندر کون کون ہے؟"

فتّے نے جواب دیا "حور بانو اور ان کی والدہ۔ نوازش علی میاں کہیں گئے ہوئے ہیں!"

نادر نے پوچھا۔ "یہ بتاؤ تمہاری بی بی کچھ پڑھی لکھی بھی ہیں؟"

فتّے نے کچھ سمجھتے ہوئے جواب دیا "خوب اچھی طرح۔ کیوں؟"

نادر نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا "حور بانو کی والدہ کے کیا مشاغل ہیں؟"

فتّے نے جواب دیا۔ "مشاغل کیا ہوں گے بیماری کے، ان کا زیادہ وقت افیون کے نشے میں گزر جاتا ہے۔ اس وقت بھی نشے میں پڑی ہوئی ہیں!"

نادر کو جیسے اطمینان سا ہو گیا۔ بولا "فتّے! اگر تم چاہو تو ہم تمہیں مالا مال کر سکتے ہیں، ہم یہاں تنہا ہیں، تم ہمارے کام بھی کر دیا کرو، ہم تمہیں اس کا معقول معاوضہ دے دیا کریں گے!"

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور لکھ کر بلّی کے گلے میں ایک رقعہ باندھ دیا۔ "خوبصورت بہت خوبصورت۔ بالکل حوروں جیسی، بلکہ حور۔۔۔۔" وہ حور کے آگے بانو بھی لکھنا چاہتا تھا لیکن حوصلہ نہ پڑا۔ پھر بلّی کے ساتھ فتّے کو ایک اشرفی بھی ملی۔ فتّے نے جھجکتے جھجکتے اشرفی مٹھی میں دبالی۔

جب وہ واپس جانے لگی تو نادر نے بہکی بہکی آواز میں کہا "فتّے! حور بانو سے کہنا آپ کی بلّی بہت حسین ہے۔ شاید آپ ہی کی طرح اور دیکھو یہ بلّی انہی کی گود میں دینا اور کہنا ہم اس گستاخی کی معافی چاہتے ہیں!"

فتّے چلی گئی۔ نادر رات گئے تک کسی خطرے کا منتظر رہا۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ حور بانو پر اس کی اس حرکت کا کیا اثر ہوا ہو گا۔ پوری رات بے چینی اور اندیشے میں گزر گئی۔ صبح جب نوازش علی سے اس کا سامنا ہوا اور انہوں نے بے دلی سے اس کے سلام کا جواب دیا تو اس کی تشویش میں کچھ زیادہ اضافہ ہو گیا۔ فتّے دو ایک بار آئی بھی تو زیادہ دیر ٹھہری نہیں، اسے ایسا محسوس ہوا جیسے پورا ماحول اس کی شرارت اور دل کے چور سے واقف ہو چکا ہے۔ وہ اپنے کمرے ہی میں پڑا رہا کہیں

جا بھی نہ سکا۔

دوپہر سے ایک گھنٹے پہلے اس نے نوازش علی کو گھوڑے پر سوار کہیں جاتے دیکھا تو کچھ جان میں جان آئی۔ اس نے باہری دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کچھ ہی دیر بعد دروازے پر کسی نے دستک دی، اس نے مرتعش ہاتھوں سے جب دروازہ کھولا تو فتّے پہلے دن کی طرح بلی کو گود میں دبائے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ فتّے نے اندر آتے ہی بلی کو نادر کی گود میں دے دیا اور کہنے لگی۔ "حور بانو کہہ رہی تھیں کہ بلی اتنی خوبصورت تو نہیں ہے، لیکن حسنِ ذوق اپنی جگہ ہے۔ بہر حال یہ جسارت ناقابلِ معافی ہے۔"

نادر کی ہمت بندھی اور جان میں جان آئی کہ حور بانو بھی تیار ہے۔ نامہ و پیام کا سلسلہ مشکل تھا لیکن حور بانو تو اتنی حسین تھی کہ اس کے لئے بڑی سے بڑی جراُت کی جا سکتی تھی۔ سو نادر نے نوازش علی کی عدم موجودگی میں کئی مرتبہ حور بانو کو دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کی جسارت کی۔

پھر کئی دن اسی طرح نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہا۔ فتّے مستعدی، رازداری اور ہوشیاری سے یہ خدمت انجام دیتی رہی، یہاں تک کہ بات خط و کتابت تک جا پہنچی، ابتدائی مخطوط میں دونوں طرف سے ذہانتوں کی نوک جھونک ہوتی رہی، پھر یہی نوک جھونک مروّت اور لحاظ کا رنگ اختیار کرنے لگی اور آخر مروّت اور لحاظ نے محبّت کی شکل اختیار کر لی اور خطوں میں سوز و سازکی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اسی طرح ایک دن جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اسے اپنے صندوق کے پاس سونے کی ایک بالی پڑی ہوئی دکھائی دی، اس نے اسے اٹھا لیا۔ ابھی وہ اس پر غور ہی کر رہا تھا کہ فتّے چوروں کی طرح کمرے میں داخل ہوئی اور اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ نادر نے صاف یہ محسوس کر لیا کہ فتّے باتیں تو اس سے کر رہی ہے لیکن اس کی نگاہیں زمین پر اِدھر اُدھر کچھ تلاش کر رہی ہیں۔

نادر بالی ہتھیلی پر رکھ کر اسے دیکھنے لگا۔ فتّے اس کی طرف لپکی اور خوشامد سے کہنے لگی۔

"یہ بالی مجھے دے دیجئے۔ یہ کہاں ملی؟"

نادر نے اسے مٹھی میں بند کر لیا اور چھیڑنے کے لئے پوچھا "یہ ہے کس کی؟"

فتّے نے ٹالنا چاہا، بولی۔ "کسی کی بھی ہو یہ آپ مجھے دے دیجئے۔"

نادر اسے کرتے کی جیب میں رکھ کر بولا "جب تک یہ نہ بتاؤ گی کہ کس کی ہے اور یہاں کیسے آئی میں نہیں دوں گا!" پھر اندرونی دروازے کے پیچھے کسی کی آہٹ محسوس کر کے بولا۔ "آج تو چور پکڑا گیا۔"

اسی لمحے اندرونی دروازے کے پیچھے سے چوڑیوں کے کھنکنے کی آواز سنائی دی

اور دبی دبی ایک مترنم آواز آئی۔ "خدا کے لئے دے دیجئے آئندہ آپ کے کمرے میں نہیں آؤں گی!"

فتّے نے مزید وضاحت کی، کہنے لگی: "حور بانو تو غلطی سے اس کمرے میں آگئی تھیں، معلوم نہیں۔ کس طرح کان کی بالی یہاں گر گئی، اب وہ خوف زدہ ہیں کہ اگر....."

نادر نے مزہ لیتے ہوئے بات کاٹ دی۔ "یہ بالی ایک شرط پر واپس ہوگی!"

فتّے نے سہم کر پوچھا "کون سی شرط؟"

نادر نے جواب دیا "تم اپنی حور بانو سے کہو کہ گو یہ بات شرافت سے بعید ہے لیکن چونکہ وہ خود ہمارے کمرے میں بلا اجازت داخلے کی غلطی کر چکی ہیں اس لئے انہیں اس کے جرمانے میں ایک اور غلطی کا ارتکاب کرنا پڑے گا!"

اندر سے شرمائی ہوئی آواز آئی "فتّے! تم ان سے معلوم کرو کہ یہ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

فتّے نے یہی سوال اپنی زبان سے بھی ادا کر دیا تو نادر نے کہا "میں یہ بالی اسی کو دوں گا جس کے کان سے یہ میرے کمرے میں گری ہے!"

اندر سے دبی سہمی آواز آئی۔ "کہو بالی جہاں پڑی تھی، وہیں ڈال کر باہر چلے جائیں، ہم اندر آ کر اٹھا لیں گے۔"

لیکن نادر کو یہ شرط بالکل پسند نہ آئی، جواب دیا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا!"

اندر سے گھٹی گھٹی ہراساں آواز آئی "اللہ کیوں پریشان کرتے ہیں آپ، ذرا دیر میں بادا جان آجائیں گے!"

"مجبوری۔" نادر نے کہا "ہمارا تو مخلصانہ یہی مشورہ ہے کہ آپ اپنا وقت نہ ضائع کریں"

فتّے اندر چلی گئی اور کھسر پھسر دونوں میں معلوم نہیں کیا باتیں ہوئیں کہ ذرا دیر بعد سکڑی سی، شرمائی لجائی فتّے کے کاندھے کا سہارا لئے اس کی پشت میں اپنا چہرہ چھپائے حور بانو کمرے میں داخل ہو گئی اور فتّے کی بغل سے ہاتھ بڑھا کر بولی "اب تو دے دیجئے!"

نادر نے شوخی سے کہا۔ "واہ، یوں نہیں!" پھر جیب سے بالی نکال کر حور بانو کے پاس پہنچ گیا اور جرأت سے کام لے کر کان کی طرف بالی والا ہاتھ بڑھاتا ہوا بولا۔ "یہ جس کی امانت ہے ہم اسی کے حوالے کرنا چاہتے ہیں، کان کی امانت کان ہی کو دی جائے گی!"

حور بانو اور زیادہ دبک گئی، نادر نے بالی اس کے کان میں ڈال دی۔ جس وقت اس کی انگلیاں حور بانو کے جسم سے مس ہوئیں تو کئی بوتلوں کا نشہ چڑھ گیا، اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ رندی اور دیوانگی میں وہ کتنی بڑی جرأت کر بیٹھا تھا۔

حور بانو کا شرم سے چہرہ سرخ ہو گیا، ایک لمحے کے لئے اس کا چہرہ فتّے کی بغل سے نکلا

اور نادر کے چہرے پر اپنی آنکھوں سے غلتے، خجالت اور بے بسی کا تاثر دیتا ہوا پھر وہیں دبک گیا۔ نادر نے اس ایک جھلک میں اپنا سب کچھ گنوا دیا۔ تمتمائے ہوئے سرخ گالوں اور بڑی بڑی سیاہ مخمور آنکھوں نے اسے پوری طرح فتح کر لیا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ دونوں جا چکی تھیں اور وہ دیوانوں کی طرح بند دروازے پر نظریں جمائے دیر تک کھڑا رہا۔ معلوم

نہیں یہ اس کا حسن ظن تھا یا حقیقت کہ دروازے کے پیچھے چوڑیوں کی کھنک اور دبی دبی مترنم ہنسی کی آواز کیف و مستی بن کر اس کے رگ و پے میں اترتی چلی جا رہی تھی۔

نادر نے خط و کتابت سے تعلق استوار کرنے کے بعد پہلی دفعہ حور بانو کو دیکھا تھا اور اب دوبارہ دیکھنے کی ہوس کی آگ میں جل بھن رہا تھا۔ پھر جنون کی حدوں میں پہنچ جانے کے بعد فتے کے ذریعے اسے یہ تشویشناک خبر ملی کہ حور بانو کا باپ نوازش علی آگرے جانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس خبر سے اس کا دل ڈوبنے لگا فتے پر مہربانیوں اور نوازشوں کی بھرمار ہو گئی۔ کئی بار حرف مطلب زبان تک آتے آتے رہ گیا۔

فتے بھی اس کی بے چینی سے خوب واقف تھی لیکن شاید وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔

ایک دن صبح ہی صبح جب وہ آئی تو نادر اداس سر جھکائے بیٹھا اپنے انجام پر کچھ سوچ رہا تھا۔ فتے کچھ دیر کھڑی اس کی حالت پر غور کرتی رہی۔ پھر بولی۔ "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

نادر نے سر اٹھایا اور پھیکی مسکراہٹ سے پوچھا۔ "تم کب آئیں فتے؟"

فتے نے جواب دیا۔ "ابھی ابھی آئی ہوں۔" پھر ایک جھرجھری لے کر کہنے لگی "جیسے جیسے ان لوگوں کے آگرے جانے کے دن قریب آتے جا رہے ہیں میری مصروفیت اور پریشانی میں اضافہ ہو رہا ہے!"

نادر نے حیرت اور افسوس سے پوچھا۔ "ان لوگوں کے جانے سے تمہیں کس پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا؟"

فتے نے دل جلے انداز میں جواب دیا۔ "میں نہیں جانا چاہتی، میں یہیں رہنا چاہتی ہوں!"

نادر نے کہا۔ "تو رہو ہمارے پاس، ہمارے ساتھ رہو، تم کیوں پریشان ہوتی ہو؟"

فتے کے چہرے پر خوشی کی تازگی دوڑ گئی۔

نادر نے کچھ دم لے کر اپنی درخواست پیش کر دی، بولا "فتے ان لوگوں کے جانے سے پہلے ہمارا ایک کام کر دو!"

فتے نے پوچھا "کیا کام فرماتے ہیں؟"

نادر نے ہمت کر کے صاف صاف مطلب بیان کر دیا۔ "تم ہمیں ایک بار حور بانو سے اور ملا دو!"

یہ کہہ کر وہ فتّے کی صورت دیکھنے لگا اس طرح اب وہ اپنے سوال کے ردِ عمل کا جائزہ لے رہا تھا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد فتّے نے جواب دیا۔ "ایسی ملاقاتوں سے کیا فائدہ کیوں آپ جی کو جلاتے ہیں۔ بہر حال آج دوپہر آپ انتظار کریں، میں کوشش کروں گی اگر حور بانو بھی رضامند ہو گئیں تو ملاقات ضرور ہو جائے گی۔"

نادر کا مارے خوشی کے حال ہی کچھ اور ہو گیا۔ اس نے فتّے کو انعام کے طور پر کئی اشرفیاں اور کھانے کو پھل پیش کئے۔ فتّے نے اشرفیاں مٹھی میں دابیں اور پھل کھا کر منہ پونچھتی ہوئی واپس چلی گئی۔

دوپہر سے دو گھڑی پہلے ہلکے گلابی کپڑوں میں ملبوس حور بانو لجائی شرمائی فتّے کی کوششوں سے اندرونی دروازے تک آ کر ٹھٹک گئی، نادر نے پُرشوق نظروں سے دیکھا کہ فتّے کے گورے گورے صحت مند ہاتھ حور بانو کو نادر کے کمرے میں دھکیلنے کی کوشش کر رہے ہیں اور حور بانو بار بار پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ اسی کشمکش میں فتّے کے ایک زوردار دھکے سے حور بانو نادر کے کمرے میں داخل ہو گئی فتّے نے پھرتی سے دروازے بند کر لئے۔ حور بانو کا دوپٹہ فتّے کے ہاتھ میں پھنس کر دروازے کے دوسری طرف ہی رہ گیا۔ فتّے نے کوئی پرواہ کئے بغیر دروازے کی زنجیر چڑھا لی، اب حور بانو کا بہت برا حال تھا، اس کشمکش میں جہاں وہ بے دوپٹہ ہو گئی تھی وہیں اس کے بال بھی بکھر گئے تھے، شرم و حجاب میں فرار کی راہیں مسدود دیکھ کر وہ کمرے کے فرش پر اکڑوں بیٹھ گئی اور دونوں گھٹنوں میں سر ڈال کر چہرہ اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں اور انگلیوں سے سر چھپا لیا۔

دوسری طرف سے سرگوشی میں فتّے کی آواز سنائی دی۔ "میں یہیں برابر کے کمرے میں موجود ہوں، باتیں کر کے دروازے تھپتھپا دینا، میں زنجیر کھول دوں گی!"

نادر جھجکتا ٹھٹکتا حور بانو کے قریب پہنچ گیا۔ وہ گٹھری بنی ہوئی حور بانو کے سر پر فکر مند کھڑا کچھ سوچتا رہا، پھر آہستہ سے اس کے بالوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور سرگوشی میں کہا۔ "حور بانو!"

حور بانو کچھ اور سکڑ گئی، نادر اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا، بولا۔ "حور بانو شرماتے نہیں، ادھر دیکھئے ہماری طرف۔ جب سے ہم نے آپ کو دیکھا ہے، آنکھیں خواب کو ترس گئی ہیں!"

حور بانو بدستور سکڑی سمٹی رہی بالکل چھوئی موئی کی طرح جو انسانی لمس سے مرجھا جاتی ہے۔

نادر نے زیادہ جسارت سے کام لیا اس کے پہلو میں گدگدی کر دی جس کی تاب نہ لاکر حور بانو فرش پر ڈھیر ہو گئی اور اشکبار نظروں سے نادر کو دیکھا۔

"ارے آپ رو رہی ہیں! یہ کیوں؟" نادر پریشان ہو گیا۔

حور بانو نے بھرائی آواز میں کہا۔" باداجان کو آجانے دیجئے، ہم اس لفنگے کی بچی کو قتل نہ کرا دیں تو ہمارا ذمہ۔"

نادر نے کہا۔" اور فتے کے ساتھ ہم کو بھی قتل کرا دیجئے ہم تو زندگی سے یوں ہی بیزار ہو چکے ہیں!"

حور بانو نے کوئی جواب نہ دیا۔ نادر نے اس کے گرد آلود کپڑوں کی دھول جھاڑتے ہوئے کہا۔" ہم بخوشی قتل ہونے کو تیار ہیں لیکن اس سے پہلے ہمیں اپنے دل کا بوجھ تو اتار لینے دیجئے۔"

حور بانو نے بے بسی سے نادر کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو" کیسا بوجھ؟"

نادر نے کہا۔" پہلے اس خاکی فرش کو تو چھوڑیے اور چوکی پر تشریف لے چلیے" اس کے بعد دل کی داستان عرض کی جائے گی۔ اب آپ اتنی اجنبی ہو گئی ہیں ہمارے لئے؛ خطوط میں تو آپ خاصی شوخ نظر آتی ہیں۔"

حور بانو نے اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" ہمارا دوپٹہ!"

نادر دروازے کی طرف جاتا ہوا بولا۔" ہم ابھی لا دیتے ہیں آپ کا دوپٹہ۔ لیکن پہلے آپ بھی یہ وعدہ کیجئے کہ دوپٹا مل جانے پر ہمیں شرفِ ہم کلامی سے محروم نہیں فرمائیں گی!"

"حور بانو نے شرمائی مسکراہٹ سے جواب دیا۔" وعدہ!"

نادر نے دروازے کو آہستہ آہستہ دو بار تھپتھپایا اور سرگوشی میں کہا۔" فتے حور بانو کا دوپٹا دے دو۔"

جواب میں ذرا سا دروازہ کھلا اور دوپٹا نادر کے ہاتھ میں آگیا۔ نادر نے یہ دوپٹہ حور بانو کے حوالے کر دیا۔

حور بانو نے دوپٹے کو سر پر ڈال کر، اس کے دونوں سِروں سے شانوں اور سینے کو چھپا لیا۔

نادر نے درخواست کی" اب براہ کرم چوکی پر تشریف لے چلیں۔"

حور بانو دلہنوں کی طرح چل کر چوکی پر جا بیٹھی۔ اس کے سامنے نادر خادم کی طرح

کھڑا ہو گیا۔

نادر نے پہلی بار اس قیامت کا سرتاپا جائزہ لیا، ہلکے گلابی لباس میں ڈھنپا ہوا گلابی جسم ایسا لگتا تھا جیسے گلاب کے پھول نے نسوانی پیکر اختیار کر لیا ہو۔ گلابی اور گلنار چہرے پر سیاہ بالوں کی وہی حیثیت تھی جو صبح یا شام کو افق پر کھلی ہوئی ہلکی شفق میں مثل سانپ سیاہ بادلوں کی ہوا کرتی ہے۔

نادر نے بالوں کی چند لٹیں انگلیوں میں لے کر ناک سے لگائیں اور ان کی خوشبو سے مست و سرشار ہو گیا۔ حور بانو ایک بار پھر سکڑنے لگی، نادر نے کہا۔ "حور بانو یقین کیجئے ہم آپ کی محبت کے اسیر ہو چکے ہیں اور ہم اس سے بالکل نہیں ڈرتے کہ آپ کے والد ہمیں جرمِ محبت میں قتل بھی کر سکتے ہیں۔"

حور بانو کی نحیف سی آواز سنائی دی، اس نے کہا۔ "لیکن آپ شاید یہ نہیں جانتے کہ ہم کسی کی امانت ہیں، کسی سے منسوب ہو چکے ہیں!"

نادر نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا مطلب؟ پھر آپ نے ہم سے راہ و رسم کیوں بڑھائی؟"

حور بانو نے شرمندگی سے جواب دیا۔ "شرمندہ ہیں، غلطی ہوئی!"

"حور بانو۔ ہم ہمیشہ کے لئے آپ کو اپنا بنانا چاہتے ہیں۔"

مگر میں پیدائش کے فوراً بعد ہی اپنے چچا کے لڑکے شیر باز کے لئے مانگی جا چکی ہوں ہماری نال کے ٹھیکرے میں شیر باز کی ماں نے ہماری طلب کا بیعانہ ڈال دیا تھا۔"

نادر ہنسنے لگا۔ لاپرواہی سے بولا۔ "یہ کوئی بات نہیں، اصل چیز تو نکاح ہوتی ہے۔"

حور بانو نے اکتا کر کہا۔ "ہمیں واپس جانے دیجئے۔"

نادر نے جواب دیا۔ "ابھی ہم دونوں کی باتیں تو ہوئی نہیں!"

دوپٹے کی آڑ سے اس نے نادر کو دیکھا۔ بڑی بڑی پلکوں کے دو دو یہ محرابی جنگلے میں نشیلی آنکھوں کی کٹوریاں اس طرح محفوظ تھیں جیسے انہیں سیاہ تاروں کی بارکوں میں قید کر دیا گیا ہو۔

نادر نے کہا۔ "حور بانو! آپ ہمیں بس اس بات کی اجازت مرحمت فرما دیں کہ اگر ہم آپ کے پدر بزرگوار سے آپ کے رشتے کی بات کریں تو آپ اس کی مخالفت نہیں کریں گی!"

حور بانو نے وحشی ہرنی کی طرح خوفزدہ نظروں سے نادر کو دیکھا اور کہنے لگی۔ "آپ بابا جان سے اس موضوع پر بات کبھی نہ کیجئے گا، وہ آپ سے بالکل خوش نہیں ہیں!"

نادر نے پوچھا۔ "ہم سے خوش کیوں نہیں ہیں؟"

حور بانو اب کچھ بے تکلف ہو گئی تھی، کہنے لگی "جس منصب پر آپ فائز ہیں وہ یہاں شیر باز کو دیکھنا چاہتے تھے۔" ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ "لیکن خدا کو شاید یہ منظور نہ تھا اس لئے اس نے یہاں آپ کو بھیج دیا اور شیر باز کو ایک ایسے خیالِ خام میں مبتلا کر دیا کہ پتہ نہیں اس کا کیا انجام ہو!"

نادر نے امید و بیم میں دریافت کیا۔ "ہم آپ کا مطلب نہیں سمجھے، کچھ کھل کر فرمائیں تو بڑا کرم ہوگا!"

حور بانو نے دکھ کے ساتھ کہا۔ "آپ کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ جہاں پناہ شہنشاہِ ہند جلال الدین اکبر کی زندگی کا چراغ قریبِ غروب ہے، اور ان کی جانشینی کی جنگ میں باپ بیٹے یعنی شہزادے سلیم اور خسرو میں آویزش جاری ہے، خسرو چاہتا ہے کہ اپنے باپ سلیم کی جگہ اپنے دادا اکبر کے آنکھ بند کرتے ہی ہندوستان کا فرماں روا بن جائے لیکن شہزادے سلیم اپنے بیٹے خسرو کو حتی الامکان کامیاب نہ ہونے دیں گے!" پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولی "اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ شیر باز شہزادے خسرو کی حمایت کر رہا ہے!"

نادر نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "خسرو اور اس کے حمایتی احمق ہیں۔"

حور بانو نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ "یہاں ایسی باتیں نہ کیجئے ورنہ نقصان اٹھانا پڑے گا!"

"وہ کس طرح؟" نادر نے پوچھا۔

حور بانو نے جواب دیا۔ "شہزادہ سلیم راجا مان سنگھ کے بہنوئی ہیں اور خسرو ان کا بھانجا، راجا مان سنگھ اپنے بھانجے کی حمایت کر رہے ہیں۔ یہاں خسرو کے خلاف زبان کھولنے کا یہ مطلب ہے کہ راجا مان سنگھ کی مخالفت کی جائے۔ یہ علاقہ راجا مان سنگھ کا ہے، اس کا بطورِ خاص خیال رہے!"

نادر نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ "سردست ہم ان سیاسی جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہتے۔ ہمارے باب میں آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا آپ ہمیں یوں ہی جلتے رہنے دیں گی؟"

حور بانو خاموش ہو گئی۔ نادر نے اس کے بالوں کو بوسہ دیا تو وہ تلملا کر رہ گئی، اکتا کر بولی "ہمیں جانے دیجئے!"

"آپ کو روک کون سکتا ہے!" نادر نے کہا۔ "ذرا اپنا چہرہ اوپر تو اٹھایئے۔ ہم جی بھر کے اسے دیکھ تو لیں!"

حور بانو کھڑی ہو گئی۔ غصے میں بولی۔ "اب ہم مزید برداشت نہیں کر سکتے!"

نادر نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا تو چھڑانے کی جدوجہد کرتی ہوئی

"چھوڑ دیجئے ستاتے نہیں، اگر باداجان کو ان باتوں کی اطلاع ہوگئی تو ہم دونوں کو جان سے مار دیں گے!"

نادر نے اپنی گرفت اور مضبوط کرلی، بولا۔ "بس ایک شرط پر ہم آپ کو چھوڑ سکتے ہیں!"

"شرط درط کچھ نہیں، آپ ہمیں چھوڑ دیجئے بس!"

نادر پر ایک کیف طاری تھا۔ سارے جسم میں مستی سی دوڑنے لگی، عالم سرمستی میں کئی جگہ بوسے ثبت کیے اور کہنے لگا "حور بانو! ہم آپ کے بغیر زندہ نہ رہ سکیں گے کچھ بھی ہو، اب تو ہم نے یہ طے کرلیا ہے کہ یا تو آپ کو حاصل کرلیں گے یا اپنی جان دے دیں گے۔"

لیکن حور بانو کے پاس ان تمام باتوں کا ایک ہی جواب تھا۔ "ہمیں چھوڑ دیجئے، ہمیں جانے دیجئے!"

اور جب ان دونوں کی علیحدگی عمل میں آئی تو نادر کو کچھ بھی پتہ نہ تھا کہ حور بانو کا آئندہ اقدام اس کی حمایت میں ہوگا یا مخالفت میں۔

اندرونی دروازہ کھلنے پر فتے کا ناخوشگوار اثرات لئے چہرہ نمودار ہوا تو اس کے کانوں میں بڑبڑاہٹ کی بھنک پڑی، فتے ترشی سے کہہ رہی تھی۔ "آپ کو یہ سب نہیں کرنا چاہیئے تھا اگر حور بانو نے سچ مچ شکایت کردی تو میں پہلے ہی قتل کردی جاؤں گی!"

نادر نے ملائمی میں جواب دیا۔ "داروغۂ اصطبل ہم ہیں، اب بوڑھا نوازش علی تو کچھ بھی نہیں رہا، ہم جب چاہیں اسے قید میں ڈال سکتے ہیں!"

لیکن جب اندر سے حور بانو نے بھی فتے کے ذریعے کہلوادیا کہ "ہم مجبور ہیں، آپ کا ساتھ شاید نہ دے سکیں گے۔" تو نادر پریشان ہوگیا۔

اصطبل کے سائیس، منشی اور دوسرا عملہ اب بھی نوازش علی کی عزت کرتا تھا، جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ نوازش علی آگرے جانے کی تیاری کررہا ہے اور راجہ مان سنگھ نے بھی اسے چلے جانے کی اجازت دے دی ہے تو انہیں بڑا صدمہ ہوا۔ جب یہ لوگ نوازش علی کو رکنے پر مجبور کرتے تو وہ پوچھتا۔ "اب میں یہاں کس تقریب میں رکوں، میرا منصب مجھ سے چھن چکا، یہاں مزید ٹھہرے رہنے کا جواز ہی کیا باقی رہ گیا ہے؟"

عملے کے کچھ لوگ نوجوان نادر اور حور بانو کو ایک ساتھ اپنے ذہنوں میں لاتے اور ان دونوں کی آپس میں مستقل وابستگی کی تجویز پیش کرنا چاہتے لیکن کسی کو ہمت نہ پڑی، کسی نے اشاروں میں اگر یہ بات کہی بھی تو بوڑھا نوازش علی گویا ہتھے سے اکھڑ گیا اور یہ کہہ کر کہنے

والے کی زبان بند کر دی کہ "میں نے راجامان سنگھ کی خدمت کی ہے اور ماجا نہیں چاہتا کہ شہزادہ سلیم برسرِ اقتدار آئے وہ اپنے بھانجے خسرو کو ہندوستان کا حکمراں دیکھنا چاہتا ہے۔ جدھر راجا ہوگا ادھر ہی نوازش علی ہوگا کیونکہ نوازش علی نمک حرام نہیں ہے۔"

جو فتے پہلے مہربان تھی، اب وہ بھی کھنچی کھنچی رہتی تھی، اسی کی کوششوں سے حور بانو اس سے ملی تھی، گو اس ملاقات کے صلے میں اس نے فتے کو اشرفیوں سے نواز دیا تھا لیکن اب مزید اشرفیوں کی طمع بھی فتے میں نرمی اور خوش اخلاقی پیدا نہ کر پا رہی تھی۔ فتے کو نادر سے ایک ہی شکایت تھی کہ حور بانو سے ملاقات کے دوران نادر نے احتیاط اور بردباری سے کام نہیں لیا، اگر حور بانو واقعی اپنے باپ نوازش علی سے شکایت کر دیتی تو معلوم نہیں کس کس کے لئے کب کی قیامت آچکی ہوتی۔ نادر بھی صبر اور احتیاط سے کام لیتا رہا لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ نوازش علی عنقریب آگرے چلا جائے گا تو وہ بے چین ہوگیا' وہ یہاں تک تیار ہو چکا تھا کہ اگر وہ حور بانو کو جائز طریقے سے حاصل نہ کر سکا تو ناجائز طریقوں سے بھی باز نہ رہے گا لیکن اس سلسلے میں وہ ایک ملاقات اور کرنی چاہتا تھا، اس آخری ملاقات میں وہ حور بانو کے قدموں میں گر کر درخواست کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا۔ اگر اس درخواست سے حور بانو کا دل پسیج گیا تو پسیج گیا ورنہ پھر وہ اس سلسلے کا انتہائی اور آخری قدم اس طرح اٹھائے گا کہ وہ کسی بھی طرح حور بانو کو قابو میں لا کر چپ چاپ آگرے روانہ ہو جائے گا اور اپنے مربی اور محسن شہزادے سلیم کے سایۂ عاطفت میں پناہ لینے کی کوشش کرے گا۔

جب فتے کو حور بانو سے ملاقات پر آمادہ کرنا چاہا تو اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ "حور بانو خود ہی ملاقات پر آمادہ نہیں ہیں، کہتی ہیں ان کی ماں کڑی نگرانی کر رہی ہیں!"

نادر نے اداسی سے پوچھا۔ "لیکن حور بانو کی والدہ پہلی ملاقات پر بھی تو گھر ہی میں موجود تھیں، پھر وہ ملاقات کس طرح ممکن ہو گئی تھی؟"

فتے نے جواب دیا "یہ راز کی باتیں نہ پوچھیں تو اچھا ہے۔"

"پھر بھی!" نادر نے کہا۔ "ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ ہم ہر قیمت پر حور بانو سے ایک آخری ملاقات ضرور کریں گے!"

فتے نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "لیکن اس ملاقات سے حاصل کچھ بھی نہ ہوگا، حور بانو اپنے بادا جان کی مرضی کے خلاف کوئی بڑا قدم اٹھانا تو درکنار، کوئی معمولی سا وعدہ بھی نہیں کر سکیں!"

نادر نے ضدی انداز میں کہا۔ "یہ ہمارے سوچنے کی بات ہے کہ حور بانو ہمارے خلاف قدم اٹھائیں گی یا حمایت میں، تم تو بس کسی طرح ہم دونوں کی ملاقات کرادو!"

فتنے کچھ نرم پڑ گئی، بولی "میں تو راضی ہوں لیکن خود حور بانو شاید تیار نہ ہوں!"

نادر نے عاجز آ کر کہا۔ "اُفوہ، تم کوشش تو کرو۔"

فتنے نے بادل نا خواستہ کہا۔ "اچھا کوشش کر دوں گی۔"

نادر نے فوراً ہی چند اشرفیاں فتنے کے حوالے کیں، بولا۔ "انہیں رکھو ہم ملاقات کے بعد اور بھی دیں گے۔"

فتنے نے اشرفیاں کرتے کی جیب میں ڈالیں اور آنچل سے چہرے کا پسینہ خشک کرتی ہوئی چلی گئی۔

موسلا دھار بارش میں چند گھڑ سوار قلعے میں داخل ہوئے اور پھر گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے سیدھے نوازش علی کی ڈیوڑھی کے صدر دروازے پر پہنچ کر گھوڑوں سے اتر پڑے۔ شلوار نما تنگ موریوں کے پاجامے پر لمبے لمبے کرتے کمر پر رنگین پٹکوں سے کسے ہوئے تھے اور پٹکوں کے رنگ برنگے سرے ناف کے نیچے لٹک رہے تھے ان کے لباس پانی میں شرابور تھے اور لٹکتے ہوئے پٹکوں کے سروں سے پانی ٹپک ٹپک کر ان کے جوتوں کو مزید تر کر رہا تھا۔ ان دس آنے والوں میں ایک سرکش جوان بھی تھا، اس کی گردن میں ایک قسم کا متمردانہ کھنچاؤ اور تر چھا پن تھا، بقیہ نو ساتھی اس کے ماتحت اور اطاعت گزار نظر آتے تھے۔

نادر انہیں دیکھتے ہی اپنے کمرے سے باہر آ گیا اور مغرور نوجوان سے نہایت نرم لہجے میں دریافت کیا "کوئی شاہی پیغام؟ ہم آپ حضرات کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔؟"

اجنبی نوجوان متکبرانہ شان سے مسکرایا اور کہا۔ "ہم داروغۂ اصطبل نوازش علی سے ملنا چاہتے ہیں!"

نادر نے بھی حاکمانہ انداز اختیار کیا اور پُر وقار لہجے میں جواب دیا۔ "نوازش علی اپنے منصب سے علیحدہ کیے جا چکے ہیں اور ان کی جگہ ہم نے یہ منصب سنبھال لیا ہے!"

اجنبی نے نہایت لاپروائی اور رعونت سے نادر کو دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ "اچھا تو اب تم ہو ان کی جگہ داروغۂ اصطبل! خوب لیکن نوازش علی کہاں ہیں؟"

نادر نے جواب دیا۔ "وہ بھی اپنے کنبے کے ساتھ اسی حویلی میں قیام فرما ہیں!"

اجنبی نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "اور خود تم کہاں رہتے ہو؟"

نادر کو اجنبی کا انداز تخاطب پسند نہ آیا، اس نے بھی رعونت سے جواب دیا۔
"ہم بھی اسی حویلی میں رہتے ہیں، اصولاً اپنے منصب پر فائز ہونے کے فوراً بعد ہمیں یہ حویلی بوڑھے نوازش علی سے خالی کرا لینا چاہیئے تھی لیکن ہم نے ازراہ ترحم ایسا نہیں کیا!"

اجنبی کی گردن اور زیادہ اکڑ گئی، اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور پیش قبض کے دستے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ نادر کو خطرے کی بو محسوس ہوئی۔ اس نے بھی اپنی پیش قبض کے دستے پر ہاتھ رکھا اور اجنبی کی ذہنی کیفیات اس کے چہرے سے پڑھنے کی کوشش کی۔

اجنبی نے رعونت سے پوچھا۔ "نوازش علی کو معزول اور تمہیں اس منصب پر فائز کس نے کیا؟"

نادر نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "جسے لوگوں کو ان کے مناصب سے معزول اور فائز کرنے کے اختیارات حاصل ہیں، اسی کے حکم سے یہ سب کچھ ہوگیا!"

"نوازش علی کو بلاؤ!" اجنبی نے حکم دیا۔

نادر اپنے کمرے میں جاتا ہوا بولا۔ "افسوس کہ ہم تم جیسے بے ادب اور آدابِ گفتگو سے ناواقف شخص سے مزید بات چیت نہیں کر سکتے!"

اس کے چلے جانے کے بعد فتے نے اس خود سر اجنبی کی رہنمائی کی اور اسے نوازش علی سے ملوا دیا۔ کافی دیر بعد فتے اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور اس کے انداز میں ایک قسم کی سرکشی اور بے نیازی سی پائی جاتی تھی۔

نادر نے دریافت کیا۔ "فتے! یہ کون لوگ ہیں جو نوازش علی سے ملنے آئے ہیں؟"

فتے نے جواب دیا۔ "جناب ان میں ٹیڑھی گردن والا تو اپنے سابق داروغہ اصطبل نوازش علی کا بھتیجا شیر باز ہے اور بقیہ اس کے ساتھی، جو ہر وقت اس کی جاں نثاری میں اس کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں!"

نادر اس خبر سے بہت زیادہ پریشان ہوگیا۔ حور بانو کا اصل حق دار آچکا تھا اس نے سوچا کہ اب حور بانو کی حصولیابی نہ صرف ناممکن بلکہ ملاقات تک ناممکن ہے۔ اس نے معنی خیز نظروں سے فتے کی طرف دیکھا، ان نظروں نے اس سے کیا پوچھا تھا فتے نے پڑھ لیا، کہنے لگی۔
"بات تو اب ناممکن ہی نظر آ رہی ہے ہیں پھر بھی ایک فیصلہ کن ملاقات کرانے کی کوشش ضرور کر دوں گی۔"

نادر نے اس کی ہمت بندھائی، بولا۔ "ہاں فتے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہم تمہاری پشت پر موجود ہیں۔"

لیکن دو دن کے اندر ہی نادر نے یہ محسوس کر لیا کہ فتنے کی اطاعت گزاری میں وہ پہلی جیسی سرگرمی نہیں رہی۔ اب نوازش علی میں بھی وہ پہلے جیسی مایوسی نہیں پائی جاتی تھی اب اصطبل کا عملہ بھی اس کا کم ہی ادب لحاظ کرتا تھا۔ اسے ایسا لگتا جیسے اب وہ داروغۂ اصطبل نہیں رہا۔ چند دنوں پہلے تک وہ جب باہر نکلتا تھا تو وہاں کی مقامی عورتیں اس کا بڑا ادب و احترام کرتی تھیں لیکن اب وہ بھی نظر انداز کرنے لگی تھیں، نادر کو شک گزرا کہ کہیں شیر باز دار الحکومت سے کوئی خفیہ حکمنامہ تو نہیں لایا ہے اور ایک یہ شک بھی اسے بار بار پریشان کر رہا تھا کہ کہیں خدا نخواستہ شہنشاہ اکبر نے شہزادہ سلیم کی جگہ اس کے بیٹے خسرو کو اپنا ولی عہد تو نہیں نامزد کر دیا! اس اضطراب اور خلفشار میں کئی دن گزر گئے، وہ اپنے فرائض منصبی اس طور پر انجام دے رہا تھا، گویا پروانۂ معزولی موصول ہونے ہی والا ہے اور اس پروانے کی موصولی تک وہ بجبر اپنی منصبی خدمات انجام دینے کا پابند ہے۔

بارش کی ایسی جھڑی لگی تھی کہ لوگ اپنی اپنی پناہ گاہوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ نوازش علی اس کا بھتیجا شیر باز اور اس کے ساتھی بھی اپنے اپنے ٹھکانوں میں دبکے ہوئے تھے۔ نادر بہت اداس تھا، مشہور سلاطین اور فاتحین کی چند سوانح عمریاں اس کے پاس تھیں، یہ ہر وقت انہی کے مطالعے میں کھویا رہتا تھا۔

سہ پہر کو خلافِ معمول سر پھرا شیر باز اپنے چچا نوازش علی کے ساتھ اس سے ملنے آگیا۔ نادر نے خندہ پیشانی اور خوش دلی سے دونوں کا استقبال کیا اور انہیں اپنے سے اونچی جگہ پر بٹھایا۔

شیر باز نے بیٹھتے ہی رعونت سے کہا۔ "دوست! ہم تمہیں کئی دن سے چپ چاپ اور اداس دیکھ رہے ہیں۔ اگر اس اداسی کا سبب یہ خیال ہے کہ ہم تمہیں تمہارے منصب سے معزول کرنے یا کرانے آتے ہیں تو اس خیال کو فوراً اپنے دل سے نکال دو، ہم اتنے معمولی منصب کو اپنے شایانِ شان نہیں سمجھتے۔"

نادر اس تلخ لب و لہجے کا کوئی ایسا ہی جواب ضرور دیتا لیکن محض اس خیال سے چپ رہا کہ آنے والے اس کے مہمان ہیں اور مہمانوں کی گستاخیاں بھی صبر و شکر سے برداشت کر لینی چاہئیں۔

شیر باز نے مزید کہا۔ "تم نے ہمارے چچا کو پریشان نہیں کیا، اس کا ہم بطورِ خاص شکریہ ادا کرتے ہیں اور تمہارے احسان کو شاید ہم جلد ہی اتار دیں گے کیونکہ زیادہ دنوں تک کسی کے احسان کو بارِ دوش بنا کر رکھنا دیانت اور شرافت کے خلاف ہے!"

نوازش علی کی بوڑھی اور تجربہ کار عقل نے شاید اسے فوراً ہی یہ محسوس کرا دیا کہ نادر اب زیادہ دیر تک شیر باز کی باتوں کا متحمل نہیں ہو سکے گا، وہ مفاہمت کے لہجے میں بولا۔ "اگر

ان کا نام نادر ہے تو یہ آدمی بھی نادر ہی ہیں، میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اپنا زیادہ وقت نہیں برباد کرنا چاہیئے، اس وقت ہم دونوں اس لئے حاضر ہوتے تھے کہ آخری بار تمہاری شرافت اور مخلصانہ رویّے کا شکریہ ادا کریں، پھر کچھ پتہ نہیں کہ کبھی ملاقات ہو بھی یا نہ ہو!"

نادر کا دل ڈوبنے لگا۔ الفاظ خشک گلے میں پھنسنے لگے، بدقّت تمام دریافت کیا۔ "کیا آپ لوگ واقعی جا رہے ہیں؟"

"ہاں!" نوازش علی نے جواب دیا۔ "شاید دو دن بعد ہم یہاں نظر نہ آئیں!"

نادر نے مخلصانہ پیش کش کی۔ "اگر آپ چاہیں تو ہم اپنے موجودہ منصب سے دست بردار ہونے کو تیار ہیں اور آپ بدستور اسی منصب پر فائز رہ سکتے ہیں ۔۔۔!"

شیر باز کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی، اس نے غرور سے کہا۔ "نہیں ہمیں اس معمولی منصب کی کوئی ضرورت نہیں، ہم آگرے واپس جائیں گے اور کوشش کریں گے چچا جان کو شاہی میر آخور (شاہی اصطبل کا افسر اعلا) کا منصب مل جائے۔"

نادر چپ ہو رہا۔ شیر باز دیر تک اپنی خودستائی میں لگا رہا۔

جب چچا بھتیجے راجا مان سنگھ سے ملنے خلیفت آباد چلے گئے تو ایک بار پھر حور بانو سے ملنے کی خواہش نے سر اٹھایا لیکن اب اس نازک معاملے میں بہت احتیاط اور صبر و تحمل کی ضرورت تھی۔ فتے کا تو یہ حال تھا کہ جب بھی اس کی نادر سے نظریں چار ہوتیں، وہ نظریں چرا کر اِدھر اُدھر ہو جاتی۔

جب وہ سوچتا کہ حور بانو عنقریب وہاں سے چلی جائے گی تو اس کا دم الجھنے لگتا، وہ یہ سوچ کر بالکل ہی مایوس ہو جاتا کہ اب شیر باز کی موجودگی میں شاید حور بانو اس سے باتیں کرنا بھی گوارا نہ کرے۔

گہری گھٹاؤں نے ہر سو اندھیرا پھیلا رکھا تھا، کمروں میں رات کی سیاہی کا گمان ہوتا تھا، نادر نے چادر اوڑھ لی اور فانوس روشن کر کے ایک تاریخی مخطوطے کا مطالعہ کرنے لگا۔ اسی لمحے کسی نے آہستہ آہستہ اندرونی دروازے پر دستک دی۔ نادر نے مخطوطے کے زیر مطالعہ صفحات میں نشانی رکھ کر اسے بند کر دیا اور اندرونی دروازے پر نظریں گاڑ دیں، کسی نے پھر دستک دی۔ نادر اٹھ کر دروازے کے قریب جا کھڑا ہوا اور پوچھا۔ "کیا ہے؟ کون کس سے بات کرے گا؟"

اندر سے سہمی لرزتی آواز میں فتے نے کہا۔ "دروازے کھولیے حور بانو آخری بار آپ سے چند باتیں کرنا چاہتی ہیں۔"

نادر کو یقین نہ آیا وہ سمجھا کہ کہیں اس طرح چلتے چلاتے اس کے خلاف کوئی دام تزویر تو نہیں بچھایا گیا ہے۔

اس نے بے رخی سے جواب دیا۔ "کیا بات ہے؟ حور بانو کی والدہ کہاں ہیں؟"

فتّے نے بدستور سرگوشی میں جواب دیا۔ "حور بانو سے جب آپ کی ملاقات کرانی یا کرانی ہوتی ہے تو انہیں افیون مقررہ مقدار سے کچھ زیادہ کھلا دی جاتی ہے، آج بھی یہی کیا گیا ہے۔ اب آپ دونوں آزادی سے باتیں کر سکتے ہیں!"

نادر نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ اسی لمحے حور بانو فتّے کا ایک زوردار دھکا کھا کر نادر کے کمرے میں داخل ہو گئی، نادر نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور چوکی کی طرف لے جاتا ہوا بولا۔ "زہے نصیب کہ آپ نے اس ناچیز کو یاد تو فرمایا، یہ تو بتایئے کہ کیا واقعی ہمیں مایوس اور تباہ حال چھوڑ کر دار لحکومت جا رہی ہیں، آپ ہمیں کس پر چھوڑے جا رہی ہیں۔"

حور بانو ایک بے جان مجسمے کی طرح نادر کی مدد سے پر تکلف چوکی پر جا بیٹھی۔ گردن جھکی ہوئی، جسم میں خوف اور حجاب کا رعشہ زبان میں لکنت، دل میں بے شمار الجھنیں اور دماغ اندیشوں اور خدشوں سے بوجھل۔

نادر نے آزردگی سے کہا۔ "حور بانو، معاف کیجئے گا۔ ہم نے آپ کو مبارک باد تو دی ہی نہیں۔ آپ کو جس کا انتظار تھا۔ آخر وہ آ گیا، اب تو آپ خوش ہیں؟"

حور بانو نے اٹک اٹک کر جواب دیا۔ "ان تکلیف دہ باتوں کا ذکر نہ کیجئے۔ کیا ہماری خاطر سے آپ خود آگرے چلنا گوارا نہ فرمائیں گے؟"

نادر نے اداسی سے جواب دیا۔ "آپ کی خاطر تو ہم جان تک دے سکتے ہیں لیکن آپ نے دل کو جو چرکا لگایا ہے اب اسے خشک ہی ہو جانے دیجئے!"

حور بانو نے وحشت زدگی سے کہا۔ "ہمارے پاس زیادہ باتوں کا وقت نہیں ہے آپ کو ہماری خاطر سے آگرے چلنا ہو گا شاید وہاں اللہ کوئی بہتری کی صورت نکال دے۔ آپ ہمارے بارے میں بھی سوچیئے۔"

نادر نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔ "کیوں، ایسا کیوں سوچتی ہیں آپ؟ اب تو شب و روز آپ ہی کے تصور میں کٹتے ہیں۔"

حور بانو نے دوپٹے کا آنچل انگلی میں لپیٹنا شروع کر دیا، بولی "شیرباز ابھی چند سال شادی نہیں کرنا چاہتا۔" پھر ذرا شرما کر کہا۔ "دوسرے اب ہم خود بھی اسے پسند نہیں کرتے۔"

نادر نے خوشی چھپاتے ہوئے اوپری دل سے پوچھا۔ "اس سلسلے میں وہ کہتا کیا

ہے ؟ چند سال تک وہ کیوں رکنا چاہتا ہے آخر ؟"

حور بانو نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ "یہ اس کی بے وقوفی ہے اور کچھ نہیں معلوم نہیں کیا کیا سوچتا رہتا ہے ؟"

نادر نے دوپٹے کی اوٹ میں چھپے ہوئے حجاب کی سرخی سے تمتماتے ہوئے چہرے کو جب کھولنے کی کوشش کی تو حور بانو نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ نادر نے چہرے دونوں ہاتھوں کی آپس میں پیوست انگلیوں کو الگ کرنے کی کوشش کی اور جذباتی آواز میں کہنے لگا۔ "ہم نے دل میں یہ عہد کر رکھا تھا کہ جب آپ ہم سے ملیں گی تو ہم صبر و احتیاط سے کام لیں گے لیکن آپ کا ہوش ربا سراپا اور سحر انگیز شباب عہد شکن ہے۔ آپ للہ ہمیں کسی آزمائش میں نہ ڈالیے اور ہمارے سامنے بے تکلفی سے بے حجابانہ بیٹھیے !"

حور بانو نے تیز تیز سانسیں لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ بھی یہ وعدہ کریں کہ آپ ایک حد میں رہیں گے !"

"یہ ہمارا وعدہ ہے !" یہ کہہ کر نادر نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے۔

حور بانو نے آہستہ آہستہ انگلیوں میں شگاف پیدا کیا اور چہرے کو کچھ اوپر اٹھا کر انگلیوں کے شگاف سے نادر کو دیکھا تو اس کے ہوش و حواس میں ایک بھونچال سا آ گیا، لمبی لمبی پلکوں میں محصور شوخ اور شریر سیاہ پتلیاں اس طرح حرکت کر رہی تھیں جیسے ننھی منی دو ابابیلیں دو مختلف سفید فضاؤں میں محو پرواز ہوں۔ ہونٹوں میں شوخ مسکراہٹ کی مستی آمیز حلاوت تھی۔

نادر نے ایک جھٹکے سے اس کے دونوں ہاتھوں کو چہرے سے ہٹا دیا تو حور بانو منہ کے بل سجدے میں چلی گئی۔ نادر نے اس کے پہلو میں انگلیاں ڈال دیں اور کہنے لگا۔ "سیدھی ہو جائیے، ورنہ ہم کرتے ہیں گد گدی !"

حور بانو فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی اور شرمائی شرمائی نظروں سے نادر کو دیکھنے لگی۔

نادر نے شاید پہلی بار اس فتنے کو اچھی طرح دیکھا تھا، بالوں کی محراب میں چاند جیسی دمکتی ہوئی شفق رنگ پیشانی اور شربتیں مخمور آنکھوں کے نیچے انگارے جیسے دہکتے ہوئے رخسار، کھڑی متناسب ناک اور چھوٹے سے دہانے میں اوپر کا ہونٹ پتلا اور نیچے کا موٹا، گردن نہ کوتاہ نہ لمبی، گردن کے نیچے جو کچھ تھا اس کی سحر انگیزی اور گرمی نے نادر کو از خود رفتہ کر دیا۔ وہ چوکی پر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا، بولا "حور بانو ! ہمیں یقین نہیں آ رہا کہ ہم آپ کو اتنے قریب سے دیکھ رہے ہیں !"

حور بانو بھی اپنے آپے میں نہ تھی، بولی۔ "معلوم نہیں وہ کون سی گھڑی تھی جب

ہم نے آپ کو دیکھا تھا ورنہ ہمارے سوا وہ کون سی لڑکی ہے جو کبھی غیر مرد کے روبرو اتنی بے باکی سے بیٹھ کر باتیں کرے!"

نادر نے جواب دیا۔ "ہم نے آپ کو اپنا سمجھ لیا ہے، جب آپ بھی ہمیں اپنا سمجھ لیں گی تو اس قسم کے سوہان روح خیالات سے نجات حاصل کر لیں گی!"

حور بانو دزدیدہ نظروں سے مسکرا مسکرا کر دیکھتی رہی۔

نادر نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے دبانے سہلانے لگا۔ ایک سرسری اور معمولی سی چھڑانے کی کوشش کے بعد حور بانو نے بھی سکوت اختیار کیا۔

نادر نے پوچھا۔ "حور بانو ایک بات تو بتلایئے!"

حور بانو نے نظریں اٹھا کر فوراً جھکا لیں، جیسے اجازت دی ہو۔ "پوچھیے!"

نادر نے افسوس سے کہا۔ "جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ یہ مرمریں ہاتھ ہمارے بجائے شیر باز کے ہاتھوں میں دے دیئے جائیں گے تو ہمارے دل کی دھڑکنیں رکنے لگتی ہیں!"

حور بانو نے ہمت کر کے کہا۔ "ہم لوگ آگرے جا رہے ہیں، اس وقت ہم اسی غرض سے آئے تھے کہ آپ کو بھی آگرے چلنے پر آمادہ کر لیں!"

"لیکن ہمارے چلنے کا فائدہ؟"

"بات دشوار سہی لیکن آپ کوشش ضرور کریں، ممکن ہے خدا کامیاب کر دے!"

نادر نے مایوسی سے کہا۔ "کیا آپ شیر باز پر ہمیں ترجیح دینے پر واقعی آمادہ ہیں؟"

حور بانو نے زبان کے بجائے حامی میں گردن ہلا دی۔

نادر کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ پوچھا۔ "اور آپ کے والد نوازش علی؟ کیا وہ بھی ہمیں پسند کر لیں گے؟"

حور بانو نے جواب دیا۔ "بس انہی کو راضی کرنا تو آپ کا سب سے بڑا کام ہے!"

نادر نے کریدا۔ "کیا آپ شیر باز کو واقعی پسند نہیں کرتیں؟"

حور بانو نے منہ بنا کر کہا۔ "جب سے ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ شیر باز شہزادے سلیم کی مخالفت میں اس کے بیٹے خسرو کا ساتھ دے رہا ہے، ہمیں شیر باز کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا ہے!"

نادر نے جواب دیا۔ "لیکن آپ ملوکیت اور سیاست میں نہ جائیں، یہاں سب کچھ ممکن ہے!"

حور بانو نے چڑ کر کہا۔ "لیکن یہ ناممکن ہے کہ شہنشاہ اکبر بیٹے کی جگہ پوتے کو اپنا

جانشین بنا دیں !"

نادر نے کہا۔" اچھا جناب حور بانو صاحبہ ! ہمارا یہ وعدہ ہے کہ ہم آپ کے فوراً بعد ہی یہاں سے آگرے کے لئے روانہ ہو جائیں گے اور وہاں پہنچ کر آپ کے باپ کو کسی طرح رضامند کرنے کی کوشش کریں گے !"

حور بانو خوش ہو گئی اور کچھ سوچ کر بولی۔" شیر باز خود سر، مغرور اور جھگڑالو انسان ہے، ہو سکتا ہے وہ کسی بات پر آپ سے جھگڑ بیٹھے۔ اس سلسلے میں ہمارا یہ مشورہ ہے کہ ہر قیمت پر جھگڑے سے بچتے رہیں اور خاص طور پر بابا جان سے۔ کوشش یہی کریں کہ خوش اخلاقی کا دامن نہ چھوٹنے پائے !"

نادر نے ہنس کر جواب دیا۔" سادہ لوح پری ! اگر ہم مصلحت اندیش نہ ہوتے اور آپ کی ذات ان لوگوں کے درمیان نہ ہوتی تو ہم ان سے کب کے لڑ جھگڑ چکے ہوتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہم میں سے ایک کسی کی جان بھی جا چکی ہوتی !"

حور بانو نے مزید مشورہ دیا۔" اور بابا جان کو خوش کرنے کی کوشش جاری رکھیے، اسی میں شاید کوئی صورت نکل آئے !"

"بہتر ہے !"

" اور ہاں اس کا بھی بطورِ خاص خیال رکھیئے گا کہ آپ کی کسی بات سے بھی بابا جان کو یہ شبہ بھی نہ ہو کہ آپ کے دل میں ان کے خلاف کسی قسم کی کدورت پائی جاتی ہے !"

نادر نے تائید میں گردن ہلا دی۔" آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر !"

" آخری بات !" حور بانو نے کہا۔" راجا مان سنگھ خسرو کے حامی ہیں، آگرے میں شہنشاہ کی حالت تشویشناک ہے، شیر باز خسرو کا فرستادہ بن کر آیا ہے اور مان سنگھ نے شیر باز سے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ وہ اپنے بہنوئی شہزادے سلیم کے مقابلے میں اپنے بھانجے خسرو کی مدد کریں گے اور آپ چونکہ شہزادے سلیم کے بھیجے ہوتے ہیں اس لئے راجا مان سنگھ آپ پر یقین نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے لوگ اب بھی آپ کی بجائے بابا جان اور شیر باز کی زیادہ عزت کرتے ہیں کیونکہ انہیں قیاس اور قرائن سے معلوم ہو چکا ہے کہ راجا مان سنگھ آپ کو پسند نہیں کرتے !"

نادر نے حور بانو کی بد اندیشیوں کو ہنسی میں اڑا دیا، بولا۔" آپ ان فکروں میں بالکل نہ پڑیے حور بانو۔ شہزادے سلیم کے حریف عنقریب ندامت اور خفت سے دو چار ہوں گے !"

نادر نے چلتے چلاتے حور بانو کو اپنی آغوش میں لے لیا اور بے اختیار کسی

بوسے لے لئے۔ وہ کسمسائی، تڑپی مچلی لیکن یہ سب کچھ رسماً تھا، آتش شوق تو اس کے اندر بھی فروزاں تھی۔

دوسرے دن حور بانو کا باپ نوازش علی نادر پر از حد مہربان نظر آیا۔ فجر کی نماز پڑھ کر جب دونوں مسجد سے باہر نکلے تو راستے میں اس کی نوازش علی سے ملاقات ہو گئی اور سلام میں نوازش علی نے سبقت کی۔ خلافِ امید نوازش علی نے نادر سے کہا۔ "بیٹے نادر! پرسوں ہم سب آگرے چلے جائیں گے، ہماری خواہش ہے کہ تم ان آخری دو دنوں میں ہمیں اس بات کا موقع دو کہ ہم تمہاری دعوت کریں اور کچھ وقت تمہارے ساتھ بھی گزاریں۔"

نوازش علی کے اس تبدیل رویے پر وہ حیران تھا لیکن پھر یہ سوچا کہ ضرور حور بانو نے اپنے باپ کو راضی کر لینے کے لئے کسی منصوبے پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔

فتنے کئی بار مختلف سلسلوں سے اس کے کمرے میں آئی اور اجنبی کی طرح واپس چلی گئی۔

ترچھی گردن والا شیر باز بھی اس سے ملا اور فراخ دلی سے متکبرانہ پیش کش کی، بولا۔ "اگر بنگال کی آب وہوا تمہیں پریشان کرنے لگے تو آگرے چلے آنا، ہم وہاں تمہیں اس سے بھی اچھے کسی منصب پر فائز کرا دیں گے!"

نادر، حور بانو کے مشورے کے مطابق جھگڑے سے بچنا چاہتا تھا۔ خاموش رہ کر اس تلخ پیش کش کو سہہ گیا۔

ظہر کے بعد نوازش علی نے نادر کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہا، اسے نوازش علی کی مہربانی اور جھکاؤ سے روحانی خوشی محسوس ہو رہی تھی، گو بادل گھرے کھڑے تھے پھر بھی اصطبل سے دو گھوڑے نکلوائے اور دونوں ایک ساتھ گھومنے پھرنے کی غرض سے گھوڑوں پر سوار ہو کر ایک طرف روانہ ہو گئے۔ کھیتوں کی حدوں پر اکٹھی ہوئی پگڈنڈیوں پر ان کے گھوڑے سنبھل سنبھل کر چلنے لگے۔ دھانوں کی فصلیں تیار کھڑی تھیں اور ان کے پودے پانی میں اپنا نچلا حصہ چھپائے اور سر اٹھائے اس طرح کھڑے تھے جیسے سبز پریاں پانی میں چھول چھلیاں کھیلنے کی خاطر صف بستہ کھڑی کسی اشارے کی منتظر ہوں۔

نوازش علی نے ذاتی نوعیت کا سوال کیا، پوچھا۔ "تم کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟"

نادر نے جواب دیا۔ "ماورا النہر کے بالائی حصے میں بسنے والے ازبکوں کے خاندان سے۔!"

نوازش علی نے نیا سوال کیا۔" تمہارے خاندان میں کبھی کوئی بڑا آدمی بھی گزرا ہے؟"

"ہاں ایک شخص۔" نادر نے جواب دیا۔" یوں تو بہادروں اور ناموروں سے ہمارا خاندانی شجرہ پٹا پڑا ہے لیکن ایام گزشتہ میں جس کو ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا ایک ایسا نامی شخص گزر چکا ہے جس کے نام سے ہر سپاہی واقف ہے۔"

نادر جواب دیتے ہوتے فخر محسوس کر رہا تھا اور یہ سوچ کر خوش بھی ہو رہا تھا کہ نوازش علی یقیناً حور بانو کو اس سے وابستہ کر دینے پر آمادہ ہو گیا ہے اور خاندان کی بلندی یا پستی کی بابت وہ اسی لئے کرید کر رہا ہے۔

نوازش علی نے حائل ہونے والے ایک نالے کو گھوڑے کی چھلانگ سے عبور کرتے ہوتے پوچھا۔" خاندان کے اس نامی گرامی شخص کا کیا نام ہے؟"

نادر کا گھوڑا بھی اس نالے کو پھلانگ گیا، اور جواب دیا،" شیبانی خان!"

"شیبانی خان!" نوازش علی چونک پڑا اور گھوم کر نادر کو غور سے دیکھا۔" یہ شیبانی خان، ازبکوں کا وہی سردار ہے نا جس نے مغلیہ سلطنت کے بانی بابر کو تقریباً زندگی بھر ستاتے رکھا اور ایک بار اس نے قلعے میں محصور بابر کی بہن کو زبردستی اپنی دلہن بنا لیا تھا؟"

نادر کا چہرہ غصے سے تمتما گیا۔" شیبانی خان پر یہ ایک تہمت ہے جو آپ لگا رہے ہیں۔ بابر نے اپنی مرضی سے اپنی بہن کو شیبانی خان سے بیاہ دیا تھا اور رہا بابر کو ستانے کا سوال تو جب دو حکمران لڑتے ہیں تو ان میں سے ایک فاتح اور دوسرا مفتوح تو ہوتا ہی ہے۔ ماورالنہر اور اس کے قرب و جوار میں شیبانی خان فاتح اور بابر مفتوح تھا تو ہندوستان میں بابر فاتح اور افغان حکمران ابراہیم لودھی مفتوح۔"

نوازش علی مسکرانے لگا۔ پوچھا۔" کیا ناراض ہو گئے؟ ہم تو محض ایک بات کہہ رہے تھے، اس سے ہمارا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ تمہارے دل کو صدمہ پہنچایا جائے۔"

نادر چپ رہا۔

نوازش علی نے ہتک اور ذلت کا ایک نیا تیر چلایا۔ پوچھا۔" کیا یہ سچ ہے کہ شیبانی خان چنگیز خان کے سب سے بڑے بیٹے جوجی خان کی نسل سے تھا؟"

نادر نے آہستہ سے جواب دیا۔" ہاں وہ اسی جوجی خان کی نسل سے تعلق رکھتا تھا!"

نوازش علی نے ہنستے ہوئے کہا۔" لیکن جوجی خان کی بابت تو یہ مشہور ہے کہ یہ چنگیز کی بیوی بورتا کی ناجائز اولاد تھا۔ چنگیز کے مخالف قبیلے نے جوجی کی ماں بورتا کو دو سال

تک اپنے قبضے میں رکھا تھا پھر جب وہ دوبارہ چنگیز خان کے قبضے میں پہنچی تو چند دنوں بعد ہی اس سے جوجی پیدا ہو گیا!"

نادر کا مارے غصے کے برا حال ہو گیا، اس کے جی میں آئی کہ وہ نوازش علی کو اسی لمحے قتل کر دے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔

نوازش علی نے اس کے زخمی دل پر پھایا رکھنے کی کوشش کی۔ کہا۔ "اس میں شرمانے کی کیا بات ہے، ہم میں سے معلوم نہیں کتنے ایسے ہوں گے جن کی مائیں سپاہیوں کی بے اعتدالیوں اور بد اخلاقی کا شکار ہوئی ہوں گی۔"

اب نادر کی جان میں جان آئی۔ نوازش علی کہتا رہا۔ "اور وہ خاندان جو فاتح افواج کی گزرگاہوں میں آباد ہوتے ہیں، یقیناً بے لگام سپاہ کی خرمستیوں کا شکار ہو کر رہتے ہیں۔"

نادر کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ آخر نوازش علی کہنا کیا چاہتا ہے؟

جب کھیتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تو بڑے بڑے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو تہذیب اور تعلیم سے محروم دیہاتیوں کی طرح اجڈ انداز میں سر اٹھائے کھڑے تھے۔ انہی درختوں کے درمیان ایک عمارت نظر آئی۔ نوازش علی اس کے صدر دروازے پر پہنچ کر گھوڑے سے اتر پڑا۔ دربانوں نے گھوڑوں کی راسیں پکڑ لیں، نوازش علی نادر کو لے کر عمارت میں داخل ہوا، اندر کچھ اور لوگ بھی ملے۔

اندر پہنچ کر نوازش علی نے برجوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کبھی یہاں سلطنت کے خطرناک باغیوں کو قید کر دیا جاتا تھا اور یہ مشہور تھا کہ جو قیدی یہاں ایک بار بند ہوا پھر مر کر ہی آزادی حاصل کر سکا ہے۔"

نادر کو یاد آیا کہ جنت آباد (لکھنوتی) کی یہ وہی مشہور جگہ ہے جو بیاز باری کے نام سے دور دور تک مشہور ہے، اس نے پوچھا۔ "یہاں ایک حوض بھی تو ہے کہیں، جس کی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ جب کوئی خطرناک قیدی باآسانی مرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا تو اسے پینے کے لئے اسی حوض کا پانی دیا جاتا تھا جو جسم میں داخل ہو کر زہر کا کام کرتا تھا۔"

نوازش علی نے حیرت سے کہا۔ "ہم تمہیں وہیں لئے چلتے ہیں!"

تھوڑی دیر بعد دونوں حوض کے کنارے پہنچ گئے۔ سطح آب پر بہت زیادہ کائی جمی ہوئی تھی اور وہاں کچھ عجیب سی نمیدہ بو پھیلی ہوئی تھی۔

نوازش علی حوض کی دیوار پر پیر لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس ہی نادر بھی اسی انداز

میں بیٹھ گیا۔

نوازش علی اچانک کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گیا تھا، وہ کچھ سوچ رہا تھا، نادر حوض کی گہرائی کا اندازہ لگانے لگا۔

یکایک نوازش علی نے کہا۔ "اور نادر! ہمیشہ ہماری یہ بات یاد رکھنا کہ اگر گھر میں جوان لڑکی ہو تو کسی پر بھی اعتبار نہ کرنا!"

نادر بوکھلا گیا کہ آخر اس بات کا یہ کون سا موقع ہے۔

نوازش علی نے کچھ اور وضاحت کی۔ بولا۔ "آج گھر کے ایک ایسے دروازے کا قفل ہمیں کھلا ہوا ملا کہ ہم حیران رہ گئے۔ اس میں فتے کا ہاتھ ضرور رہا ہو گا، لیکن وہ قبول نہیں رہی۔"

نادر بدستور چپ رہا۔ نوازش علی نے بات اور آگے بڑھائی۔ کہا۔ "ہم لوگ خاندانی وجاہت اور ذاتی شرافت کے قائل ہیں لیکن جب آدمی میں ان دونوں میں سے ایک چیز بھی نہ پائی جائے تو پھر وہ اس کا مستحق نہیں رہ جاتا کہ اس کے ساتھ کسی قسم کی مروّت یا رعایت سے کام لیا جائے۔"

نادر کا ماتھا ٹھنکا، بولا۔ "جناب آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ایک بار کھل کر کہہ دیں۔"

نوازش علی ایک دم بھتے سے اکھڑ گیا۔ "تم نے ہمارے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔ تم نے اشرفیوں کا لالچ دے کر فتے کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور وہ بھی عاقبت نااندیشی میں جانے کیا کیا کر گزری۔"

نادر چور بن گیا، نوازش علی نے کہا۔ "ہم چاہتے تو حور بانو کے ٹکڑے کر دیتے لیکن اب ہم سب آگرے جا رہے ہیں۔ وہاں پہنچ کر لڑکی خود بخود ———— یہاں کے خوابوں کو بھول جائے گی!" پھر نادر کو ڈانٹا۔ "اور تم! تم وہ ذلیل انسان ہو جس نے ہمارے احسانات بھلا کر حور بانو سے عشق کیا اور اسے ورغلاتا رہا لیکن اس کا نتیجہ کیا نکلا، حور بانو کی پشیمانی اور فتے کا اعترافِ جرم، اب تم بولو کہ تمہیں تمہارے گناہ کی کیا سزا دی جائے؟"

نادر نے جیسے خوابوں میں سوچا۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ حور بانو پشیمان ہو اور فتے اعترافِ جرم کر لے، یہ یقیناً نوازش علی کی چال ہے۔ جو اس طرح اعترافِ گناہ کرانا چاہتا ہے۔

نوازش علی کہتا رہا۔ "جب ہم تمہیں قلعے سے لے کر چلے تھے تو یہ ارادہ کر لیا تھا کہ کسی بھی جگہ موقع پا کر تمہیں اپنے ہاتھ سے قتل کر دیں گے لیکن ایسا کرنے میں یہ احتمال

موجود تھا کہ اگر بوڑھے ہاتھ پھرتی اور چستی سے اپنا کام نہ کر سکے تو تم یقیناً ہم پر غالب آجاؤ گے یہ سوچ کر ہم نے یہ طے کیا کہ اس عمارت میں داخل ہو کر حوض کی دیوار پر بیٹھ کر جو کرنا ہے کریں گے۔"
یہ کہتے ہوئے نوازش علی نے ایک زوردار دھکے سے نادر کو زہریلے پانی کے حوض میں گرا دیا اور اس کے گرتے ہی خود عمارت کے پھاٹک کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا چل دیا۔

عمارت کے پاسبانوں نے نوازش علی کو تنہا نکلتے دیکھا تو انہیں نادر کی فکر ہوئی۔ نوازش علی اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر یہ جا وہ جا اور قلعے واپس چلا گیا، عمارت کے پاسبان نوازش علی کے جاتے ہی نادر کو تلاش کرتے ہوئے، عمارت کے مختلف حصوں میں گھومنے لگے، نوازش علی کو یہ یقین ہو گا کہ اگر اس کے پیچھے عمارت کے پاسبانوں نے کسی طرح نادر کو نکال بھی لیا تو وہ حوض کا زہریلا پانی پی جانے کے سبب زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکے گا' ایک ایسا شخص جس نے اس کی بیٹی کو ورغلانے کی کوشش کی ہو اسی سزا کا مستحق تھا۔

پاسبان نادر کو تلاش کرتے ہوئے جب حوض کے قریب پہنچے تو انہیں اندر سے کسی کے بے معنی شور کرنے کی آواز سنائی دی، ان میں سے ایک نے حوض میں جھانک کر جو دیکھا تو نادر پیر کر زندہ رہنے کی کوشش میں مصروف تھا، حوض کی سطحِ آب کی دیوار کائی کی وجہ سے سیاہ ہو رہی تھی۔ ان دیواروں میں ایک چیز بھی ایسی نہ تھی جسے پکڑ کر وہ اوپر چڑھنے اور حوض سے نکلنے کی کوشش کرتا۔ وہ جب بھی حوض کے کنارے پر پہنچا اور حوض کی دیوار سے پیر ہاتھ لگانا چاہتا، کائی کی وجہ سے پھسل کر رہ جاتا۔ بدبودار پانی کی سڑاند اس کا دماغ خراب کئے دے رہی تھی۔ اور چند گھونٹ پانی حلق کی راہ سے پیٹ میں جا چکا تھا۔

پاسبان جیسے ہی حوض میں جھانک کر دیکھا، نادر نے چیخ کر کہا: "خدا کے لئے ہمیں حوض سے نکال لو، ہم فریب کا شکار ہو گئے ہیں۔" پاسبانوں نے جلدی جلدی اپنی پگڑیوں میں گرہ لگا کر بڑا کیا اور اس کا ایک سرا پکڑے رکھا اور دوسرا حوض میں ڈال دیا۔ اور چیخ کر کہا۔ "اسے مضبوطی سے پکڑ لیجئے اور اس کے سہارے باہر نکل آیئے!"

پیٹ میں پہنچا ہوا پانی اثر دکھا رہا تھا اور نادر کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے آہستہ آہستہ غنودگی طاری ہو رہی ہے اور اس پر عنقریب گہرے خواب کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ اس نے زندگی کی آخری خواہش اور کوشش کے زیر اثر پگڑی کا سرا دونوں ہاتھوں سے تھام لیا اور اس کی مدد سے اوپر چڑھنے لگا۔ کئی بار اس نے اپنے پیر کو کائی زدہ دیوار کائی زدہ دیوار سے ٹکا کر اوپر اٹھنے کی کوشش کی لیکن ہر بار پیر پھسل گیا اور اس کے

دونوں پیر حوض کے پانی میں ڈوب گئے۔ کسی نے اوپر سے چیخ کر کہا: "دیوار سے پیر مت ٹکائیے، ہاتھ کی مدد سے اوپر آجائیے"۔

نادر نے اس ہدایت پر عمل کیا اور بدقت تمام اوپر آگیا لیکن اب اس کا برا حال تھا۔ اور چکرا رہا تھا۔ اور آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ کسی پاسبان کی آواز حالتِ خواب میں سنائی دی: "آپ اس میں کس طرح گر گئے تھے؟"

نادر کے منہ سے بس تنا ہی نکلا کہ "ہم گرے نہیں گرائے گئے تھے" اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا۔

پھر اسے کتنی دیر بعد ہوش آیا۔ نادر کو کچھ پتہ نہ تھا۔ اس وقت وہ جہاں تھا، جگہ مانوس نظر آتی تھی۔ دھندلی نظروں سے فتے اور ایک سائیں کو اپنے پاس کھڑے دیکھا۔ پاس ہی مونڈھے پر ایک طبیب بیٹھا ہوا اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔ اس نے جیسے ہی آنکھیں کھولیں وہاں موجود لوگوں کے چہرے پر بشاشت دوڑ گئی۔

نادر نے کمزور آواز میں دریافت کیا: "نوازش علی کہاں ہیں؟"

فتے نے جواب دیا: "وہ لوگ چلے گئے۔"

"کہاں؟" نادر نے بے چینی سے پوچھا۔

فتے نے بے دلی سے جواب دیا: "پہلے وہ لوگ راجا مان سنگھ کے پاس جائیں گے اس کے بعد آگرے چلے جائیں گے!"

نادر نے دانت کٹکٹائے اور غصے میں کہا۔ افسوس کہ وہ بدبخت بوڑھا چلا گیا۔ اگر وہ یہاں موجود ہوتا تو ہم اس کا گلا ضرور داب دیتے سکار۔ دھوکے باز، فریبی، ہم اسے دیکھ لیں گے"۔

طبیب نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور نرمی سے بولا: "آرام، آرام تمہارے پیٹ سے حوض کا زہریلا پانی خارج کیا جا چکا ہے، اب تم بچ جاؤ گے۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اب۔"

دوسرے دن جب طبیعت کچھ زیادہ بحال ہو گئی تو نادر کو طبیب نے بولنے کی اجازت دیدی۔ فتے اس کے پاس ہی موجود تھی۔ اسے ایسا لگا۔ جیسے نوازش علی کے چلے جانے کی خبر کوئی خواب کی بات ہو۔ اس نے فتے سے ایک بار پھر اس کی تصدیق چاہی۔ پوچھا: "کیا نوازش علی اپنے کنبے کے ساتھ واقعی چلے گئے؟"

فتے نے افسردگی سے کہا: "ہاں وہ سب چلے گئے!"

اس نے پوچھا: "خادم تھے کہاں ہے؟"

فتے نے جواب دیا: "وہ بھی ان کے ساتھ ہی چلا گیا!"

نادر نے فتے کو کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ "اور تم نہیں گئیں ان کے ساتھ؟"

فتنے نے جواب دیا۔ "میں چلی تو جاتی ان کے ساتھ، لیکن مجھے آپ پر رحم آگیا۔ بس اسی خیال سے ٹھہر گئی۔"

نادر نے انسانی پیکر کے اس شریف ترین نسائی روپ کو ممنونیت کی نظر سے دیکھا اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں، اس نے بدقت تمام پوچھا۔ "حور بانو کہاں ہے؟"

فتنے نے نظر چرانے کی کوشش کی، منہ پھیر کر بولی: "وہ بھی اپنے باپ کے ساتھ چلی گئیں۔"

نادر نے اشتیاق آمیز لہجے میں پوچھا۔ "چلتے وقت ہمارے نام کوئی پیغام بھی تمہیں دیا تھا؟"

ہاں" فتنے نے دکھ سے کہا۔ "ایک پیغام دیا تھا لیکن وہ پیغام اُس وقت آپ کو بتاؤں گی جب آپ بالکل تندرست ہو جائیں گے۔"

نادر اٹھ کر بیٹھ گیا اور اصرار سے بولا۔ "میں بالکل تندرست ہوں، تم ڈرو مت، جو کچھ کہنا ہے بے جھجک اسی وقت ابھی کہہ دو۔"

فتنے نے تامل اختیار کیا تو نادر نے اٹھ کر اسے جھنجھوڑ ڈالا، بولا "تم ڈرتی کیوں ہو؟ بتاتی کیوں نہیں۔"

فتنے نے ٹھہر ٹھہر کر کہا: "حور بانو کو یقین تھا کہ آپ مر جائیں گے، لیکن پھر بھی انھوں نے چلتے چلاتے آپ کے نام یہ پیغام چھوڑا ہے کہ پہلی ملاقات پر بالی دیتے ہوتے آپ نے حور بانو کو جس طرح بے آبرو کرنے کی کوشش کی تھی، بادا جان نے اس کا سچا انتقام لے لیا ہے اور یہ کہ انھیں اس انتقام سے بڑی تسکین ہوئی ہے!"

نادر کو فتنے کی بات پر یقین نہ آیا۔ حور بانو اس سے بے پناہ محبت کرنے والی لڑکی، ایسی بات کیونکر کہہ سکتی ہے؟ بولا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو فتنے، حور بانو ایسی بات کبھی نہیں کہہ سکتی!"

فتنے اپنی بات پر قائم رہی، بولی: "میں جھوٹ کیوں بولوں، مجھ سے جو کہا گیا تھا کہہ دیا۔"

نادر کسی پاگل کی طرح اس کی صورت دیکھنے لگا۔

کچھ دیر بعد فتنے نے کہا: "یہ بنگال ہے، یہاں کی کسی شے کا اعتبار نہیں، یہاں کے لوگ بے وفا، موسم ناقابلِ اعتبار، دھوپ چھاؤں غیر یقینی، بڑے بوڑھوں سے تو میں نے اس جگہ کی یہی خاصیت سن رکھی ہے بلکہ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جو لوگ یہاں رہ بس جاتے ہیں وہ بھی ان ہی خاصیتوں کے شکار ہو جاتے ہیں حور بانو ایک مدت سے یہاں رہ رہی تھیں ان پر بھی یہاں کے اثرات کام کر گئے!"

لیکن نادر کو فتنے کی باتوں پر ذرا بھی یقین نہ آرہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر فتنے کی بات درست ہے تو خود فتنے پر ان خصوصیات کا کوئی اثر کیوں نہ ہوا۔ اس نے پوچھا۔ "اور فتنے تم کہاں کی رہنے والی ہو؟"

فتنے نے جواب دیا: "شمالی ہند کی بستی بٹیالی کی۔"

نادر نے نفرت سے پوچھا: "بنگال کی آب و ہوا نے تم پر کوئی اثر نہیں کیا؟"

فتنے شوخی سے مسکرائی۔ بولی۔ "اثر کیا کیوں نہیں۔ میں بچپن سے اب تک حور بانو کے گھر میں رہی ہوں لیکن آج میں نے ان سب کو چھوڑ دیا۔ یہ بے وفائی نہیں تو اور کیا ہے؟"

نادر نے پوچھا: "لیکن اس بے وفائی کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

تیس اکتیس سالہ فتنے نے معنی خیز انداز میں نادر کو دیکھا اور جواب دیا: "صرف آپ کے لئے"

میں نے محسوس کیا کہ اس وقت کسی اور سے زیادہ، میری آپ کو ضرورت ہے !"

نادر نے اس کا جو مطلب لیا، وہ پریشان کن اور تشویشناک تھا پھر بھی ان نازک حالات میں اسے فتے کی ضرورت ضرور تھی۔ آگرے واپس پہنچ کر حور بانو کا پتہ لگانے میں فتے بہت زیادہ سود مند ثابت ہوگی۔ یہ سوچ کر اس نے فتے کو گوارا کر لیا۔

ویران اور اداس شاہی محلات بنگال کے جنت آباد (لکھنوتی) میں اس کا دل نہ لگتا تھا۔ وہ اپنے فرائض منصبی بھی اچھی طرح انجام نہ دے سکتا تھا۔ طبیعت آہستہ آہستہ ٹھیک ہو چلی تھی۔ جب وہ گھوڑے پر سوار دھان کے کھیتوں اور کاشتکاروں کی بستیوں کے بیچ سے گزرتا تو آبنوسی اعضا اور سنگ اسود کے ترشے ہوئے بیضوی چہرے والی دوشیزائیں اس کے احترام میں جھک جھک جاتیں لیکن فتے یہ کہتی تھی کہ یہ بنگال ہے، یہاں کی ہر شے ناقابل اعتبار ہے۔

ایک دن جب وہ گھومتا پھرتا کسی نالے کے پاس سے گزرا تو اس وقت وہ شمال سے مشرق میں بہہ رہا تھا۔ لیکن جب شام کو پھر اُدھر سے گزرا ہوا تو نالہ اپنا رُخ بدل چکا تھا۔ لیکن اب وہ شمال سے جنوب میں بہنے لگا تھا۔ وہ نالے کے کنارے کھڑے ہو کر سوچنے لگا کہ آخر یہ کیا بات ہوئی؟ پاس سے گزرتے ہوئے ایک مدقوق کسان سے اس نے پوچھا: "او بوڑھے! کیا تو بتا سکتا ہے کہ اس نالے کا بہاؤ کس سمت رہتا ہے؟"

مدقوق بوڑھے نے نادر کو خوف زدہ نظروں سے دیکھا اور جواب دیا۔ "کبھی اُتر سے پورب اور کبھی اُتر سے دکھن۔ اس کے بہاؤ کی کوئی ایک سمت نہیں ہے۔"

نادر متردد ہو گیا۔ اسی لمحے اس کے کانوں میں بنگال کے متعلق فتے کی آواز گونجی۔ اس وہم نے اس کا دل بنگال سے اُچاٹ کر دیا۔ اُسے یہ پہلے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ آگرے میں ہندوستان کا بادشاہ قریب المرگ ہے اور وہاں جانشینی کے لئے باپ بیٹے میں رسّا کشی جاری ہے، اس نے حتمی ارادہ کر لیا کہ وہ راجا مان سنگھ سے مل کر سبکدوشی حاصل کرے گا اور وہ فوراً ہی آگرے روانہ ہو جائے گا۔

اجازت طلب کرنے پر کچھ پس و پیش کے بعد راجا مان سنگھ نے نادر کو آگرے جانے کی اجازت دے دی لیکن دبے لفظوں میں اپنی اس خواہش کا بھی اظہار کر دیا کہ اگر وہ باپ بیٹے کی کش مکش میں خسرو کا ساتھ دے گا تو اس کی عنایات ہمیشہ نادر کے ساتھ ہوں گی۔

نادر فتے کو لے کر آگے روانہ ہو گیا۔ ابھی وہ آگرے سے دور ہی تھا کہ اسے اکبر کے

انتقال کی خبر ملی اور یہ بھی معلوم ہوگیا تھوڑی سی کش مکش کے بعد شہزادہ سلیم، نورالدین جہانگیر کے نام سے تخت نشیں ہوچکا ہے۔ اس خبر سے وہ بہت خوش ہوا اور راستے میں رُکے بغیر، دھاوے مارتا ہوا وہ آگرے میں داخل ہوگیا۔

دو دن آرام کرنے کے بعد اس نے جہانگیر سے ملنے کی راہ نکالی اور پھر قلعے کے اس دروازے سے، جس پر پتھر کے ہاتھی کھڑے تھے، نادر قلعے میں داخل ہوگیا۔

ایک جگہ سبزہ زار پر خسرو اپنے مصاحبوں میں گھرا باتوں میں مصروف تھا۔ وہ تختۂ گلاب سے گزر کر لمبے لمبے گاجوں جیسے سرو کی روش میں پہنچ کر کچھ مطمئن ہوا۔ سرو کے درختوں نے شہزادہ خسرو اور اس کے مصاحبوں کے درمیان حائل ہوکر نادر کو چھپالیا تھا۔ نادر نہیں چاہتا تھا کہ اس کا نوازش علی یا شیر باز سے سامنا ہو لیکن ابھی وہ بمشکل پچاس قدم چلا ہوگا کہ ایک سرو کی آڑ سے نوازش علی نمودار ہوا اور تقریباً نادر کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔

نوازش علی نے اس کے سراپا کا بغور جائزہ لیا اور حیرت اور افسوس کے ملے جلے لہجے میں کہا "تم زندہ ہو؟ آگرے کب آئے!"

نادر کی آنکھوں میں خون اتر آیا لیکن حور بانو کے خیال اور شاہی محل سرا کے احترام کی وجہ سے خاموش رہا۔ خون کے گھونٹ پی کر جواب دیا "ہم زندہ ہیں، گھبراؤ نہیں، تم نے ہمیں حوض میں گرا دینے کی شکل میں جو قرض دیا تھا ہم اسے چکانے کے لئے آگرے آگئے ہیں!"

نوازش علی نے لاپروائی سے جواب دیا "کوئی پروا نہیں، — جہاں پناہ کے پاس جا رہے ہو؟"

"ہاں!" نادر نے جواب دیا اور نوازش علی کے چہرے پر مسکراہٹ کی تازگی دیکھ کر مشتعل سا ہوگیا۔

نوازش علی نے گویا سرزنش کی وہ کہنے لگا "جہاں پناہ کے روبرو طبیعت کو مکدر کرنے والی باتوں سے پرہیز کرنا"

نادر کوئی سخت جواب دینے ہی والا تھا کہ ایک شاگرد پیشہ نے نمودار ہو کر بتایا کہ "اسے شہزادہ خسرو طلب کر رہے ہیں" شہزادے کے حکم سے سرتابی ناممکن تھی۔ نوازش علی ذرا پھل گیا۔

جب نادر شہزادے کے روبرو پہنچا تو شیر باز نے اس کا ذرا خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔

شہزادے نے سر اٹھایا اور نادر کو ذرا غور سے دیکھا۔ پھر پوچھا "یہ نوازش علی یا تمھیں کیا نقصان پہنچا سکتا ہے"

شیر باز نے فراخ حوصلہ جواب دیا۔ "ہمیں اس سے کوئی خطرہ نہیں، چچا نوازش علی البتہ کچھ خوف زدہ رہتے ہیں!"

شہزادے نے نادر کی طرف دیکھا اور نہایت دانائی سے پیش کش کی "شیر باز! تم اسے کچھ کر ہمارے دادا ہمایوں نے ندلے احسان کا بدلہ نظام سقے کو ڈھائی دن کی حکومت دے کر چکایا تھا۔ ابھی یہ روایات ہمارے خاندان میں زندہ ہیں، یہ چاہے تو ہمارے امیدواروں میں شامل ہو سکتا ہے!"

جب شیر باز نے شہزادے کی پیش کش نادر کے سامنے رکھی تو اس نے نہایت عاجزی سے جواب دیا "شہزادے! ہم تو آپ کے خاندان کی خدمت اور جاں نثاری کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور یہ خدمت آپ لے لیں یا جہاں پناہ لے لیں۔"

نوعمر اور سادہ لوح خسرو نادر کے جواب سے خوش ہو گیا۔ بولا "جب جہاں پناہ سے مل چکو اور واپس ہونے لگو تو ہم سے ضرور مل لینا۔"

نادر نے فوراً وعدہ کر لیا۔ اب نوازش علی کے چہرے پر بشاشت آچکی تھی۔

اس کے بعد نادر کو بارگاہِ جہانگیری میں جانے کی اجازت مل گئی۔ اس وقت جہانگیر مصاحبینِ خاص میں گھرا ہوا خوش فعلیوں میں مصروف تھا اس نے مسکراتے ہوئے نادر کو اپنے قریب بلایا اور اسے شرفِ ہمکلامی بخشا۔ باتوں باتوں میں جہانگیر نے پوچھا: "تم بنگال سے آرہے ہو۔ کیا یہ درست ہے کہ وہاں کے لوگ اور وہاں کی ہر شے ناقابلِ اعتبار ہیں؟"

نادر نے سر جھکا کے فدویانہ عرض کیا: "بالکل درست ہے جہاں پناہ! اس غلام نے خود اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا ہے کہ ایک نالا جو صبح شمال سے مشرق میں بہہ رہا تھا وہی نالا شام کو شمال سے جنوب میں بہنے لگا۔ جہاں کے ندی نالے تک ناقابلِ اعتبار ہوں وہاں کے انسانوں پر کس طرح اعتبار کیا جا سکتا ہے؟"

پھر نادر نے اول سے آخر تک، جو کچھ پیش آیا تھا، جہانگیر کے گوش گزار کر دیا یہاں تک کہ تھوڑی دیر پہلے پیش آنے والی ملاقات اور گفتگو کا ذکر بھی کر دیا۔ جہانگیر آنکھیں کھولے وحشت سے سب کچھ سنتا رہا، آخر میں کہا "ابدولت کو پرچہ نویس تمہاری روداد سے آگاہ کر چکے ہیں۔ خسرو ابھی بچہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے کاندھوں پر اس کا اپنا سر نہیں ہے، یہ دوسروں کے سر ہیں جن سے وہ اپنے ہر معاملے میں غور و خوض اور فیصلے صادر کرتا ہے۔" پھر پوچھا: "ہم نے اپنے نمک خواروں اور وقت پر کام آنے والوں کو ان کی توقع سے زیادہ نواز دیا ہے، تم اس وقت یہاں موجود نہ تھے، اب بولو تم ہم سے کیا چاہتے ہو؟"

نادر نے عاجزی سے عرض کیا: "کوئی ایسا منصب، جس سے یہ ناچیز دشمنوں کی نظر میں معزز قرار پا جائے!"

جہانگیر نے پلک جھپکاتے ہوئے پوچھا "بے جھجک گزارش کرو۔"

نادر نے پس و پیش سے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا: "اگر جہاں پناہ میری بات کو چھوٹا منہ اور بڑی بات نہ تصور فرمائیں تو یہ ناچیز خواہش کرے گا کہ اسے میر آخور (شاہی اصطبل کا افسر اعلا) بنا دیا جائے!"

جہانگیر نے کچھ تامل سے کہا: "اوں ہوں، یہ نہیں، اس کے سوا کچھ اور مانگ لو۔"

نادر نے جواب دیا: "پھر جہاں پناہ جس منصب کا اس ناچیز کو اہل سمجھیں، مرحمت فرما دیں!"

جہانگیر نے کہا: "پھر بہر دست ہماری معتمدی میں رہو۔"

نادر نے سر جھکا کر اپنی غلامی اور سعادت مندی کا اظہار کیا۔

قسمت نادر کی ایسا پر نوازش علی کا مکان ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ نادر کو نوازش علی اور شیر باز ملے بھی تو ان سے ان کا پتہ نہیں پوچھا جا سکتا تھا۔ ایک دن وہ صیقل گروں کے بازار سے گزر رہا تھا کہ شیر باز نے کسی طرف سے نمودار ہو کر اس کا راستہ روک لیا۔ بولا: "اس دن واپسی میں تم شہزادے سے کیوں نہیں ملے تھے؟"

نادر نے جواب دیا "ہاں تم شہزادے سے کہنا کہ ہمیں دوبارہ ملاقات نہ ہونے کا ملال ہے لیکن کوشش کریں گے کہ جلد ہی ملاقات کریں!"

شیر باز اسے ایک طرف لے جاتا ہوا بولا: "کیا یہ صحیح ہے کہ تمھیں چچا نوازش نے زہریلے حوض میں گرا کر مار دینے کی کوشش کی تھی؟"

"ہاں صحیح ہے!" نادر نے جواب دیا "لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے! پھر نادر نے بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔ اس خوش اخلاقی کے پیچھے ایک مقصد کارفرما تھا۔ نادر نے مسکراتے ہوئے کہا: "شیر باز! ہمیں تمھارا گھر نہیں معلوم تھا ورنہ ملاقات کو ضرور حاضر ہوتے۔"

شیر باز نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ "ہمارے گھر آنے کی کوئی ضرورت نہیں، چچا نوازش تمھیں بالکل پسند نہیں کرتے۔ پھر آنکھ داب کر شرارت آمیز رازداری سے پوچھا: "جہاں پناہ سے کس کس کی شکایت کی؟"

نادر نے جواب دیا: "چغل خوری عورتیں کرتی ہیں۔ مردوں کو مردوں کی طرح رہنا چاہیے۔"

شیر باز نے اسے مشورہ دیا۔ بولا: "تم خود بھی سمجھ دار ہو پھر بھی ہم تمھیں ایک راز کی بات بتائیں گے، گھوڑے کی پچھاڑی اور بادشاہ کی اگاڑی خطرے سے خالی نہیں ہوتی۔"

شاید نادر نے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا، رہ رہ کر دل میں ایک خلش، کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔ اچانک سوال کیا "تم نے شادی کر لی؟"

شیر باز نے بے نیازی سے نفی میں گردن ہلادی، بولا : ابھی نہیں !

نادر نے پوچھا: "پھر کب تک کرو گے ؟"

اس سوال پر شیر باز نے اسے کچھ اس طرح دیکھا کہ نادر پریشان ہو گیا شیر باز نے جواب دیا: "شادی سے پہلے ایک عظیم الشان مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کا عہد۔ کوئی اعلا منصب، پھر شادی !"

یہ کہتے کہتے اس کے چہرے پر اندرونی خوش آئند احساسات کی سرخوشی مسکراہٹ بن کر پھوٹ نکلی۔ ایسی مسکراہٹ، جس میں چہرے کے ساتھ جسم کا رواں رواں شریک تھا۔

جب یہ دونوں جدا ہوئے تو نادر نے نہایت ہوشیاری سے شیر باز کا پیچھا کر کے اس کا گھر دیکھ لیا۔ ایک بدخشی اسلحہ فروش کی دوکان کے پیچھے، جس کے بغل میں جانوروں کا باڑہ تھا۔

گھر پہنچ کر نادر نے فتنے کو یہ خوش خبری سنائی کہ اسے خود بانو کا گھر معلوم ہو چکا ہے لیکن فتنے کو اس خبر سے خوشی نہیں ہوئی کہنے لگی: "لیکن آپ خاطر جمع رکھیں، حور بانو آپ کو نہیں مل سکتی۔"

نادر نے کہا "فتنے ! ہم یہ چاہتے ہیں کہ تم حور بانو سے مل کر ہمارے بارے میں ان کی آخری رائے معلوم کر لو۔"

فتنے نے بے دلی سے کہا: "آپ کہتے ہیں تو میں چلی جاؤں گی، لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں

اس کا خونی باپ مجھے قتل نہ کر دے۔"

نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ نادر نے جواب دیا۔ یہ جنت آباد جنگل نہیں، اگر وہ ہے، اکبر آباد یہاں وہ ایسی جرأت نہیں کر سکتا۔"

نادر کئی بار بدخشی اسلحہ فروش کی دوکان میں گیا اور کافی دیر تک بیٹھ کر واپس آیا۔ یہیں دکان سے نکلتے ہوئے ایک دن اس کی نوازش علی سے مڈبھیڑ ہو گئی، وہ سامنے سے آرہا تھا اور نادر دوکان سے نکل رہا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور نادر نے غیر ارادی طور پر نوازش علی کو سلام کیا۔ نوازش علی نے سلام کا جواب دینے کے بجائے نادر کا راستہ روک لیا، اور بگڑ کر کہنے لگا: "ہمارا خیال تھا کہ تم سے ہمیں نجات مل چکی ہے لیکن تم سخت جان اور بے شرم نکلے۔ اب پرانی باتیں بھلا دو اور ہم دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے دور دور رہیں۔"

نادر نے بھی تیوری بدلی اور تلخ لہجے میں جواب دیا: "ہم عنقریب تمہارا قرض اتار دیں گے۔"

نوازش علی چراغ پا ہو گیا۔ معلوم نہیں کیا کیا برا بھلا بکتا رہا۔ آخر میں صاف صاف کہہ دیا۔

اور دیکھنا، اس فتنے کو اپنے قابو میں رکھو۔ اگر اس نے دوبارہ ہمارے گھر میں قدم رکھا تو دونوں ہاتھ پیر کاٹ دیئے جائیں گے۔ سمجھ گئے؟"

جب نادر گھر پہنچا تو وہاں خوف زدہ فتنے پہلے سے موجود تھی، اسے نوازش علی نے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا تھا۔ اب پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا تھا اس نے طے کر لیا کچھ بھی ہو۔ نوازش علی کا علاج شہنشاہ جہانگیر کو اشتعال میں لا کر کرنا پڑے گا۔

اس نے فتنے سے پوچھا "جب تم گھر میں داخل ہوئی تھیں تو کیا حور بانو سامنے موجود تھیں؟"

"ہاں موجود تھیں!" فتنے نے جواب دیا "لیکن مجھے دیکھتے ہی گھبرا گئی تھیں!"

نادر نے اشتیاق سے پوچھا "حور بانو کی صحت کیسی ہے؟"

"بہت اچھی، دونوں رخسار قندھاری انار ہیں!"

نادر نے اور پوچھا "آنکھوں کی چمک کا کیا حال ہے؟"

فتنے نے جواب دیا "میں نے آنکھوں کی چمک پر تو غور نہیں کیا لیکن جب وہ مجھے دیکھ کر خوف زدہ انداز میں مسکرائیں تو ان کے دانت البتہ چمک رہے تھے۔"

نادر نے مزید پوچھا "حور بانو نے ہمارا نام بھی لیا تھا بھلا؟"

نہیں۔ فتنے نے جواب دیا "وہ بس اتنا ہی کہہ سکی تھیں کہ اماں دیکھنا یہ فتنے بدذات پھر آگئی، اسی وقت نوازش علی آگئے!"

"پھر کیا ہوا؟"

پھر حور بانو کا مجھ سے پردہ کرا دیا گیا اور نوازش علی نے مجھے دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ جب میں مچلی تلملائی تو میرے کئی ہاتھ جڑ دیئے۔"

نادر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حور بانو ہمیں اب بھی چاہتی ہے اسے ہمارا انتظار ہے۔" پھر فتنے کو سمجھاتا ہوا بولا "فتنے! تمہیں خوف زدہ یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

اس کے کئی دن بعد نادر کو حور بانو کا ایک خط ملا، جسے حور بانو کے خادم ننھے نے پہنچایا تھا۔ حور بانو نے لکھا تھا۔

"نادر! ہم اب بھی آپ کے منتظر ہیں۔ ہم بہت زیادہ پریشان ہیں اور سخت الجھنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ سنتے ہیں آپ کو جہاں پناہ کا قرب حاصل ہو چکا ہے۔ خدا کے لئے کچھ کیجئے آخر آپ سوچ کیا رہے ہیں؟ مجھے بادا جان سے نفرت سی ہو چلی ہے!"

جواب میں نادر نے بھی دو سطریں لکھ دیں "حور بانو آپ گھبرایئے مت، ہم یا تو آپ کو حاصل کر لیں گے ورنہ جان دے دیں گے۔ یہ ایک مرد کا عہد ہے، ایک سپاہی کا پیمان، جو

انشاء اللہ پورا ہو کر رہے گا۔"

جشنِ نوروز منائے چھبیس، ستائیس دن گزر چکے تھے اس جشن میں نادر کو یک ہزاری ذات اور پانچ صدی سوار کا منصب عطا ہوا تھا۔ جہانگیر کے شب و روز عیش و عشرت میں گزر رہے تھے، نادر موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ حور بانو کے لئے جہانگیر سے بات کرنا چاہتا تھا۔ رات کو جب طرب گاہ جہانگیری میں محفلِ ے نوشی جمی اور پینے پلانے کا ہنگامہ گرم ہوا، پھولوں جیسے ہیکے سے صراحی بردوش شریک محفل امراء اور مقربین کے خالی جام بھرتے پھر رہے تھے، عالم سرخوشی میں بھی لوگوں کو آدابِ شاہی کا بڑا خیال تھا، جہانگیر سے نظریں بچا کے حسن و شباب کے دیوانے نوخیز اور ہوش ربا ساقیوں کے ہاتھ پکڑ کر آغوش میں گرا لیتے اور بے اختیار اور دیوانہ وار بوسے برسا دیتے۔ باچھوں سے بہتی ہوئی شراب سے پری پیکروں کے رخسار اور دوسرے اعضا لتھڑ جاتے اور وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر ان کے قابو سے نکل کر ہاتھوں سے رخسار پونچھنے لگتیں۔

ہلکے سروں میں ساز بج رہے تھے اور خوش الحان گانے والیاں لوگوں کے جذبات میں آگ لگا رہی تھیں۔ ایرانی شعراء کی عاشقانہ اور شہوت انگیز غزلوں، شراب کی گرمی، خوش الحانی کے جادو اور سازوں کے سرور انگیز زیر و بم نے لوگوں کے دل و جگر کو پھونک کر رکھ دیا تھا۔ حسن و جمال کے پیکر اور رعنائی و زیبائی کے متحرک اور رقصاں ماہی صفت پری چہرہ بھی از خود رفتہ ہو رہے تھے۔ نادر بھی اس سیلِ حسن نور میں گم، حور بانو کی یاد کی شمع جلائے موقع کی تاک میں تھا کہ مناسب موقع ملتے ہی وہ حور بانو کی بات کرے۔

جہانگیر نے مخمور نظروں سے اپنے امراء اور مقربین کو دیکھا اور کہا: "ہم نے شراب کو ممنوع قرار دیا ہے لیکن آج اس جشنِ طرب میں یہ حلال قرار پا گئی ہے۔" یکایک اس کی نظر نادر پہ پڑی، جو محفل کے ہنگاموں سے کچھ الگ تھلگ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ جہانگیر نے ایک نوخیز ایرانی حسینہ کو حکم دیا: "ذرا اس صوفی کو ہمارے حضور حاضر کرو۔"

اس مجسمۂ رعنائی نے نادر کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر، ادب سے جب یہ بتایا کہ ظلِ شہنشاہ یاد فرما رہے ہیں تو وہ افتاں و خیزاں، تقریباً لڑکھڑاتا ہوا جہانگیر کے قریب پہنچ گیا۔ اور جھک کر سجدۂ تعظیمی ادا کیا۔

جہانگیر نے سرمستی میں پوچھا: "ہم نے تمہیں یک ہزاری ذات اور پانچ صدی سوار کے اعزاز سے نوازا، تم پھر بھی اداس نظر آتے ہو، آخر کیوں؟"

نادر نے اشاروں میں حرفِ مدعا ادا کیا: "جہاں پناہ کی نوازشیں تو عام ہیں — پھر بھی آپ کے اس غلام کے دل میں ایک ایسا شگاف پڑ چکا ہے جسے بہت بڑا جرم دیکھنے والے

شاہی مناصب اور اعزاز بھی پُر نہ کر سکیں گے!"

جہانگیر نے چونکا دینے والی بات کی۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو، ہمیں معلوم ہے شاہی وقائع نویس ہمیں مطلع کر چکے ہیں کہ تم نوازش علی کی لڑکی حور بانو کے طلب گار ہو!"

نادر نے سر جھکایا اور وفورِ جذبات سے عرض کیا: "شہنشاہ روشن ضمیر ہیں، جو بغیر کہے ہی دلوں کے راز جان لیتے ہیں۔۔۔۔"

جہانگیر نے اس کی بات کاٹ دی اور کہا: "لیکن یہ بات معدلتِ جہانگیری کے خلاف ہے کہ ہم کسی امیر کی لڑکی جبراً دوسرے امیر کے حوالے کر دیں اور یہ بھی ناممکن ہے کہ ہم اس سلسلے میں نوازش علی پر کوئی دباؤ ڈالیں۔"

نادر کو ایسا لگا جیسے وہ کسی بہت اونچی جگہ سے گرا دیا گیا ہے۔

جہانگیر کا دریائے بخشش جوش پر آیا، اس نے شریکِ محفل پری پیکروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "ہاں اگر ان میں سے کسی پر تمہاری نظرِ انتخاب جچے تو ہم اسے اسی وقت تمہارے حوالے کر دیں گے!"

نادر نے رنج و مایوسی سے عرض کیا: "غلام عشق کا راہی ہے، اگر حور بانو نہیں تو پھر کوئی اور کیا کرے گا!"

اسی وقت ایک خادمِ خاص کسی طرف سے نمودار ہو کر تیز تیز چلتا ہوا بادشاہ کے روبرو سجدے میں گر گیا اور ادب سے عرض کیا: "جہاں پناہ! امیر الامرا ایک سنگین اور تکلیف دہ مسئلے سے حضور کو مطلع کرنے کے لئے اسی لمحے باریابی کے خواستگار ہیں!"

ایک لمحے کے لئے بردۂ سلطنت پر ناگواری سے جنبش ہوئی اور حکومت کی پیشانی پر فکر کی شکنیں پڑ گئیں۔ جہانگیر اسی وقت شاہ برج میں چلا گیا اور امیر الامرا کو وہیں طلب کر لیا۔

محفلِ جشن و طرب پھیکی پڑ گئی اور پھر ذرا دیر بعد ہی بادشاہ کے حکم سے یہ محفل برخاست ہو گئی اور چند خاص خاص امرا شاہ برج میں داخل ہوئے جہانگیر امیر الامرا سے کہہ رہا تھا۔ "لیکن خسرو تو عرش آشیانی (اکبر) کے مزار کی زیارت کو گیا تھا!"

امیر الامرا نے سر جھکائے ہوئے عرض کیا۔ "اس غلام کو تو شاہی مشعلچی نے تحقیق کے بعد یہ ہوش رُبا اطلاع دی ہے کہ شہزادہ خسرو، شاہی اصطبل سے گھوڑے لے کر اپنے ساڑھے تین سو ساتھیوں کے ساتھ بغاوت کے ارادے سے فرار ہو گئے ہیں!"

جہانگیر نے بھاری آواز میں پوچھا: "اس کے ساتھ میں جانے والوں میں امرا میں کون کون شریک ہے؟"

امیر الامرا نے فدویانہ عرض کیا: "حسین بیگ بدخشی، عبدالرحیم، خود سر اور تن کر چلنے والا

شیر باز اور اس کا چچا نوازش علی:
ساری بات نادر کی سمجھ میں آچکی تھی، جہانگیر نے ایک اچٹتی نظر نادر پر ڈالی۔
دوسرے اُمرا خاموش کھڑے معاملے کی خطرناک نوعیت سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔
جہانگیر نے امیر الامرا کو اس طرح دیکھا جیسے کوئی چھوٹا اپنے بزرگ کو دیکھتا ہے پھر پوچھا
اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے، آپ بمنزلہ عرش آشیانی (اکبر) ہیں!"
امیر الامرا نے مودبانہ عرض کیا: اگر حضور حکم دیں تو یہ غلام اسی وقت شہزادے کے تعاقب میں روانہ ہوجاتا ہے۔ اور سادہ لوح شہزادے کو اس کے بدنہاد ساتھیوں سمیت گرفتار کر کے بارگاہ عالی میں حاضر کر دے:
جہانگیر نے سر کے اشارے مشورے کی توثیق کر دی اور دبدبے سے کہا: "مشورے پر عمل کیا جائے!"
امیر الامرا نے فکر مندی سے پوچھا: "اگر اس ناچیز کی نصیحتوں کا شہزادے پر کوئی اثر نہ ہو تو؟"
جہانگیر نے سوالیہ نظروں سے امیر الامرا کو دیکھا اور پوچھا "مافی الضمیر کی وضاحت۔"
امیر الامرا نے کہا: "اگر شہزادہ واپس آنے پر آمادہ نہ ہو اور مقابلے کے لئے ہتھیار سنبھال لے تو اس صورت میں غلام کو کیا کرنا چاہیئے؟"
جہانگیر نے گمبھیر آواز میں اپنا فیصلہ سنا دیا: "اگر وہ کسی طرح راہ راست پر نہ آئے تو پھر جو کچھ تم سے ہو سکے، اس میں کمی نہ کرنا کیونکہ سلطنت خویشی اور فرزندی کی مراعات نہیں برداشت کر سکتی:
کہ بادشاہ خویشی نہ دارد
امیر الامرا نے جھک کر اور ہاتھوں کو ہلا ہلا کر چند فرشی سلام کئے اور الٹے قدموں چل کر شاہ برج سے نکل گیا۔
اس کے جاتے ہی نادر نے نہایت ادب سے عرض کیا: "اگر جہاں پناہ اجازت دیں۔ تو یہ غلام بھی کچھ کہنے کی جسارت کرے:"
جہانگیر نے جواب دیا: "اجازت ہے!"
نادر نے کہا: "حضور کا شہزادے خسرو کے تعاقب میں امیر الامرا کو روانہ کرنا اس ناچیز کی رائے میں کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے!"
جہانگیر نے تشویش سے پوچھا: "کیوں؟ مفہوم تفصیل سے واضح کرو!"
نادر نے جواب دیا: "امیر الامرا کی شہزادے سے پرانی رنجشیں چلی آرہی ہیں اور

اس وقت جہاں پناہ نے خود ہی امیر الامراء کو شہزادے کے خلاف سختی کرنے کی اجازت دے دی ہے اور اس اجازت کے بعد کہ سلطنت خویشی اور فرزندی کی مراعات برداشت نہیں کر سکتی۔ کچھ بعید نہیں کہ اب جہاں محض زبان سے کام نکل سکے، امیر الامراء تلوار سے کام لیں۔"

جہانگیر کو یہ مشورہ پسند آیا اور اسی وقت ایک خصوصی فرمان امیر الامراء کی واپسی کا جاری کر دیا۔

نادر کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن جہانگیر نے اس کا موقع ہی نہ دیا، بولا "تمھیں یہ تو معلوم ہی ہو چکا ہے کہ نوازش علی اور شیر باز بھی خسرو کی حماقتوں میں شریک ہیں۔ اس مہم میں تمھیں بھی شریک ہونا ہے۔ اس کے بعد مہم کی کامیابی پر ما بدولت غدار اور باغی نوازش علی کی بیٹی تمھارے حوالے کر دیں گے!"

نادر تعمیلِ حکم میں خم ہو گیا۔ پھر دوسرے امرا کے مشورے سے جہانگیر نے مشتبہ اور غیر وفادار افراد اور خاندانوں کی نگرانی اور قید کا فرمان صادر کر دیا۔

مہم پر روانگی سے پہلے نادر فتے کو لے کر حور بانو کے گھر پہنچ گیا۔ اب اس معتوب خاندان کی سرپرستی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ شاہی عتاب نے عزیز رشتے داروں کو اس گھر سے گریزاں کر دیا تھا۔

فتے نے بادلِ نخواستہ ملاقات کا اہتمام کیا، حور بانو بہت اداس تھی۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ نادر کو شہزادے خسرو اور اس کے ساتھیوں کے تعاقب اور گرفتاری پر مامور کیا گیا ہے تو اس کا دل بھر آیا۔

نادر نے سوگوار اور ملول چہرہ انگلیوں کی مدد سے اوپر اٹھایا اور کہنے لگا۔ "حور بانو! اب ہم آپ کو عنقریب حاصل کر لیں گے، جہاں پناہ نے وعدہ کر لیا ہے کہ اگر ہم اپنی مہم میں کامیاب ہو گئے تو وہ آپ کو ہمارے سپرد کر دیں گے!"

حور بانو نے ویران اور خشک آنکھوں سے نادر کو دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ نادر نے اس کے دونوں گال تھپتھپا دیے، بولا۔ "خدا سے دعا کیجیے کہ وہ ہمیں اپنی مہم میں کامیابی عطا کرے اس کے بعد ہم دونوں ایک ہو جائیں گے۔"

حور بانو نے بے رخی سے لیکن پرسوز لہجے میں جواب دیا۔ "ہم نہ تو آپ کے حق میں دعا کر سکتے ہیں نہ بابا جان اور شیر باز کے حق میں۔"

"یہ کیوں؟"

حور بانو نے جواب دیا۔ "اگر شہزادے خسرو بغاوت میں کامیاب رہے تو آپ ناکام رہیں گے اور پھر بادا جان اور شیر باز فتح مندی کی خوشی میں آپ کو کہیں کا بھی نہ رکھیں گے لیکن اگر آپ کامیاب ہو گئے تو پھر ان دونوں کی خیر نہیں۔ ہم یہ بالکل نہیں چاہتے کہ آپ لوگ آپس میں جدال و قتال کریں۔"

فتنے نے درمیان میں نازل ہو کر دونوں ہی کو گھبرا دیا۔ آتے ہی کہنے لگی۔ "ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ جہاں پناہ خود بھی شہزادے کے تعاقب میں روانہ ہو رہے ہیں!"

نادر کی دل کی دل ہی میں رہ گئی، وہ جاتے جاتے کہنے لگا۔ "اچھا حور بانو! ہم چلتے ہیں تم گھبرانا مت۔ مصیبتوں کے دن گزر چکے ہیں!"

حور بانو نے اچانک اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک عجب انداز دل ربائی سے کہنے لگی۔ "ہم جانتے ہیں کہ آپ کے دل میں دونوں کے خلاف کیسا انتقامی جذبہ کارفرما ہو گا پھر بھی آپ سے یہ درخواست کریں گے کہ اگر دونوں قابو میں آجائیں تو ان کے ساتھ ذرا ہمدردانہ سلوک کیجئے گا۔"

"وعدہ!" نادر نے فراخ دلانہ جواب دیا۔ "آپ مطمئن رہیں حور بانو!"

پھر آس پاس کسی کو نہ دیکھ کر چپکے سے کہا۔ "اب ہمیں گستاخی کی اجازت دیجئے۔"

حور بانو نے شرما کر سر جھکا لیا اور دوسری طرف منہ پھیر کر بیٹھ گئی اور لجائی آواز میں بولی۔ "نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔"

نادر نے ستانے کے لئے کہا۔ "پھر آپ جانیں اور آپ کا کام، ہم کچھ نہیں جانتے حور بانو! آپ دیکھ لیجئے گا ایک ایک باغی یا غدار کو پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا!"

حور بانو نے ہول کر آنکھیں بند کر لیں۔

جب وہ حور بانو سے رخصت ہو کر باہر نکلا تو اسے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ اسے اب گھر واپس نہیں جانا ہے۔ اس نے فتنے کو کچھ ضروری ہدایتیں دیں تو فتنے نے آزردگی سے پوچھا۔ "حور بانو نے آپ کو کیا جواب دیا؟"

نادر نے کہا۔ "اب ہمیں اس کے جواب کی کوئی پرواہ نہیں کیوں کہ جہاں پناہ نے ہم سے وعدہ کر لیا ہے کہ مہم سے بامراد واپسی پر ہم دونوں کو دھوم دھام سے وابستہ کر دیا جائے گا، ہمیں اس سے جزاالٰہی کیا مل سکتا ہے!"

فتنے روہانسی ہو گئی۔ آپ ہی آپ کہنے لگی۔ "آپ کے گھر میں بھی اسی وقت تک ہوں جب تک آپ واپس نہیں آجاتے اس کے بعد میں بھی کہیں چلی جاؤں گی!"

نادر نے اس کی پوری بات شاید سنی بھی نہیں اور گھر سے باہر نکل کر گھوڑے پر

سوار ہو گیا۔

خسرو اپنے ساتھیوں کی معیت میں متھرا سے نکل کر لاہور کی طرف بڑھا۔ نادر کا لشکر تیزی سے ان کا تعاقب کر رہا تھا، جس راستے سے خسرو اور اس کی سپاہ کا گزر ہوا تھا اس کی آبادیوں کو تباہ و برباد کر دیا گیا تھا۔ لاہور کے قلعے دار کو خسرو کی سرکشی اور بدنیتی کا علم ہو چکا تھا اور وہ قلعے میں بند ہو کر بیٹھ چکا تھا۔ جب خسرو وہاں پہنچا اور قلعے کے دروازہ کو بند دیکھا تو بہت ہی جھنجلایا اور اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ کسی بھی طرح اندر داخل ہونے کی کوشش کی جائے اگر مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی تو خسرو کی طرف سے فوجیوں کو سات دن تک شہر لوٹنے کی اجازت حاصل ہو گی لیکن ابھی یہ لوگ پس و پیش ہی میں تھے کہ نادر بھی ان کے سروں پر آ پہنچ گیا، خسرو اور اس کے ساتھی گھبرا کر دوسری طرف فرار ہو گئے۔

خسرو بھاگ کر چناب کے کنارے پہنچ گیا، وہ شاہ پور کے راستے سے چناب عبور کرنا چاہتا تھا لیکن خدشہ محسوس کر کے وہ سودھرا نامی گھاٹ پر پہنچ گیا۔ جہانگیر نے جملہ گھاٹوں پر بذریعہ فرمان پہرے بٹھا دیے تھے۔ خسرو اور اس کے ساتھیوں نے سودھرا گھاٹ زبردستی عبور کرنا چاہا لیکن انہی لمحوں میں نادر بھی ان کے سروں پر جا پہنچا۔ اس نے دیکھا کچھ لوگ زبردستی کشتیوں پر سوار ہو کر فرار ہو رہے ہیں، نادر اور اس کی سپاہ نے دریا کے بہاؤ پر کشتیوں کو بھاگتے ہوئے دیکھا۔ نادر نے تیراندازی شروع کر دی جواب میں کشتیوں میں سے بھی تیراندازی شروع ہو گئی۔

یہ کشتیاں تیزی سے تیر چلاتی ہوئی چار کوس تک بھاگ چلی گئیں نادر اور اس کے ساتھی بھی برابر تعاقب میں لگے رہے، یہاں تک کہ خسرو کی بدقسمتی سے اس کی کشتی ریت پر چڑھ گئی نادر ان کے قریب جا پہنچا، دونوں میں سخت مقابلہ ہوا لیکن حقیقتاً خسرو کی قسمت اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی۔ اس کے بیشتر ساتھی مارے جا چکے تھے اور اب ان کی ترکشیں خالی ہو چکی تھیں۔ نادر نے چیخ کر انہیں حکم دیا۔ "اپنے ہتھیار زمین پر پھینک دو تاکہ ہم تمہیں جان سے نہ ماریں!"

سہمے اور خوف زدہ لوگوں نے اپنے جملہ ہتھیار زمین پر گرا دیے۔

نادر احتیاط کے ساتھ ان کے قریب گیا لیکن ابھی وہ گفتگو کا آغاز بھی نہ کر سکا تھا کہ کسی نے اس کی پشت پر سے وار کرنا چاہا لیکن اسی لمحے کوئی سپاہی آڑے آ گیا اور خود کو زخمی کر کے نادر کو بچا لیا۔

نادر نے اس حملہ آور کو فوراً ہی پہچان لیا اور حیرت سے کہا۔ "ارے آپ؟ نوازش علی بابا!"

نوازش علی کو رسیوں سے جکڑ دیا گیا، وہ غصّے سے نادر کو گھور تا رہا، کوئی جواب نہیں دیا۔

جہانگیر لاہور کے قریب پہنچ چکا تھا۔

گرفتاری کے دوسرے دن ہی امیرالامرا خسرو کی گرفتاری کے لئے نادر کے پاس پہنچ گیا۔

کھیل ختم ہو چکا تھا۔ جہانگیر کامران باغ میں خسرو اور اس کے ساتھیوں کی پیشی کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ پھر ایک ہلکا سا شور اٹھا کہ شہزادہ خسرو اور اس کے ساتھی پابہ زنجیر بارگاہ سلطانی میں لائے جا رہے ہیں۔ پھر چنگیز خانی قانون اور قاعدے کے مطابق خسرو کو دست بستہ اور پابہ زنجیر بائیں طرف سے جہانگیر کے روبرو پیش کر دیا گیا۔ اس کے دائیں طرف حسین بیگ بدخشی اور بائیں طرف عبدالرحیم کو کھڑا کیا گیا۔ ان کے پیچھے نوازش علی اور شیر باز تھے۔ جہانگیر انہیں خفگی اور جلال سے گھور رہا تھا۔ خسرو کھڑا لرز رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

نادر احساس برتری کے ماتحت آگے بڑھا اور نوازش علی اور شیر باز کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک ادائے بے نیازی سے ان دونوں کی بے کسی اور بے بسی پر مسکرا رہا تھا۔ شیر باز کی گردن میں اس وقت بھی کجی موجود تھی نادر کو دیکھتے ہی حقارت سے اس پر تھوک دیا۔

پھر تھوڑی دیر بعد جہانگیر کی معدلت گستری پر بیٹے کی محبت غالب آگئی۔ اس نے باغیوں کے خلاف فوراً ہی اپنا فیصلہ صادر فرما دیا۔ "خسرو کے سر برآوردہ ساتھیوں کو گدھے اور بیل کی کھالوں میں سی کر اور انہیں گدھوں پر الٹا بٹھا کے آبادی میں پھرایا جائے، اور بقیہ غداروں اور باغیوں کو، کامران باغ اور لاہور کے دروازے کے درمیان سڑک کے آس پاس پھانسیاں گاڑ کر، لٹکا دیا جائے!"

بموجب شاہی فرمان حسین بیگ اور عبدالرحیم کو جانوروں کی کھالوں میں سی کر آبادی کے بیچ میں گشت کرایا گیا۔ اور گشت ہی میں ان دونوں کی موتیں واقع ہو گئیں۔

جب نوازش علی اور شیر باز کو پھانسیوں تلے لے جایا گیا تو نادر بھی وہیں پہنچ گیا، اس وقت اس کی کچھ اور ہی کیفیت تھی۔ ایک طرف جذبۂ انتقام تھا تو اسی جذبۂ انتقام کے آس پاس شرافت، انسانیت اور خدا ترسی کے احساسات بھی موجود تھے۔

بھدی اور چیچک زدہ شکل کا سپاہی آگے بڑھا اور شیر باز کے گلے میں پھندا ڈالنے لگا اس نے شیر باز کی ترچھی گردن کو زبردستی سیدھا کرنا چاہا تو وہ چھلک پڑا۔ نادر کو گھورتا ہوا بولا۔

"تم شماتت اور استہزا سے کیوں دیکھتے ہو۔ یہ تو ایک جوا تھا، جوے میں ہار جیت تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ ہم ہار چکے ہیں اور جان دے کر اپنی ہار کا اعلان کر رہے ہیں لیکن لوگو! یہ کہاں کی معدلت گستری ہے کہ جہانگیر نے اس بازی کے سب سے بڑے جواری اور سرخیل اپنے بیٹے خسرو کو کوئی سزا نہیں دی۔"

شاہی کارندوں نے شہباز کو خاموش کرنے کے لئے اس کا منہ دبا دیا۔

اس نے بے حد اداس اور غمگین نواز ش علی کو دیکھا وہ نادر سے نظریں نہیں ملانا چاہتا تھا۔ نادر اس کے قریب گیا اور معلوم نہیں کیوں اس سے ایک عجیب سا سوال کر بیٹھا۔ پوچھا۔ "اس کے بعد ہم آگرے واپس چلے جائیں گے۔ حور بانو کے لئے کوئی پیغام؟"

نوازش علی نے طیش اور ہمدردی کے ملے جلے انداز سے، نادر کو دیکھا۔ پھر باوقار لہجے میں بولا۔ "ہاں ہے، اگر تم اسے حور بانو تک پہنچا دو۔"

نادر نے شریفانہ انداز میں وعدہ کیا۔ "ہم آپ کے اس حشر سے سوگوار اور مجبور ہیں۔ آپ کا ایک ایک لفظ حور بانو تک پہنچا دیا جائے گا۔"

نوازش علی نے آنکھیں بند کر لیں اور چپکے چپکے کہنے لگا۔ "حور بانو سے کہنا۔ محبت سبھی کرتے ہیں لیکن جس سانپ نے تمہارے باپ کو ڈسا ہے وہ کتنا ہی حسین اور پیاری شکل و صورت کا کیوں نہ ہو، اس کا مستحق نہیں قرار پا سکتا کہ تم اسے اپنے گلے کا ہار بنا لو۔ تم اس سے کہنا، نوازش علی شریف تھا۔ باپ کی وصیت پر عمل کر کے تمہیں بھی اپنی شرافتِ نفس کا ثبوت دینا ہو گا۔!"

نادر نے نوازش علی کے پیغام کو خوب اچھی طرح حافظے میں بٹھا لیا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا اور دل اندر سے ملامت کر رہا تھا کہ اے کاش نوازش علی سے ان لمحات میں کوئی ملاقات ہی نہ ہوئی ہوتی۔

باغیوں کو سڑک کے آس پاس کھڑی ہوئی پھانسیوں میں لٹکا دیا گیا۔ رسیوں سے لٹکی ہوئی لاشوں کے سر ان کے شانوں پر ایک طرف ڈھلک گئے۔ جہانگیر کے حکم سے ان لاشوں کے درمیان سے شہزادے خسرو کی سواری گزاری گئی۔ شہزادہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہاتھی پر سوار تھا اور یہ ہاتھی مستانہ چال چلتا ہوا لاشوں کے بیچ سے گزر کر لاہور دروازے کی طرف جا رہا تھا، ہاتھی کے آس پاس نقیبوں کی فوج اس طرح چل رہی تھی جیسے شاہی سواریوں کی جلو میں چلا کرتی ہے۔ خسرو اپنے ساتھیوں کے حشر سے خوفزدہ اور سہما ہوا رہا تھا اور اس کی جلو میں چلنے

والے نقیب باآوازِ بلند چیخ رہے تھے۔

"ہوشیار! خبردار! بادشاہ سلامت کو اُمرا مُجرا ادا کر رہے ہیں!"

جہانگیر ابھی آگرے واپس نہیں جانا چاہتا تھا، نادر نے واپسی کی اجازت لی تو جہانگیر کو اپنا قول یاد آگیا۔ اسی وقت ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے نوازش علی کی جائداد اور حور بانو کو اس کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

نادر تھکا تھکا اداس اور نڈھال نڈھال آگرے میں داخل ہوا۔ اس وقت سورج طلوع ہو رہا تھا۔

حور بانو اسے اداس دیکھ کر اداس ہو گئی اس نے سراپا جستجو اور مجسم آرزو بن کر پوچھا۔

"بابا جان کا کیا ہوا؟"

نادر اس کی صورت ہی دیکھتا رہ گیا۔

اس نے نادر کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے ہلا کر پوچھا۔ "شیر باز کہاں ہے۔؟"

نادر جو کہنا چاہتا تھا الفاظ اور ہمت اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

حور بانو قرائن سے معاملے کی تہ کو پہنچ گئی اور بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ حور بانو کے آنسوؤں کی جھڑی نے اس کے دل پر آرے سے چلا دیے۔ وہ بے موسم برسات کو نظریں گاڑے دیکھتا رہا پھر بدقت تمام رک رک کر کہا۔ "حور بانو جب آپ کے باپ کو پھانسی کے پھندے تلے کھڑا کیا گیا تھا تو انہوں نے ہمیں ایک پیغام دیا تھا!"

حور بانو نے کسی پگلی کی طرح ڈبڈبائی آنکھوں سے نادر کو دیکھا بولی۔ "آپ چپ کیوں ہیں۔ بولتے کیوں نہیں۔؟"

نادر نے حور بانو کے چہرے سے نظریں ہٹا کر دروازے کی دہلیز پر گاڑ دیں اور کہنے لگا۔ "انہوں نے کہا تھا کہ حور بانو سے کہنا، محبت سبھی کرتے ہیں لیکن جس سانپ نے تمہارے باپ کو ڈسا ہے وہ کتنا ہی حسین اور پیاری شکل و صورت کا کیوں نہ ہو، اس کا مستحق نہیں قرار پا سکتا کہ تم اسے اپنے گلے کا ہار بنا لو۔ تمہارے بابا نے مزید کہا تھا کہ حور بانو سے کہنا نوازش علی شریف تھا، باپ کی وصیت پر عمل کر کے تمہیں بھی اپنی شرافت نسبی کا ثبوت دینا ہوگا!"

وصیت اور باپ کا پیغام سن کر تھوڑی دیر تک تو حور بانو سر جھکائے چپکے

چپکے روتی رہی پھر وہ بے اختیار چیخ مار کے رو دی اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "بادا آپ کا پیغام مل گیا!"

نادر نے ذرا دیر بعد اپنا سر اٹھایا اور بے خیالی میں سوال کیا۔ "حور بانو! اب ہمارے لئے کوئی حکم ہے؟"

حور بانو نے سسکیاں لیتے ہوئے جواب دیا۔ "کوئی حکم نہیں!"

نادر نے حسرت سے حور بانو کو دیکھا اور پھر آخری بار وہاں کے در و دیوار دیکھ کر باہر نکل آیا۔

اس کے پیچھے ہی فتے بھی آگئی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی نادر کے پاس پہنچی اور کہنے لگی۔ "میں نے تم دونوں کی ساری باتیں سن لی ہیں۔ اب کیا ارادے ہیں؟"

نادر نے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کی نظر سے فتے کو دیکھا اور بے خیالی میں جواب دیا۔ "اب کوئی ارادہ نہیں فتے۔ ہم جیت کر بھی بازی ہار چکے ہیں۔ ہارے ہوئے جواری کے پاس اب رہا ہی کیا ہے جو کسی بات کا ارادہ کرے۔"

فتے نے جذباتی اور اپنائیت کے لہجے میں جواب دیا۔ "تم جہاں جاؤ گے میں تمہارا ساتھ دوں گی۔ تم کھو گئے تھے۔ شاید میں نے تمہیں پا لیا ہے۔!"

نادر نے سنکی انداز میں "ہاں آں" کہا اور پھر یہ دونوں آگرے سے کہیں اور چلے گئے۔

سنا ہے حور بانو مدتوں نادر کی واپسی کا انتظار کرتی رہی، اس کا خیال تھا کہ نادر ایک نہ ایک دن اس کے پاس واپس ضرور آئے گا لیکن وہ پھر کبھی واپس نہ آیا۔ گم سم حور بانو کو اپنی قسمت کے سوا کسی سے شکایت تھی نہ گلہ اور وہ انتظار ہی میں ختم ہو گئی۔

قراقرم کے فرزند



مشرق سے آنے والی عجیب و غریب قوم کے سردار خانِ اعظم نے خوارزم شاہی کو تباہ و برباد کیا۔ میں اپنے چچا رشید الدین خوارزم کے ساتھ دریائے جیحون کے شمالی ساحل پر بخارا سے تقریباً پچھتر میل دور خیمہ زن تھا۔ ہم نے بخارا اور سمرقند کی طرف سے اٹھنے والے دھوئیں کو فضا میں پھیلتے دیکھا اور پھر یہ دھواں اتنا زیادہ اور گہرا ہو گیا کہ اس میں سورج روپوش ہو گیا۔ چند بدحواس لوگ ہماری طرف بھاگتے ہوئے آئے اور ہمیں بتایا کہ "سمرقند اور بخارا میں کچھ نہ رہا۔ دراز قد اور بلی جیسی آنکھوں والے منگول خان نے اپنی وحشی سپاہ کے ذریعے سب کچھ تباہ و برباد کر دیا۔ وہ خوارزمیوں کا دشمن ہے اور انہیں ڈھونڈ کر ہلاک کر رہا ہے!"

تھوڑی دیر بعد ہم لوگ بھی بدحواسوں میں شامل ہو چکے تھے۔ ہم نے دریا کے کنارے کنارے مشرق کا رُخ کیا اور ترمذ سے گزر کر بلخ کی طرف بڑھے جو کابل کی سرحد پر واقع ہے، ہمیں بھی اطمینان نصیب نہ ہوا اور مرو ہوتے ہوئے ہرات پہنچ گئے اور یہاں گمنام بن کر رہنے لگے۔

میرے والدین پہلے ہی انتقال کر چکے تھے، چچا رشید الدین بیٹے کی طرح میری تعلیم و تربیت میں مشغول رہے تھے۔ بخارا میں ہمارا شاندار سرخ پتھروں کا محل تھا۔ ہمیں کچھ پتہ نہ تھا کہ وحشی منگولوں نے میری کلی چچی، چچازاد بہن روشنگلہ اور چچا کے لڑکے داؤد سے کیا سلوک کیا۔ میرے چچا ہر روز صبح شمال کی ان تجارتی راہوں پر چلے جاتے جن پر چین کے تجارتی قافلے کاشغر سے گزر کر سمرقند کی بڑی شاہراہ پر چلتے ہوئے جنوب کی چھوٹی سڑکوں کے شہر ترمذ اور بلخ سے ہو کر مرو ہوتے ہوئے ہرات تک پہنچتے تھے۔ چچا ان سے سمرقند اور بخارا کی تباہی کی تفصیلات معلوم کرتے رہتے تھے، ایک دن انہیں کسی کا خط ملا، جس میں ہمارے دونوں بڑے شہروں کی بربادی کی روداد لکھی ہوئی تھی۔ خدا مجھے معاف کرے، میں نے چوری سے وہ خط حاصل کر کے پڑھ لیا۔ اس میں لکھا تھا:-

"خوارزم شاہی ختم ہو چکی ہے، میں نے ان کی نوکری کر لی ہے، یہ تلے اوپر دو دو لبادے پہننے والے وحشی بڑے چالاک اور خونخوار ہیں ان کا خانِ اعظم بخارا کی جامع مسجد میں اپنے گھوڑے پر سوار داخل ہوا تھا۔ اس کے آدمیوں نے قرآن پاک کے صندوقوں میں رکھ کر اپنے گھوڑوں کو دانہ کھلایا۔ ہمارے علما کو اپنی لہو و لعب کی محفلوں میں بلا کر ناچ گانے پر مجبور کیا۔ ہمارے سپاہیوں کو قتل، جوانوں کو غلام، بوڑھوں کو ہلاک، جوان اور خوبصورت عورتوں کو آپس میں تقسیم کر لیا۔ یہ چمڑے کی زرہ اور

خود پہننے والے لوگ ہر خداوندی ہیں، ان کے خان اعظم نے بخارا کی جامع مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر ہمیں خطاب کیا۔ تم یقین کرو کہ کالے چمڑے کی منقش زرہ اور خود پہنے ہوئے یہ شخص کسی اور ہی دنیا کی مخلوق معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کہا: "تمہارے بادشاہ محمد خوارزم شاہ نے میرے اُن سوداگروں کو جو مسلمان تھے۔ اور دونوں حکومتوں کے درمیان تجارتی معاہدوں کی غرض سے آئے تھے، قتل کرا دیا۔ میں جاودانی آسمان کا قہر ہوں، تمہارا وہ خدا جس کا مکے میں گھر ہے اس بات پر ناراض ہوگیا ہے کہ تمہارے بادشاہ نے میرے چند مسلمان ملازموں کو قتل کرا دیا ہے، میں آسمان کی ضرب ہوں اور یہاں اس لئے آیا ہوں کہ تمہارے بادشاہ کو تباہ و برباد کر دوں، اسی طرح جس طرح میں نے اور بادشاہوں کو کچلا ہے۔" دوست یہ بڑا بھیانک منظر تھا کہ ہر طرف سے مردوں، عورتوں اور بچوں کے نالہ و بکا کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ انہیں نہایت بے دردی سے ایک دوسرے سے چھڑایا جا رہا تھا۔ ان وحشیوں نے عورتوں کی، ان کے قریبی رشتے داروں کے سامنے آبرو ریزی کی بعض غیرت مند مغلوں پر جھپٹ پڑے لیکن قتل کر دیئے گئے۔ یہ لوگ مساجد اور محلات میں سنجیدگی سے بیٹھ کر شراب نوشی اور عیاشی میں مشغول ہو جاتے، ساری روداد چند لفظوں میں یوں لکھی جا سکتی ہے "آمدند و کندند و سوختند، کشتند و بردند و رفتند" یعنی وہ آئے، تباہ کیا جلایا، مارا، لوٹا اور چلے گئے۔

انہوں نے کاریگروں اور ہنر مندوں کو پکڑ کر اپنے وطن بھیج دیا۔ مضبوط نوجوان جنہیں کوئی ہنر نہ آتا تھا اور سپاہی بھی نہیں تھے۔ انہیں مشقت کے کاموں کے لئے غلام بنا لیا۔ تمہارے بیوی بچوں کا کچھ پتہ نہ چلا کہ اُن کا کیا حشر ہوا۔ مجھے خانِ اعظم نے نوکری دے دی ہے، میں قراقرم جا رہا ہوں، قراقرم جو کالی ریت کی زمین ہے۔ خانِ اعظم کا خیال ہے کہ میں پڑھا لکھا عقلمند آدمی ہوں، وہ مجھ سے بہت ساری جغرافائی اور دوسری معلومات حاصل کرے گا۔ میں جا رہا ہوں لیکن نہیں جانتا کہ کب تک زندہ رہوں گا۔"

خط پڑھ کر میں لرز گیا۔ اُس رات مجھے نیند نہیں آئی۔ چچا بھی جاڑوں کی شاموں والی

قندیل کے سامنے بیٹھے آنسو بہاتے رہے۔ خاندان، مستقبل اور امید دل کے خون نے انہیں اتنا ہراساں اور خوفزدہ کر دیا کہ اس کے بعد وہ چند ہی ماہ زندہ رہے اور مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ حکومت سے مجھے نفرت ہو گئی چچا نے جو کچھ چھوڑا تھا۔ اس کو تجارت میں لگا دیا کیونکہ میں نے خوب اچھی طرح یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس خون آشام دور اور خونخوار قوم میں صناع، کاریگر ہنرمند اور تاجر اپنی زندگی کی امید کر سکتے تھے۔ حکمرانوں اور سپاہیوں کے یہ بدترین دشمن تھے، میں نے اپنی کسی بات، رویئے یا فعل سے یہ ثابت نہ ہونے دیا کہ میں خوارزم کے شاہی خاندان کا ایک فرد ہوں، میرا یہ ارادہ بھی تھا کہ میں تاجر بن کر کالی ریت کی سرزمین قراقرم جاؤں گا اور وہاں اپنی بچی، روشنک اور داؤد کو تلاش کروں گا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ انہیں ہلاک نہیں کیا گیا ہو گا اور اگر وہ زندہ ہیں تو انہیں قراقرم میں ضرور تلاش کر لوں گا۔ روشنک، مجھ سے بچپن سے منسوب تھی لیکن اب اس رشتے کا میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

بظاہر میرا کوئی مستقبل نہ تھا پہلے تو میں فارس کی حدود ہی میں تجارت کرتا رہا، ہرات کے کپڑے، نیشاپور اور بسطام کی طرف لے جاتا اور انہیں فروخت کر کے وہاں کی چیزیں ہرات میں لا کر بیچ دیتا۔ اس درمیان ہرات کے ایک بہت بڑے کاروباری، احمد سے میرے تعلقات استوار ہو گئے۔ اس کا تجارتی مال دور دور جایا کرتا تھا، وہ خود ہرات ہی میں رہتا لیکن اس کے آدمی بدخشاں اور کاشغر سے گزر کر چین سے ہوتے ہوتے قراقرم تک چلے جاتے اور وہاں تجارتی اشیا انتہائی گراں قیمتوں میں فروخت کر کے واپس آ جاتے، قراقرم اور منگولوں کے لئے میرے ذہن میں جو خاکہ تھا وہ نہایت مبہم اور پریشان کن تھا۔ میں سوچتا ان وحشیوں اور ڈاکوؤں سے آخر تجارت کس طرح کی جاتی ہو گی لیکن واپس آنے والے تاجر بحیثیت دیانت دار خریدار ان کی بڑی تعریفیں کرتے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ منگول ان کے سامان کی توقع سے کہیں زیادہ قیمتیں ادا کرتے ہیں، قراقرم جانے کی ہلکی سی تحریک ہوئی جو رفتہ رفتہ اتنی بڑھی کہ میں نے اپنی اس خواہش کا احمد پر اظہار کر دیا۔ احمد کا خیال تھا کہ میرا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں کیونکہ میں خوارزم شاہی خاندان کا فرد تھا، اور منگول ان کے سخت دشمن تھے ڈر تو مجھے بھی لگتا تھا لیکن میں یہ خطرہ بعض وجوہ سے لینے پر آمادہ تھا۔ احمد نے جب مجھے قراقرم جانے پر بضد دیکھا تو بمجبور آجانے کی اجازت دے دی، لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ میں اپنے خاندان کا راز ہر قیمت پر راز ہی رکھوں۔

احمد کے کاروباری عملے میں عباس نامی اٹھائیس تیس سالہ ایک جوان کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی یہ احمد کا ہونے والا داماد تھا، احمد کی لڑکی فرزانہ ابھی بارہ سال کی تھی،

عباس کو ابھی اس کا چار پانچ سال اور انتظار کرنا تھا۔ احمد نے مجھے عباس کے حوالے کر دیا کہ اپنے ساتھ قراقرم لے جاؤ اور تجارتی امور میں رہنمائی کرو۔

عباس نے بظاہر تو خوش اخلاقی اور خندہ پیشانی سے اپنے ہونے والے سسر کی ہدایات پر عمل پیرا ہونے کا وعدہ کر لیا لیکن اس کے دل میں میرے لئے جذبۂ حسد پیدا ہو گیا احمد کی مجھ جیسے غیر پر نوازشوں کا اس کے نزدیک غالباً ایک ہی سبب تھا۔ فرزانہ کے لئے عباس کی جگہ میرا انتخاب۔ عباس فرزانہ کو چاہتا بھی تھا اور اس کی وجہ اور بھی سے وہ جس بڑے کاروبار اور املاک کا مالک ہونے والا تھا اس نے بھی فرزانہ میں بے پناہ دلکشی اور حسن پیدا کر دیا تھا۔ عباس نے غالباً یہ سوچا کہ وہ میرے مقابلے میں زیادہ عمر رسیدہ ہے اور شاید میں نوعمری کی وجہ سے فرزانہ کے لئے زیادہ مناسب تھا۔

قالین، مخمل، چادریں، نمدے اور خیش کے علاوہ دمشق کے مشہور باریک کپڑے دشی اور شربت کے بہت سارے تھان بھی بار کر لیے، ان میں خیش کو خاص حیثیت حاصل تھی یہ گرم اور خشک علاقوں کے لیے نعمت سے کم نہ تھا۔ لوگ اس کے پردوں کو کھڑکیوں اور دروازوں پر ڈال کر پانی سے تر کرتے رہتے تھے، جب گرم ہوائیں ان سے ٹکرا کر اندر داخل ہوتیں تو خیش کی نمی انہیں خنک کر دیتی اور اندر کی فضا بڑی خوشگوار اور جانفزا ہو جاتی۔ لوگ شراب اور پانی کی صراحیوں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے انہیں خیش میں لپیٹ کر پانی سے تر کر دیتے اور برف کا مزہ اٹھاتے۔ قراقرم میں اس کپڑے کی بڑی مانگ تھی، ان کے علاوہ احمد نے ایک خاص کپڑا بھی مجھے دیا تھا اس کپڑے پر بنائی میں ارغوانی زمین پر، اونٹ پر حملہ آور شیر کو زرد رنگ میں دکھایا گیا تھا احمد نے مجھ سے کہا تھا کہ میں یہ کپڑا مغلوں کے خاقان اعظم کو تحفۃً پیش کر دوں، جس کا یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ خاقان اعظم مجھ پر دوسروں سے زیادہ مہربان ہو جائے گا۔

اونٹوں اور خچروں پر سامان بار کر کے، ایک تجارتی قافلے کے ساتھ ہم قراقرم کے لئے روانہ ہو گئے۔

راستے بھر عباس سرد مہری سے پیش آتا رہا۔ کچھ دنوں تو میں اس کی خفگی اور کدورت گوارا کرتا رہا لیکن ہم جیسے جیسے اپنی علاقائی حدود سے گزر کر چینی حدود میں داخل ہوتے گئے عباس کی رنجشیں اور کدورتیں کھل کر میرے سامنے آتی گئیں، یہاں تک کہ جب ہم چغتائیوں کی حدودِ مملکت میں داخل ہوتے تو عباس نے مجھ سے کھل کر کہا۔ "جناب! ایک بات بطورِ خاص ذہن نشین رہے، اس کے یاد رکھنے میں دونوں ہی کا فائدہ ہے!"

میں بالکل خالی الذہن تھا۔ کسی تشویش کے بغیر دریافت کیا۔ "کون سی بات؟"

عباس کی پیشانی پر ہلکی ہلکی، موہوم سی تین سلوٹیں پڑ گئیں، بولا۔ "پہلے ایک بات بتاؤ اس کے بعد کوئی بات ہو گی۔"

"پوچھو!"

"احمد نے تم سے کوئی وعدہ تو نہیں کیا ہے؟" اس نے احمد کا نام اس طرح لیا گویا برابر کا دوست ہے۔

"نہیں، مجھ سے کوئی وعدہ نہیں کیا!" میں نے جواب دیا۔

عباس نے مزید ٹٹولا۔ "تم گھبراؤ نہیں، میں فرزانہ کی بابت کچھ جاننا چاہتا ہوں!" اس کے بعد، کچھ دیر چپ رہ کر بولا۔ "وہ میرے لئے ہے، چار پانچ سال بعد وہ میری ہو جائے گی، لیکن ۔۔ اگر خدانخواستہ درمیان میں تم آ گئے یا لائے گئے تو اس کا نتیجہ بہت برا نکلے گا، بس اس کا خیال رکھنا۔"

میں نے بدستور لاپروائی سے جواب دیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں، بے فکر رہو!"

عباس نے ترشی سے کہا۔ "بے فکر کس طرح رہوں، اب کہتے ہو تو بے فکر رہ لوں گا لیکن دل پر بوجھ بدستور رہے گا۔"

جب میں نے اسے سمجھایا کہ اس نے جو کچھ سوچا ہے سراسر غلط ہے، تب وہ کسی قدر ہوش و حواس میں مجھ سے قریب آیا۔ پھر بھی دھمکی دیتا ہوا بولا۔ "میرے خلاف جانے یا زبان کھولنے سے پہلے اپنی ماں سے دودھ اور دوستوں سے کہا سنا ضرور معاف کرا لینا۔ یہ مت بھولنا کہ تم سلطان محمد خوارزم شاہ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہو، جو منگولوں کا معتوب خاندان ہے، اگر انہیں تمہاری بابت یہ سب کچھ معلوم ہو جائے تو تم خود ہی سوچ لو کہ تمہارا کیا حشر ہو گا۔"

عباس یہاں تک پہنچ چکا ہے مجھے معلوم نہ تھا۔ بظاہر تو میں نے اپنی زبان بند رکھی لیکن میرے اندر ہی اندر اس کے خلاف نفرت اور حقارت کا لاوا پھوٹتا رہا۔ میں صرف اتنا ہی کہہ سکا کہ "میری ماں کا عرصہ ہوا انتقال ہو چکا اس لئے اس سے دودھ معاف کرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن میں موت سے بھی نہیں ڈرتا۔ میں کس طرح تمہارے خلاف جا سکتا ہوں یا کسی معاملے میں تمہارے خلاف زبان کھول سکتا ہوں، یہ باتیں میری سمجھ سے بعید ہیں!"

عباس مجھے ناگواری اور نفرت سے گھورتا رہا۔

میں نے سنا تھا کہ منگولوں کے دارالخلافے میں جملہ بڑے مذاہب کے لوگ آباد ہیں اور انہیں اپنے معاملاتِ مذہبی اور ذاتی میں، اس حد تک آزادی ضرور حاصل ہے کہ وہ یہاں کے مجموعۂ قوانین "یاسا" کے پابند رہ کر آباد رہیں، یاسا جسے خانِ اعظم چنگیز خان نے منگولوں کے لئے وضع اور رائج کیا تھا۔ مجھے عباس کی باتوں سے سخت دکھ پہنچا تھا میں نے دورانِ سفر ہی یہ جذباتی فیصلہ کر لیا کہ قراقرم پہنچ کر اس کا ساتھ چھوڑ دوں گا اور وہیں آباد ہو جانے کی کوشش کروں گا۔

قراقرم تک پہنچتے پہنچتے گنجان آبادیاں پیچھے رہ گئیں اور ہم مسطح میدانوں سے گزرنے لگے جہاں اونچے اونچے درختوں کا دور دور پتہ نہ تھا۔ کہیں کہیں املی کے درخت ضرور نظر آ جاتے تھے۔

جن کی شاخیں اتنی چیمڑ ہوتی ہیں کہ پتلی سے پتلی شاخ کا توڑنا تک محال ہوتا ہے، جب ہمیں اپنی شاہراہ کے آس پاس میدانوں میں اگی ہوئی جھاڑیوں اور ریگستانی پودوں میں چرتے ہوئے مویشیوں کے ریوڑ نظر آنے لگے تو یقین آیا کہ قراقرم اب زیادہ دور نہیں ہے، پھر کئی دن بعد منگول یورتوں (خیموں) کی سیاہ سموروں والی چھتیں بھی نظر آنے لگیں، یہ یورت حدِ نظر تک مغرب سے مشرق میں پھیلے ہوئے تھے، حالانکہ منگول اگر چاہتے تو یہاں عالیشان عمارتیں تعمیر کرا سکتے تھے کیونکہ اب انہیں دولت کی کوئی کمی نہ تھی، گوبی کے جنوب مشرق میں چین سے لے کر سمرقند و بخارا تک ان کی حکومت تھی، اور دنیا کے عظیم الشان اور گراں بار خزانے ان کے قبضے میں جا چکے تھے لیکن ان کے خانِ اعظم چنگیز خان نے انہیں ہدایت کی تھی کہ دنیا پر حکومت کرنے والوں کو عالیشان محلات میں نہیں رہنا چاہیئے کیونکہ پختہ چہار دیواریوں میں رہنے والے آرام طلب، تن آسان، رحم دل، کام چور اور بزدل ہو جاتے ہیں، چنگیز کے خیال میں خانہ بدوش، خیمہ نشین اقوام ہی دنیا پر حکومت کرنے کی اہل ہوتی ہیں، یورتوں کی سیاہ چھتوں پر جیسے ہی میری نظر پڑی میرا دل دھک دھک کرنے لگا کیونکہ ایشیا کی عظیم الشان سلطنتیں زیر و زبر کرنے والوں کے خان کا شہر اب کچھ زیادہ دور نہ تھا۔

یہیں ہمیں یہ بات معلوم ہوئی کہ چنگیز خان کا انتقال ہو چکا ہے اور اس کی جگہ چنگیز کا منجھلا بیٹا اوغدائی خاقانِ اعظم منتخب ہو چکا ہے خاقان کے معینہ افسروں نے ہمارے قافلے کی پذیرائی کی اور اس کے آدمیوں نے اپنی نگرانی میں ہمیں سفیروں کے محلے میں پہنچا دیا۔ جہاں چند دن آرام کر کے ہمیں اشیائے تجارت کی فہرست اوغدائی کو پیش کرنی تھی، عباس کا رویہ برا معاندانہ تھا۔ اس نے ہر چیز اپنے اختیار میں لے لی اور اس کے سامنے میری حیثیت ایک ملازم سے زیادہ نہیں رہ گئی۔

جہاں ہیں ٹھیرا تھا، قریب ہی بودھوں کے پجاریوں کی بستی تھی، ایک طرف پتھروں کی بدوضع اور بے ڈھنگی مسجد بنی ہوئی تھی، اس سے ذرا آگے بدھ مت کا مندر تھا اور مندر سے کچھ دور نسطوری عیسائیوں کے چھوٹے چھوٹے لکڑی کے بنے ہوئے کئی گرجے تھے۔ جن کے چھوٹے چھوٹے میناروں پر صلیب کی شکلیں بنی ہوئی تھیں، وہیں مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ یہ نسطوری حضرات حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے۔ یہ ان کی الوہیت کے تو ضرور قائل ہیں لیکن مسیح کو خدا کا بیٹا ماننے پر تیار نہیں، شاید یہ اپنے عقیدے کی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ سے پہلے کچھ لوگوں نے حضرت داؤدؑ کو فرطِ عقیدت میں خدا کا باپ کہنا شروع کر دیا تھا یہ کہتے تھے کہ نہ داؤدؑ خدا کے باپ تھے اور نہ مسیحؑ خدا کے بیٹے۔ نسطوریوں کا یہاں بڑا اثر تھا، اوغدائی کی بیوی تورا کینہ بھی نسطوری عقائد رکھتی تھی۔

اس عظیم اور دہشت ناک شہر میں اپنی چچی، روشنک اور داؤد کو تلاش کرنا بہت

دشوار کام تھا۔ میری ہمت جواب دے گئی۔ دوسرے یہ کہ اس وقت تک بخارا کی تباہی کو تقریباً سات آٹھ سال گزر چکے تھے اور مجھے اور روشنک تقسیم میں معلوم نہیں کس کے حصے میں گئی ہوں۔

عباس، سامان کی فہرست تیار کرنے لگا اور مجھے حکم دیا کہ میں عضوِ معطل کی طرح گھر ہی میں پڑا رہوں، خاقان کے دربار میں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن میں نے اس کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا اور اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ سامانِ تجارت میں میرا سرمایہ بھی لگا ہوا ہے اور میں اپنے مالکانہ حق سے کسی طرح بھی دستبردار نہ ہوں گا۔ عباس نے میری جرأت اور ضد پر حیرت سے مجھے دیکھا اور زہرخند کرتے ہوئے غیر جذباتی لہجے میں بولا۔

"تب پھر مجھے خاقانِ اعظم کے روبرو تمہارا تعارف بھی کرانا پڑے گا؟ کیوں کیا خیال ہے؟"

میں نے بے خوف و بے جھجک صاف صاف کہہ دیا۔ "شکریہ تم تعارف کرا سکتے ہو۔ میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن یہ یاد رہے کہ تم بھی میرے چچازاد بھائی ہو، اگر میں مروں گا تو تمہیں ساتھ لے کر مروں گا۔"

عباس گھبرا گیا۔ "لیکن میں تمہارا چچازاد بھائی تو نہیں ہوں!!"

"نہ ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے!" میں نے کہا۔ "تم میری بات کی تردید میں ثبوت پیش کرتے رہنا لیکن مجھے معلوم ہے کہ یہ منگول مشتبہ معاملات میں زیادہ چھان بین کے قائل نہیں ہیں، مقدمات کے فیصلے فوراً کر دیا کرتے ہیں۔"

عباس ہمت ہار گیا۔ نرم اور خوفزدہ لہجے میں پوچھا۔ "لیکن تم اوغدائی سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

اب میں نے لطف لیتے ہوئے کہا۔ "جیسا کہ تم جانتے ہو کہ میرا کوئی مستقبل نہیں، کوئی خاندان نہیں، میں تو ہرات ہی سے یہ طے کر کے چلا ہوں کہ مغلوں کے خاندان کو اپنی اصل حیثیت سے آگاہ کر کے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے بھی قتل کر دیں۔"

عباس کے سارے کس بل نکل گئے۔ بالکل نرم پڑ گیا۔ بولا۔ "تو تم اپنے ساتھ خواہ مخواہ ہمیں کیوں ملوث کر دگے؟"

"اس لئے کہ تم میرے لئے کنواں کھودنے جا رہے ہو!"

عباس نے کہا۔ "لیکن میں نے جو کچھ کہا تھا کیا تم نے اس کا سنجیدگی سے اثر قبول کیا ہے؟"

"میں مذاق کرنے کا عادی نہیں ہوں!"

عباس کا تو حال ہی بہت برا تھا۔ کہنے لگا۔ "اچھا بھائی! یہ بدبس ہے، ہم اپنے

وطن سے ہزاروں میل دور پڑے ہیں، یہاں ہمیں یہ عہد کرنا چاہیئے کہ مِل جُل کر رہیں گے اور اپنی اپنی جانیں یہاں سے صحیح سلامت لے کر جائیں گے!"

میں نے جواب دیا۔" میری طبیعت میں شر بالکل نہیں ہے، اس وقت ہمیں اتحاد اور ایکے کی ضرورت ہے لیکن تم لوگ کچھ اس کے برعکس منصوبے بنا چکے ہو تو اس کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔"

بالآخر ہم دونوں میں یہ طے پایا کہ دونوں ایک ساتھ اوغدائی کے یورت میں جائیں گے، دونوں ہی اپنی اپنی زبانیں بند رکھیں، اشیائے تجارت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا' ایک کی فہرست عباس پیش کرے گا۔ دوسرے کی میں، یہاں ایک بار پھر عباس نے اپنی اس بدگمانی کا اظہار کیا کہ اسے ڈر ہے کہ اس کے ہونے والے سسر نے اس کی جگہ کہیں میرا انتخاب تو نہیں کر لیا ہے۔ میں نے اسے یقین دلاتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا کہ" میں حریص نہیں ہوں اور اب شاید یہاں سے واپس بھی نہ جاؤں!"

اس نے حیرت سے پوچھا۔" یہاں رہ کر کیا کرو گے؟"

میں نے جواب دیا۔" اوغدائی کی نوکری!"

اس نے بظاہر اداس اور مایوس لہجے میں کہا۔" لیکن تمہیں ہمارے ساتھ واپس چلنا چاہیئے یہاں تمہارے لئے ہر وقت خطرہ رہے گا۔" لیکن میں جانتا تھا کہ عباس دل سے یہی چاہتا ہے کہ میں قراقرم ہی میں رہ جاؤں۔

ہم لوگ آگ کے الاؤ کے بیچ سے گزرتے ہوئے اوغدائی کے یورت کے قریب پہنچ گئے۔ ان وحشیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ آنے والوں پر اگر سحر کا اثر ہوگا تو آگ کے الاؤ کے بیچ سے گزرنے کے دوران وہ زائل ہو جاتے گا۔

ہمیں کچھ دیر خاقان کے استقبالیہ یورت میں رکنا پڑا۔ یہاں پھلوں شرابوں اور گھوڑی کے دودھ کا وافر ذخیرہ مہیا تھا اور آنے والوں کو اس کی اجازت تھی کہ جو چاہیں کھائیں پیئیں۔ لیکن کسی نے بھی کھایا پیا کچھ بھی نہیں۔

خاقانِ اعظم کا یورت لکڑی کے ڈھانچے پر سموروں کو منڈھ کر تیار کیا گیا تھا۔ اس کا دروازہ جنوب کی سمت تھا۔ ہم اس سے اندر داخل ہوئے، وہاں ہمارے آس پاس لکڑی کی چوکیوں پر ترخان، تومان باشی، دستوں کے سردار اور شامان (طبیب، جادوگر اور پجاری) بڑے بڑے بالوں کی دو دو چوٹیاں گوندھے سروں پر ٹوپ اوڑھے اور چمڑے کا پاجامہ پہنے بیٹھے ہوئے تھے، ہمارے داخل ہوتے ہی ان کی حریص نظریں ہماری طرف اٹھنے لگیں، ہم لوگ اوغدائی کے قریب پہنچ کر دو زانو ہو گئے۔ وہ ایک اونچی چوکی پر قیمتی نمدہ بچھائے، اس پر براجمان تھا۔

ہم نے اپنی فہرست یہ کہہ کر خاقان کے روبرو رکھ دی کہ یہ سارا سامان اس کی خدمت میں بطورِ تحفہ پیش ہے۔ اوغدائی نے فہرست ہمارے سامنے رکھ دی اور اس میں سے کچھ چیزوں کے لیے یہ حکم دیا کہ انہیں اس کی خدمت میں پہنچا دیا جائے، وہ ان کی قیمتیں ادا کرے گا۔ میں نے اس موقع پر خاقان کو ایک ایسا پردہ تحفے میں پیش کیا جس پر مینا کاری میں ہی شکار کا منظر پیش کیا گیا تھا۔ ارغوانی زمین میں، نیلے رنگ کے شیر کو ہرے بھرے سبزہ زار پر مٹیالے زردی مائل اونٹ پر حملہ آور دکھایا گیا تھا۔ اوغدائی بہت خوش ہوا اور اس کے بائیں طرف بیٹھی ہوئی توراکینہ تو بہت زیادہ محظوظ ہوئی۔ اس نے اس پردے کے صلے میں بہت سارا سونا عطا کیا۔

ہم نے خاقان کو اس کا مطلوبہ سامان پہنچا کر بڑی دولت کمائی۔ اب جو سامان بچ رہا تھا اسے منگول آبادی میں فروخت کرنا تھا۔

میں فجر کی نماز پڑھنے کے بعد لیٹ گیا اور میری آنکھ لگ گئی لیکن کسی کے زور زور سے باتیں کرنے سے میری آنکھ کھل گئی، نیم خوابیدگی میں جو کچھ دیکھا۔ دھندلا دھندلا خواب کی طرح نظر آیا۔ ایک پینتیس چھتیس سالہ دبلا پتلا آدمی، سترہ اٹھارہ سالہ حسین ترین لڑکی کے ساتھ کھڑا عباس سے الجھا ہوا تھا۔ نیند کا نشہ جلد ہی ہرن ہو گیا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا' آدمی کی نظریں مجھ پر ہی گڑی ہوئی تھیں' مجھے اٹھتا ہوا دیکھ کر، مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا اس کے ساتھ ہی لڑکی بھی میرے پاس آگئی۔ میں نے پہلی ہی نظر میں دونوں کے بارے میں یہ سمجھ لیا کہ لڑکی تو اپنی ہی طرف کی ہے اور مرد منگول' جو غالباً کثرتِ شراب نوشی اور عیاشی کی وجہ سے ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گیا ہے۔

میں نے لڑکی کو جو غور سے دیکھا تو دنگ رہ گیا اس کے اعضا میں غضب کا تناسب تھا۔ بیضوی چہرے پر سرخ و سفید رخساروں کے داہنی جانب، ناک اور ہونٹ کے مابین ترچھی لکیر پر سیاہ تل، ٹھوڑی میں چاہ زنخداں' چہرے پر ملاحت اور صباحت ایسی' جیسے سرخ شراب کے اوپر مینے کی شفاف باریک تہہ چڑھا دی گئی ہو۔ ان دونوں کے ساتھ ہی عباس بھی آ گیا' منگول کو یہ بات بہت بری لگی' اس نے اپنی زبان میں معلوم نہیں کیا کہا لیکن چہرے کا اتار چڑھاؤ اس کی خفگی کا پتہ دیتا تھا۔

اچانک لڑکی بول اٹھی' اس نے عباس سے نرمی آمیز فارسی میں کہا۔ "تم یہاں مت آؤ، میرے ساتھی منگول کو تم سے نفرت ہو گئی ہے' یہ کہتا ہے کہ اگر تم تاجر نہ ہوتے اور خاقان نے تمہیں امان نہ دی ہوتی تو یہ تمہیں قتل کر دیتا۔"

عباس بھی ایک ڈھیٹ تھا' نہایت متانت سے دریافت کیا۔ "لیکن میرا قصور؟"
لڑکی نے جواب دیا۔ "یہ تم سے (میری طرف اشارہ کر کے) اس کا پتہ پوچھ رہا تھا اور

تم نے پتہ بتانے کے بجائے ہمیں اپنی باتوں میں الجھائے رکھنے کی کوشش کی۔"

مجھے لڑکی کی زبان سے یہ تو معلوم ہی ہو گیا کہ وہ واقعی ہماری ہی طرف سے تعلق رکھتی ہے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے لڑکی سے دریافت کیا۔ "کیا تمہارا ساتھی بھی تمہاری یہ زبان جانتا ہے؟"

"نہیں!" لڑکی نے جواب دیا۔ "اگر جانتا ہوتا تو میرے بجائے تم سے یہ خود بات کر رہا ہوتا۔"

منگول نے لڑکی سے کچھ کہا اور لڑکی نے اسی کی زبان میں کوئی جواب دیا۔ "اس کے بعد عباس سے بولی۔ "تم یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ بڑے ضدی اور سرکش لوگ ہیں، تمہیں کوئی بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

عباس خوفزدہ ہو کر چلا گیا۔ اس کے ہٹتے ہی منگول خوش ہو گیا۔

بعد میں پتہ چلا کہ یہ منگول ہمارا خریدار تھا اور جب ہم خاقان کے یورت میں گئے تھے تو یہ بھی وہیں موجود تھا، یہ میرے شکار گاہ والے تحفے سے بہت متاثر ہوا تھا اور اب اپنی اترازی محبوبہ کے ساتھ کچھ خریدنے کی نیت سے آیا تھا، یہ اترار سمرقند کے شمال مشرق میں ایک مضبوط قلعہ تھا اور یہ لڑکی اسی قلعے دار کی بیٹی تھی، جو منگولوں کی تسخیر قلعہ کے بعد اس تومان باشی کے حصے میں آئی تھی یہ تقریباً چار سال سے یہیں رہ رہی تھی، اس عرصے میں اس نے منگولوں کی زبان تو سیکھ لی تھی، لیکن منگول اس کی زبان نہیں سیکھ سکا تھا۔

لڑکی کا حسن اور قراقرم جیسی بیگانوں کی بستی میں ایک ہم قوم کا مل جانا میرے لئے عید کے چاند سے کم نہ تھا۔ میں نے ان کی خواہش پر باریک کپڑوں کے تھان اور جنس کے ٹکڑے سامنے ڈھیر کر دیئے۔ لڑکی نے کئی تھان لے لئے اور منگول نے جینس کو بہت پسند کیا۔ میں طبعاً تاجر نہ تھا۔ میں نے چاہا کہ ایک تھان لڑکی کو تحفے میں دے کر بقیہ کی قیمتیں نفع کے بغیر ہی لگا دوں لیکن لڑکی نے ایسا کرنے سے منع کیا اس نے کہا کہ یہ منگول میرے اس جذبے کی ذرا بھی قدر نہ کرے گا، بلکہ اپنے تھانوں کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرو،

منگول ہم دونوں کی باتیں گونگے کی طرح سن رہا تھا اس نے لڑکی سے کچھ پوچھا جس کا جواب دے کر وہ مسکرانے لگی۔ میں نے پوچھا۔ "یہ کیا پوچھ رہا تھا؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "پوچھ رہا تھا ہم دونوں کیا باتیں کر رہے ہیں، میں نے کہہ دیا کہ کپڑوں کا بھاؤ تاؤ کر رہی ہوں۔" اس کے بعد کہنے لگی۔ "یہ لوگ متمدن لوگوں پر کم ہی اعتماد کرتے ہیں، سمجھتے ہیں متمدن لوگ ظاہر و باطن یکساں نہیں رکھتے اور جھوٹ زیادہ بولتے ہیں!"

میں نے اس کے مطلوبہ سامان کی جو قیمت بتائی، لڑکی نے اسے چار سے ضرب دے دیا۔ جب وہ سامان لے کر واپس جانے لگی تو میں نے اس کا نام دریافت کیا۔ وہ جواب ٹال گئی کہنے لگی۔ "نام مت پوچھو کیونکہ جیسے ہی میں اپنا نام لوں گی یہ وحشی فوراً سمجھ جائے گا کہ میں تم سے ذاتی نوعیت کی باتیں کر رہی ہوں۔"

میں چپ ہو رہا۔ وہ سامان لے کر چلی گئی اور میں دل میں یہ سوچتا رہ گیا کہ دیکھو پھر کبھی ملاقات ہوتی ہے یا نہیں۔

ان کے جاتے ہی عباس آیا اور مجھ پر گرم ہونے لگا کہ۔ جب اس کی تذلیل ہو رہی تھی تو میں نے ان دونوں سے یہ کیوں نہ کہہ دیا تھا کہ جملہ سامان تجارت کا اصل مالک عباس ہے اور اسی سے انہیں بات کرنی چاہیئے۔

میں نے جواب دیا کہ "اصل مقصد تو مال بیچنا ہے، تم بیچو یا میں بیچوں!"

عباس نے کہا۔ "میں ان سے اس قیمت سے کہیں زیادہ وصول کرتا۔ ہم نے ہزاروں میل کا سفر سیر و تفریح کے لئے نہیں کیا۔ ہم کمانے آئے ہیں اور مجھے افسوس ہے کہ تم اچھے تاجر نہیں ہو!"

میں اس سے الجھنا نہیں چاہتا تھا، خاموش ہو رہا لیکن اس کی چڑھی ہوئی تیوریوں اور سکڑے ہوئے ہونٹوں سے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ وہ آج کے ناخوشگوار واقعے سے بہت دل برداشتہ ہے۔

مجھے عباس پر ذرا بھی اعتبار نہ تھا۔ اس کے پاس منگول خریداروں کا تانتا لگا رہتا وہ انہیں خوب لوٹ رہا تھا اور ماوراء النہر اور خوارزم کے مترجمین کی مدد سے منگولوں سے خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہتا۔ اس نے مجھے بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ میں نے چند مقامی مسلمانوں سے تعلقات بڑھائے اور ان سے خواہش کی کہ میں قراقرم کی پوری آبادی میں گھوم پھر کر دیکھنا چاہتا ہوں لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے مجھے روکا کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ میرے گھومنے پھرنے کا منگول یہ مطلب لیں گے کہ میں تاجر کے روپ میں کسی مسلم ملک کا جاسوس ہوں جو قراقرم میں جاسوسی کرنے آیا ہے اور منگولوں کے پاس، جاسوسی کی سزا قتل ہے، یہاں مجھ سے ایک ایسی غلطی سرزد ہو گئی کہ اگر وہ زیادہ پھیل جاتی، تو میں خود اپنی ہی غلطی کا شکار ہو کر قتل ہو جاتا۔ جب مجھے قراقرم میں بلاوجہ گھومنے پھرنے سے روکا گیا، تو میں نے غلطی سے یہ پوچھ لیا کہ یہاں سمرقند اور بخارا کے مفتوح کہاں رہتے ہیں، اور اس سے بھی زیادہ سنگین میرا یہ سوال تھا کہ سمرقند اور بخارا کے امراء اور حکمرانوں کی خواتین تقسیم میں کس کس کے حصے میں آئی ہیں؟

میں نے جس مسلمان سے یہ سوال کیا تھا، وہ جواب دینے کے بجائے تشویش سے میری صورت دیکھنے لگا۔ اس نے کچھ تامل کے بعد پوچھا۔ "تم کہاں سے آتے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "ہرات سے!"

اس نے پوچھا۔ "پھر تمہیں سمرقند اور بخارا کے امرا اور حکمرانوں کی خواتین کی تفصیلات کیوں مطلوب ہیں؟" پھر نیا سوال کیا۔ "کیا تم جدی تاجر ہو؟"

میں نے جھوٹ بول دیا۔ "ہاں، میں جدی تاجر ہوں اور اگر یقین نہ ہو تو میرے چچازاد بھائی عباس سے پوچھ لو۔"

اس شخص نے اور زیادہ حیرت کا اظہار کیا۔ "چچازاد بھائی؟ لیکن وہ تو تمہیں اپنا نوکر بتاتا ہے!"

مجھے اندازہ ہو گیا کہ عباس میری لاعلمی اور غیاب میں میری کاٹ کر رہا ہے، میں نے لاپروائی سے کہا۔ "عباس میرے چچا کا لڑکا ہے وہ مجھ سے بڑا ہے، اور چھوٹا بھائی اپنے بڑے بھائی کا بھائی کے علاوہ نوکر بھی تو ہوتا ہے!"

وہ شخص چلا گیا لیکن اس کے جانے کا انداز بتاتا تھا کہ وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا ہے۔

دوسرے دن تک میری مشتبہ ذات خاصی شہرت پا چکی تھی، مجھ سے قراقرم کے کئی مقامی مسلمانوں نے کرید کرید کر یہ جاننا چاہا کہ میں تاجر کے علاوہ حقیقت میں کیا ہوں، میں انہیں یہی جواب دیتا رہا کہ میں صرف تاجر ہوں، اس کے سوا کچھ بھی نہیں، لیکن مجھے رہ رہ کر عباس پر بڑا غصہ آ رہا تھا، یہ کمبخت یوں چپ سادھے ہوئے تھا گویا کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میں یہاں تک مشتبہ اور اچھوت قرار پایا کہ لوگ مجھ سے کترانے لگے، یہاں تک کہ جب میں مسجد میں نماز پڑھنے جاتا تو لوگ مجھ سے دور دور رہتے اور مجھے دیکھ دیکھ کر آپس میں اشارے بازیاں کرتے رہتے، یہ سب میرے لئے سخت ناقابلِ برداشت تھا۔ میں دوپہر کے کھانے کے بعد عباس سے الجھ گیا اور اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اندرا: ، خلاف جو سازش کر رہا ہے، میں اس سے لاعلم نہیں ہوں اگر میں کسی مصیبت میں مبتلا ہوا تو اپنے ساتھ اسے بھی پھنسا دوں گا کیونکہ وہ میرا چچازاد بھائی ہے۔

عباس ہنس پڑا۔ وہ میری دھمکی سے ذرا بھی مرعوب نہ ہوا۔ نہایت اطمینان سے بولا۔ "تمہیں اختیار ہے جو چاہو کہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم خوارزم شاہی خاندان کے ایک فرد ہو اور میں تمہارا کوئی بھی نہیں، محض ایک تاجر ہوں اور میری اس بات کے وہ سینکڑوں تاجر گواہ ہیں جو میرے ساتھ آتے ہیں یا آتے رہے ہیں، اور ان میں سے ایک بھی تمہیں ایک جدی تاجر کی

حیثیت سے نہیں جانتا۔"

میں اس کے اطمینان سے بھی یہ بات نہ سمجھ سکا کہ وہ اپنا کام ختم کر چکا ہے اور میں کسی طرح بھی اپنے اس جھوٹ کو سچ نہ ثابت کر سکوں گا کہ عباس میرے چچا کا لڑکا ہے۔

عباس نے کہا۔ "یہاں سب کے سبھی لوگ جانتے ہیں کہ سمرقند اور بخارا کے مفتوح امرا اور شاہی خاندانوں کی خواتین کے لئے میرے دل میں ذرا بھی جذبہ تجسس نہیں ہے لیکن تم ان کی جستجو اور تلاش میں ہر وقت بہت پریشان اور کھوئے کھوئے رہتے ہو۔"

بظاہر میں مات کھا چکا تھا۔ عباس نے یہ کہہ کر مجھے اور زیادہ خوف زدہ کر دیا کہ "خاقان کی طرف سے عنقریب بلاوا آنے والا ہے، اور وہ میرے سلسلے میں بہت سخت باز پرس کرنے والا ہے۔"

مجھے یقین ہو گیا کہ اب میرا جھوٹ، میرا ساتھ نہ دے سکے گا۔ اور میں شاید اب منگولوں کے ہاتھوں قتل کیا جانے والا ہوں

ایک زرکار چھکڑا میرے دروازے پر آکر رکا، اس کے مخملیں، نیلے سائبان کے کناروں سے مختلف رنگوں کی جھالریں لٹک رہی تھیں اور اس کے آگے دو گھوڑے جتے ہوئے تھے، اس کی آواز سن کر ہم دونوں ہی دروازے سے باہر آگئے۔ عباس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، جب اس میں سے دو منگول کودے اور خمیدہ تلواریں کمر سے لٹکائے ہماری طرف بڑھے تو مجھے یقین ہو گیا کہ خاقان کے دربار میں میری طلبی ہو گئی ہے، ان دونوں نے میرا نام لیا اور اپنی زبان میں کچھ کہا، وہ غالباً یہ پوچھ رہے تھے کہ "دونوں میں سے جنید کس کا نام ہے؟" عباس نے میری طرف اشارہ کر دیا۔ ان میں سے ایک نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچ کر چھکڑے کی طرف لے جانے لگا۔ میں کوئی مزاحمت نہ کر سکا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ منگولوں کے نزدیک میری مزاحمت کا مطلب بغاوت لیا جاتا اور یہ میرا بدترین سنگین جرم قرار دیا جاتا۔

جب میں سہما ہوا چھکڑے پر بیٹھ رہا تھا تو میں نے گویا آخری بار عباس کی طرف دیکھا، اس نے مسکراتے ہوئے اس طرح ہاتھ ہلایا گویا وہ مجھے ہمیشہ کے لئے جدا کر رہا تھا۔

ہمارے بیٹھتے ہی چھکڑے بان نے گھوڑوں کی لگامیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور چھکڑا ہچکولے کھاتا ہوا ایک طرف روانہ ہو گیا۔ ہم معمولی یورتوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے شاندار یورتوں کی بستی میں داخل ہو گئے اور مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں اسی راستے سے خاقان اوغدائی کے یورت تک پہنچا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے خاقان اعظم کا عظیم الشان یورت نظر آنے لگا۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری موت کا فرشتہ چھکڑے پر میرے ساتھ ہی سفر کر رہا ہے لیکن ہمارا

چھکڑا خاقان کے سنہرے یورت سے ذرا آگے جا کر ایک دوسرے شاندار یورت کے سامنے پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں منگول نیچے کود گئے اور ہاتھ پکڑ کر مجھے اتارا۔ وہ مجھے ساتھ لئے ہوئے خیمے میں داخل ہوتے، یہ اندر سے بہت ہی شاندار تھا مجھے ایک چھوٹی سی چوکی پر بٹھا دیا گیا، جس پر قیمتی نمدا بچھا ہوا تھا۔ مجھے شبہ گزرا کہ یہ یورت خاقان کی حوالات ہو گا۔ جس میں مجرموں کو لا کر قید کیا جاتا ہو گا۔ تھوڑی دیر بعد یورت کے اندرونی در کا پردہ ہلا اور اس میں سے وہی پینتیس چھتیس سالہ دبلا پتلا منگول نمودار ہوا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ اس کے پیچھے ہی اترار کی حسین لڑکی آ گئی منگول نے دونوں منگولوں کو چلے جانے کا اشارہ کیا، وہ باہر چلے گئے۔ منگول نے مجھے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور خود بھی اپنی حسین محبوبہ کے ساتھ دوسری چوکی پر میرے سامنے بیٹھ گیا۔

اب میری جان میں جان آئی منگول نے لڑکی سے کچھ کہا۔ لڑکی مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "غالباً تمہارا نام جنید ہے اور میرا جبری شوہر بوتے خان، خاقان اوغدائی خان کا بھتیجا بھی ہے اور تومان باشی (فوجی دستے کا سردار) بھی، مجھے بہت چاہتا ہے۔"

میں نے کچھ بھی نہ کہا، بس چاہتا تھا کہ پہلے میں اپنے بلائے جانے کی تقریب سے آگاہ ہو جاؤں، اس کے بعد کچھ کہوں۔

لڑکی نے مزید کہا۔ "میرے منگول شوہر نے تمہیں بہت پسند کیا ہے، یہ کہتا ہے کہ تم اچھے آدمی معلوم ہوتے ہو لیکن دوسرے متمدن شہریوں کی طرح ذرا جھوٹے آدمی ہو!"

میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "میں جھوٹا آدمی نہیں ہوں، منگول سردار کو میرے جھوٹے ہونے کا علم کس طرح ہوا؟"

لڑکی نے منگول کو ایک نظر دیکھا، پھر مجھ سے دریافت کیا۔ "کیا تم خوارزم شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟"

میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں نے گھبراہٹ میں اس کی تردید کر دی۔ "یہ سراسر غلط ہے، میرے خلاف سوچی سمجھی اڑائی ہوئی افواہ ہے!"

منگول نے مجھ سے کوئی سوال کیا۔ جس کی ترجمانی لڑکی نے کی۔ "میرا شوہر منگول یہ پوچھتا ہے کہ تم یہاں کس لئے آئے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں جو کچھ ہوں سب جانتے ہیں!"

لڑکی نے کہا۔ "میں تمہیں یہ مشورہ دوں گی کہ جو حقیقت ہے اسے صاف صاف بتا دو کیونکہ سچ بول کر قتل ہو جانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ آدمی جھوٹ بول کر قتل ہو جائے تم ابھی ان منگولوں کی نطرت سے واقف نہیں ہو، یہ اذیتیں پہنچا کر تم سے سچ بلوالیں گے!"

اس وقت میں عجیب مشکل میں تھا۔ اگر سچ بولتا تو میرا قتل کر دیا جانا یقینی تھا اور

اگر جھوٹ کا سہارا لیتا تھا تو تکلیف دہ اور اذیت ناک عمل تفتیش کا بھگتنا بھی شاید لازمی امر تھا۔ لڑکی نے میری مشکل آسان کر دی، "ہاں ہاں ڈرو مت، ہمت سے کام لو، جو کچھ حقیقت ہے سچ سچ بتا دو۔"

میں نے چاروں طرف سے محصور ہو جانے والے سپاہی کی طرح ہتھیار ڈال دیئے اور دروغ آمیز سچ بول دیا۔ "میرا خوارزم شاہی خاندان سے بہت دور کا تعلق ہے لیکن میرے تجارتی ساتھی عباس کی بد طینتی نے اسے میرے خلاف زہر اگلنے پر مجبور کر دیا اور یہاں میرے خلاف جو بھی افواہیں اڑ رہی ہیں ان کا منبع بھی عباس ہے۔"

لڑکی اپنے شوہر منگول کو کچھ سمجھاتی رہی اور پھر دونوں آپس میں بحث مباحثے میں الجھ گئے۔ میں بس اتنا ہی اندازہ کر سکا کہ منگول میرے خلاف تھا اور لڑکی میرا دفاع کر رہی تھی۔

یکایک لڑکی مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "تم بخارا اور سمرقند کے امرا اور شاہی خاندان کی خواتین کی بابت کچھ جاننا چاہتے تھے؟"

میں نے عاجز آ کر سوال کیا۔ "میں تمہارے ہر سوال کا صحیح صحیح جواب دوں گا لیکن تم پہلے مجھے یہ بتا دو کہ مجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے۔"

لڑکی نے جواب دیا۔ "میرا شوہر تومان باشی ہے اور خاقان نے تمہارا معاملہ میرے شوہر کے سپرد کیا ہے، یہ اپنا تحقیقاتی جائزہ خاقان کی خدمت میں پیش کر دے گا اور خاقان تمہاری بابت فوراً ہی اپنا فیصلہ صادر کر دے گا۔"

منگول نے کچھ کہا اور یورت کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔

لڑکی نے کہا۔ "افسوس کہ اب تم اس وقت تک میرے شوہر کی قید میں ہو جب تک خاقان تمہارے مقدمے کا فیصلہ نہ کر دے۔"

تھوڑی دیر بعد ان دونوں نے پھلوں اور شراب سے میری ضیافت کرنی چاہی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس وقت مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لڑکی نے کہا۔ "کھانے سے انکار نہ کرو، ورنہ یہ منگول ناراض ہو جائے گا کیونکہ اسے یہ لوگ اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔"

میں نے کچھ پھل کھا لیے لیکن شراب نہیں پی۔

مجھے ملول دیکھ کر منگول نے لڑکی کے ذریعے تسلی دی کہ مجھے گھبرانا نہیں چاہیے۔

یہاں نیلے جاودانی آسمان کا انصاف قائم ہے کسی زیادتی کا امکان نہیں ہے اگر میں مجرم ٹھہرا تو معاف نہ کیا جاؤں گا اور اگر بے گناہ نکلا تو سزا سے محفوظ رہوں گا۔ یہاں کسی کی سفارش نہیں چلتی، نہ سفارش نہ رشوت۔

مجھے اپنی قیام گاہ پر نہیں جانے دیا گیا۔ ادقے خان نومان باشی کے خیمے میں زیرِ حراست رہا۔ لڑکی کئی بار آئی اور تسلی دلاسے دے کر چلی گئی۔ اسی دوران مجھے لڑکی کا نام بھی معلوم ہوا۔ اس کا نام خرمانی تھا جو شاید شادمانی کا ہم معنی تھا۔ میں نے اپنے دکھوں کو بھول کر اس سے پوچھا۔ "خرمانی! کیا تم یہاں خوش ہو؟"

اس نے جواب دیا ـــــــ "خوشی اور ناخوشی، اضافی اور عارضی چیزیں ہیں، ہمیں خود کو حالات اور مشکلات کے مطابق ڈھالنا پڑتا ہے!" پھر مجھ سے سوال کیا۔ "کیا تم اس زیرِ حراست زندگی سے مطمئن ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "بالکل نہیں!"

لڑکی نے کہا۔ "پھر اس زندگی کے خلاف کچھ کرو!"

میں نے بے بسی سے جواب دیا۔ "میں مجبور ہوں، اپنے دفاع میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

"یہی حال ہم سب کا ہے۔" لڑکی نے کہا۔ "ان حالات میں بہترین طریقہ یہ ہے کہ آدمی خود کو حالات کے حوالے کر دے۔"

مجھے خرمانی کی شکل کی طرح باتیں بھی بڑی پیاری لگ رہی تھیں، میں نے اس سے پوچھا۔ "خرمانی! اگر خاقان نے مجھے معاف کر دیا تو مستقبل کے لئے مجھے کیا فیصلہ کرنا چاہیئے؟"

وہ میرا مطلب نہیں سمجھ سکی۔ پوچھا۔ "تم کیا پوچھنا چاہتے ہو، ذرا صاف بات کرو۔"

میں نے جواب دیا۔ "اس دنیا میں، میں بالکل تنہا ہوں، میں یہاں قراقرم میں رہوں یا ہرات میں میرے لئے دونوں ہی صورتیں یکساں ہیں، اگر میں یہیں رک جاؤں تو کیسا رہے گا۔"

لڑکی نے جواب دیا۔ "تم تاجر ہو، تمہیں تاجر ہی رہنا چاہیئے، کسی ایک جگہ پتھر کی طرح پڑے رہنا کوئی اچھی بات تو نہیں۔"

میں نے ہمت سے وہ بات کہہ دی جس کا ابھی شاید وقت نہ تھا۔ "خرمانی! میں تنہائی سے اکتا گیا ہوں، مجھے ایک رفیق کی ضرورت ہے، ایک خوبصورت اور عقلمند رفیق کی، جو بالکل تمہارے جیسا ہو، بالکل تمہاری طرح!"

وہ ایک دم ناراض ہو گئی۔ "میں تو تمہیں عقلمند سمجھتی تھی لیکن تم احمق نکلے۔ میں تمہاری بات کا مطلب خوب سمجھتی ہوں، کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں تمہارے ساتھ نکل چلوں گی، واہ یہ بھی ایک ہی رہی، اگر تم مجھے دنیا کے آخری کنارے تک لے کر چلے جاؤ گے تو وہاں

بھی یہ منگول پہنچ جائیں گے ان سے جیتے جی مفر نہیں ہے، اور پھر یہ کہ میں یہاں خوش حال زندگی گزار رہی ہوں!"

میں نے بات بنائی۔ "میرا وہ مقصد ہرگز نہیں، جو غلطی سے تم سمجھ بیٹھی ہو، میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے تمہاری جیسی شکل و صورت اور عقل کا ساتھی درکار ہے!"

"باتیں مت بناؤ!" اس نے ترشی سے کہا۔ "تمہاری باتوں کا ایک ہی مطلب ہے، اور وہ مطلب وہی ہے، جو میں نے سمجھا ہے۔" پھر افسوس سے بولی۔ "افسوس تو یہی ہے کہ تم یہ باتیں اس حالت میں کر رہے ہو کہ کچھ پتہ نہیں کل کی شام تمہیں دیکھنا نصیب بھی ہو گی یا نہیں، یہ لوگ رحم کرنا نہیں جانتے۔"

منگول آتا اور ہم دونوں کی باتیں سن کر واپس چلا جاتا۔ اس غریب کو خرمائی نے یہ سمجھا دیا تھا کہ وہ مجھ سے وطن کی باتیں کر رہی ہے، اوتے خان کو قراقرم سے بڑی محبت تھی اور اس کے نزدیک یہ بات عین منصفانہ تھی کہ اس کی بیوی خرمائی بھی اپنے وطن سے محبت کرتی ہے۔

میں رات بھر نہیں سو سکا۔ میرا خیال تھا کہ منگولوں نے رات بھر میرے یورت کے آس پاس پہرا دیا ہو گا لیکن یہ محض میرا شبہ تھا کیونکہ صبح تک میں نے کئی بار باہر نکل کر دیکھا، وہاں کوئی بھی نہ تھا، جب اس سلسلے میں، میں نے خرمائی سے پوچھا کہ "میں کیسا قیدی ہوں، جس کی پہرے داری تک نہیں کی گئی، میں چاہتا تو کسی وقت بھی فرار ہو سکتا تھا۔"

خرمائی نے بے دلی اور افسوس سے پوچھا "بھاگ کر جاتے کہاں؟"

میں نے کہا۔ "کہیں بھی جا سکتا تھا کم از کم قراقرم کی حدود سے کوسوں دور نکل چکا ہوتا۔"

اس نے طنزیہ کہا۔ "تم عجیب سمجھ کے آدمی ہو، جو یہ سمجھتے ہو کہ منگولوں کی دسترس محض قراقرم کی حدود تک ہے، تم خاقان کے قیدی ہو، چین سے ماوراء النہر اور خوارزم تک تمہیں کوئی بھی پناہ نہ دیتا۔"

وہی زمین اور آسمان جو چند دن پہلے تک اچھے لگتے تھے، اب ویران ویران، اجاڑ اجاڑ محسوس ہو رہے تھے، ماحول اور گرد و پیش کی ہر شے سوگوار اور ماتم گسار نظر آ رہی تھی۔

منگول تومان باشی نے میرے سامنے پھل وغیرہ رکھ دیئے۔ میں نے کھانے میں تامل سے کام لیا تو وہ خرمائی کے ذریعے کہنے لگا۔ "ہم منگولوں میں یہ مثل مشہور ہے کہ ہر جنہ کو کھانا ملنا ضروری ہے اس لئے کھانے پینے سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے جبراً و قہراً کچھ پھل کھا لئے ابھی میں کھانے سے فارغ نہ ہوا تھا کہ ہمارے یورت میں دو آدمی داخل ہوئے، ان میں سے ایک

تو مسلمان نظر آتا تھا اور دوسرا چینی۔ اس چینی کی لمبی لمبی مونچھیں اور لمبی داڑھی بڑی مضحکہ خیز نظر آتی تھیں۔

خرمانی نے ان دونوں کا تعارف کرایا۔ مسلمان اجنبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ محمد یلوزچ ہے، خاقان کا مشیر اور وزیر۔" پھر چینی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور یہ مشہور دانا اور عاقل یوچت سائی ہے، جس کے مشوروں پر خانِ اعظم چنگیز خاں بھی چلا کرتا تھا اور اب اوغدائی خاں بھی اس کے مشوروں کو ٹالتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔"

میں نے ان دونوں کو مایوس نظروں سے دیکھا۔ یہ دونوں حضرات کسی اجنبی زبان میں آپس میں گفتگو کرنے لگے، اس کے بعد محمد یلوزچ نے مجھ سے دریافت کیا۔ "کیا تم واقعی خوارزم شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟"

میں نے خرمانی کے مشورے پر عمل کیا اور سچ بول دیا۔ "ہاں یہ درست ہے!"

محمد یلوزچ نے میرے جواب سے یوچت سائی کو مطلع کر دیا۔ چینی دانا نے افسوسناک انداز میں کچھ کہا۔ میں یلوزچ کی شکل دیکھنے لگا۔ خرمانی کا چہرہ اتر گیا محمد یلوزچ بھی اداس ہو گیا۔ اس نے دریافت کیا۔ "تم یہاں کس لیے آئے ہو؟"

میں نے مختصر سا جواب دیا۔ "تجارت کی غرض سے!"

محمد یلوزچ نے کہا۔ "تجارت کی غرض سے یا جاسوسی کرنے؟"

میں نے پوچھا۔ "میں جاسوسی کس کے لیے کروں گا؟"

محمد یلوزچ نے کہا۔ "خلافتِ عباسیہ کے لیے، بغداد اور مصر کی حکومتوں کے لیے!"

میں نے صاف انکار کر دیا۔ "میں صرف تاجر ہوں، اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

"افسوس کہ تم سے سخت غلطیاں ہوئی ہیں!" محمد یلوزچ نے کہا۔ "جب تم واقعی خوارزم شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے تو تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا اور جب یہاں آ ہی گئے تھے تو بخارا اور سمرقند کے امرا خاندانوں کی خواتین کی بابت کوئی جستجو نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

میں خاموش رہا۔ یوچت سائی نے کچھ کہا۔ جسے میں نہیں سمجھ سکا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں چلے گئے، لیکن مجھے اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ خرمانی کا شوہر منگول بھی ان کے ساتھ ہی چلا گیا۔ میں نے خرمانی سے پوچھا۔ "یہ چینی دانا کیا کہہ رہا تھا؟"

اس نے جواب دیا۔ "کہہ رہا تھا، اس نوجوان کا جرم سنگین اور ثابت ہے اس لیے سزا سے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میرا دل ڈوبنے لگا اور بینائی معدوم ہونے لگی۔ میری دونوں آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن سامنے کی ہر شے دھندلی دھندلی اور موہوم موہوم سی نظر آ رہی تھی، میں نے خرمانی سے

بھرائی آواز میں پوچھا۔ "خاقان تمہارے خیال میں مجھے کیا سزا دے گا؟"

خرمانی نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ "سزائے موت، یاسا میں جاسوسی کی سزا قتل ہے!"

میں چپ ہو رہا کیونکہ جو کچھ مقدر میں تھا پیش آتا جا رہا تھا اس سے بھاگنا کسی طرح اپنے بس میں نہ تھا۔ یکایک خرمانی کی آواز سنائی دی۔ "تمہاری موت کا مجھے بہت افسوس ہو گا۔ میں خاقان کی بیوی تورا کینہ کے پاس جاؤں گی اور اسے مجبور کروں گی کہ وہ اوغدائی خان سے تمہاری جاں بخشی کی سفارش کرے۔"

میں نے بالکل سکوت اختیار کر لیا کیونکہ اب مجھ میں بولنے کی طاقت باقی نہیں رہی تھی، خرمانی اب بھی کچھ کہہ رہی تھی۔ میں نے سنا وہ کہہ رہی تھی۔ "لیکن اگر میں اپنی کوششوں میں ناکام رہی اور تمہیں قتل کر دیا گیا تو یہ خون خرابہ اب زیادہ دنوں تک نہیں چل سکے گا۔ یلوچیت سائی کہتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ وحشت اور جہالت، تہذیب و تمدن اور علم اور دانائی پر حکومت کرے ہم مہذب لوگ منگول نہیں بن سکتے لیکن ان منگولوں کو مہذب ضرور بنا سکتے ہیں اور ایک نہ ایک دن ان وحشی فاتحین کو تہذیب ضرور فتح کر لے گی۔"

لیکن میرے لئے خرمانی کی ساری باتیں فضول تھیں کیونکہ میرے قتل ہو جانے کے بعد اگر یہ وحشی تہذیب اور تمدن کے ہاتھوں مفتوح ہو گئے تو مجھے کیا۔ میرے کس کام کے۔

دوپہر سے ذرا پہلے مجھے اوغدائی خان کے یورت میں لے جایا گیا، وہاں دو رویہ چوکیوں پر ترخان اور تومان باشی بیٹھے ہوئے تھے اور یورت کے آخر میں اونچے تخت پر اوغدائی خان اپنی بیوی تورا کینہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں بائیں محمد یلوچ اور یلوچیت سائی بیٹھے تھے میں اوغدائی خان کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ یہ بھاری بھرکم تن و توش کا انسان ریشمی لباس پہنے ہوئے تھا، سر کے بڑے بڑے بال دو چوٹیوں میں گوندھ دیئے گئے تھے۔ یلوچیت سائی اور محمد یلوچ کے برابر پڑی ہوئی چوکیاں خالی تھیں، تھوڑی دیر بعد وہ بھی بھر گئیں۔

خاقان نے مجھ سے کوئی سوال کیا، میں نہیں سمجھ سکا تو محمد یلوچ نے خاقان کی ترجمانی کی، اوغدائی خان نے مجھ سے پوچھا تھا کہ "مجھ پر جو الزام لگایا گیا ہے، کیا وہ صحیح ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور آہستہ سے کہا۔ "درست ہے!"

یلوچیت سائی کھڑا ہوا اور دیر تک کچھ کہتا رہا۔ یورت کے دربار پر سناٹا طاری ہو گیا جب وہ کہہ چکا تو اوغدائی نے محمد یلوچ سے کچھ کہا۔ اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "جنید! خاقان کہتا ہے کہ مقدمے کی روداد سے میں تمہیں آگاہ کرتا رہوں کیونکہ یہاں نیلے آسمان کی جاودانی انصاف کی حکمرانی ہے۔ ابھی ابھی چینی دانا نے تمہاری سفارش کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب چونکہ خوارزم شاہی کا اس دنیا میں کوئی وجود نہیں اس لئے خاقان کو چاہیئے کہ تمہیں معاف کر دے، یلوچیت

سائی نے خاقان کے سامنے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ وہ تمہیں معاف کر کے ملازم رکھ کر یہیں روک لے، اس طرح جاسوسی کے خدشے سے بھی نجات مل جائے گی اور ایک پڑھا لکھا نوجوان خاقان کی حکومت میں کارآمد پرزے کی طرح کام سے لگ جائے گا لیکن خاقان یہ کہتا ہے کہ اس کے قانونی معاملات اس کے بڑے بھائی چغتائی خان کے ہاتھ میں ہیں، وہ چاہے تو معاف کر دے اور نہ چاہے تو یاسا کے مطابق سزا دے دے۔"

لیوچیت سائی کے برابر ہی چغتائی خان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کھڑا ہو کر کچھ دیر تک بولتا رہا۔ محمد یلوتچ نے مجھے بتایا کہ چغتائی خان کہہ رہا تھا کہ کسی مجرم کو معافی دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس نے جاسوسی جیسے سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے اس لئے اسے سزا مل کر رہے گی۔"

اسی دوران ادغدائی کی چہیتی بیوی تورا کینہ نے بھی کچھ کہا۔ جس کی بابت محمد یلوتچ نے بتایا کہ تورا کینہ میری سفارش کر رہی ہے لیکن چغتائی خان نے اسے بھی رد کر دیا۔

یکایک لوگوں کی نظریں یورت کے دروازے کی طرف اٹھ گئیں، میں بھی گھوم کر دیکھنے لگا، سامنے سے دو منگولوں کے ساتھ عباس چلا آ رہا تھا، وہ آ کر میرے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔

محمد یلوتچ نے اس سے سوال کیا۔ "کیا تم اس نوجوان سے واقف ہو؟"

عباس نے جواب دیا۔ "ہاں خوب اچھی طرح!"

محمد یلوتچ نے سوال کیا۔ "یہ کون ہے؟"

عباس نے جواب دیا۔ "یہ ہمارے قافلے کے ساتھ تو ایک تاجر کی حیثیت سے آیا ہے لیکن دراصل یہ خوارزم شاہی خاندان کا ایک فرد ہے!"

چغتائی خان نے فوراً ہی اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "یاسا اس مجرم کے لئے قتل کی سزا تجویز کرتا ہے! اور غروبِ آفتاب سے پہلے پہلے قراقرم کے سب سے بلند ٹیلے پر نیلے جاودانی آسمان کی بارگاہ میں اس کی قربانی پیش کر دی جائے!"

قصہ ختم ہو چکا تھا لیوچیت سائی اور محمد یلوتچ رنجیدہ ہو کر بیٹھ گئے ـــــ تورا کینہ غصے میں اندر چلی گئی اسے غالباً اس بات کا ملال تھا کہ اس کے شوہر نے اس کی سفارش نہیں مانی تھی۔

عباس نے محمد یلوتچ کے ذریعے خاقان سے درخواست کی کہ "اب چونکہ جنید کو سزائے موت دی جائے گی اس لئے خاقان کو چاہئے کہ جملہ تجارتی اشیا پر اس کا حق ملکیت تسلیم کر لیا جائے۔" خاقان نے اس کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا کہا کہ "اپنے حق کو یہ شخص خود ہی کسی کے حوالے کر سکتا ہے۔"

میں نے خاقان سے درخواست کی کہ "میری چیزیں تومان باشی ادقے خان کے حوالے

کر دی جائیں۔"

خاقان نے میری درخواست منظور کرلی لیکن عوداقے خان انہیں نہیں لینا چاہتا تھا۔

مجھے پھر خرمانی کے یورت میں پہنچا دیا گیا۔ یہاں خرمانی بھی بہت روئی، اس نے کہا کہ اوغدائی تو ذرا نرم پڑ گیا تھا لیکن اس کا بڑا بھائی چغتائی خان قطعی اس بات کے حق میں رہتا ہے کہ یاسا کے قوانین کی رو گردانی نہ کی جائے۔

میں نے خرمانی سے دل شکستہ لہجے میں کہا۔" میں نے خاقان سے یہ درخواست کی تھی کہ عباس کے پاس میرا جو سامان تجارت موجود ہے، اسے تمہارے حوالے کر دیا جائے لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے شوہر نے اس کے لینے سے انکار کر دیا ہے اس لئے اب تم سے میری درخواست ہے کہ تم اس سے وہ سامان حاصل ضرور کر لو، بعد میں چاہے تم اسے لوگوں میں تقسیم کر دینا لیکن عباس سے میرا حصہ وصول ضرور کر لینا ہے!"

خرمانی نے بھی کہا۔" عباس ذلیل انسان ہے، میں تمہارا حصہ اس سے ضرور حاصل کر لوں گی۔" پھر پوچھا۔" سزائے موت کا فیصلہ سن کر، سچ بتانا، دل پر کیسی گزر رہی ہے؟"

میں نے جواب دیا۔" بس ذرا سی دیر کے لئے پریشانی ہوئی تھی لیکن اب یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہا ہوں کہ میں شاید جلدی ہی اپنے مرحوم والدین کی روح سے ملاقات کرنے جانے والا ہوں!"

دن کے چوتھے پہر سے ذرا پہلے مشرق سے زبردست گرد و غبار کا طوفان اٹھا جس میں نیلا آسمان سورج سمیت روپوش ہو گیا۔ میں پہاڑی کی طرف چلا جا رہا تھا، میری گردن مارنے کا فریضہ بھی خرمانی کے منگول شوہر کو انجام دینا تھا مجھے ایک بلند و بالا ٹیلے پر لے جا کر کھڑا کر دیا گیا۔ میرے میزبان کے ہاتھ میں کھلی ہوئی خمیدہ تلوار چمچا رہی تھی، بہت سارے منگول میرے قتل کا تماشا دیکھنے جمع ہو گئے تھے۔ جب مشرق سے اٹھنے والی خوفناک آندھی نے نیلے آسمان کو چھپا لیا اور اس کی جگہ ہمارے سروں پر گرد و غبار کا آسمان تن گیا تو منگولوں کے ہوش و حواس جاتے رہے تھوڑی دیر کے لئے گردن مارنے کی تقریب روک دی گئی کیونکہ منگولوں کا یہ عقیدہ تھا کہ جب نیلا آسمان گرد و غبار میں اپنا منہ چھپالے اور آندھی کے جھکڑ چلنے لگیں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ جادوائی نیلا آسمان اپنا جلال برسا رہا ہے، اوقے خان اور منگول اپنے اپنے سروں کو گھٹنوں میں دے کر بیٹھ گئے اور گرد و غبار کے چھٹنے کا انتظار کرنے لگے۔ اسی عالم میں، میں نے ایک شخص کا ہیولا اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا جو گرد و غبار کو چیرتا اور کانوں کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے لڑکھڑاتا ہوا میری طرف چلا آ رہا تھا۔ جب وہ بالکل میرے قریب آگیا تو میں نے اسے پہچان لیا یہ عباس تھا، وہ آتے ہی تقریباً میرے قدموں میں گر گیا اور زار و قطار روتا ہوا بولا۔" جنید! مجھے

بڑا افسوس ہے کہ تم قتل کر دیئے جاؤ گے میں تنہا واپس جا کر اپنے ہونے والے خسر کو کیا جواب دوں گا۔"

میں نے سوچا کہ اس قتل گاہ تک پہنچانے والا بھی یہی شخص ہے اور اب یہی آنسو بھی بہا رہا ہے، میرا خیال تھا کہ جب اس کے ضمیر نے اپنے کیے پر تنہائی میں غور کیا ہوگا تو ضرور شرمندہ ہوا ہوگا اور اب یہ سوچ سوچ کر گھبرا رہا ہوگا کہ اس کا ہونے والا خسر احمد میرے معاملے میں اس پر ضرور برہم ہوگا۔ سوچتے سوچتے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اب جبکہ میرا قتل کر دیا جانا مقدر ہو چکا ہے تو خطا کار لیکن شرمسار عباس کو معاف کیوں نہ کر دیا جائے۔

میں نے کہا۔ "عباس! مجھے یہاں تک پہنچانے والے تم خود ہو، میرا خیال ہے تمہیں تمہارا ضمیر یقیناً کچوکے لگا رہا ہوگا۔"

"ہاں!" عباس کہنے لگا۔ "میں بھی آدمی ہوں، مجھ سے بھی غلطیاں ہو سکتی ہیں اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میری وجہ سے تم یہاں تک پہنچے ہو تو میں اس کی معافی چاہتا ہوں!"

میرا گداز دل بھر آیا۔ میں نے کہا۔ "میں تمہیں معاف کرتا ہوں، اور اگر تم (کاغذ) اور قلم دوات مہیا کر سکو تو میں اس سلسلے میں اپنی تحریر بھی دے سکتا ہوں۔"

عباس کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا اور اس نے جھک کر میری پنڈلیوں کو کئی بوسے دیئے، کہنے لگا۔ "قلم دوات اور قافیہ کی کوئی ضرورت نہیں، میں نحیف الجثہ منگول اوتے خان کو بلاتا ہوں جو میں کہوں تم اس کے سامنے کہہ دو۔"

میں نے جواب دیا۔ "لیکن وہ ہماری زبان نہیں سمجھتا۔"

عباس نے کہا۔ "ہاں یہ بات تو ہے تو پھر تم ایسا کرو کہ کسی طرح محمد یلوخ کو بلواؤ اور جو میں کہوں تم اس کے سامنے کہہ دو۔"

"میں تیار ہوں لیکن تم مجھ سے کہلوانا کیا چاہتے ہو؟"

عباس نے چبا چبا کر کہا۔ "یہی کہ تمہارے قتل میں میرا ہاتھ نہیں ہے اور تمہارے بعد تمہارے سامان کا میں وارث قرار پاؤں گا۔"

یکایک اتنی زور کا جھونکا آیا کہ عباس لڑکھڑا کر دور جا گرا۔ عباس کی آخری بات نے میرے دل میں اس کے خلاف نفرت اور غصّے کی آگ دوبارہ بھڑکا دی، میں جان سے جا رہا ہوں اور اسے سامان کی اپنے نام منتقلی کی فکر کھاتے جا رہی ہے، جب وہ دوبارہ میرے قریب آیا تو میں نے اسے دھتکار دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ۔ "او لالچی انسان! میں تجھے کسی قیمت پر بھی معاف نہ کروں گا، میں تیری کوششوں سے اس حال کو پہنچا ہوں، اگر میں اس دنیا میں بدلہ نہ

لے سکا تو دوسری دنیا میں تیرا دامن ضرور پکڑوں گا" تو یہ بات بھول جا کہ میں تجھے معاف بھی کر سکتا ہوں۔"

سائیں سائیں اور شاں شاں کرتے خوفناک جھکڑ کسی طرح تھمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ اسی عالم میں نشیب کے میدان سے بہت سارے گھوڑوں کی ٹاپیں گونجنے لگیں، ہوا اس کے جھونکے کبھی ان آوازوں کو دور کر دیتے کبھی نزدیک لے آتے، دیکھتے ہی دیکھتے ساٹھ ستر گھوڑے ٹیلے پر ہمارے قریب آ گئے۔ یہ لوگ ٹیلے پر اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہوا اس کو چیرتے پھڑپھڑاتے کپڑوں میں چھپائے چار گھڑ سوار میرے قریب آ گئے، ایک شخص ان کی رکاب میں پیدل آیا تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ تومان باشی ادغے خان تھا۔ چار گھڑ سوار بھی اپنے اپنے گھوڑوں سے نیچے اتر پڑے، میں نے ان کی جسامت ہی سے انہیں پہچان لیا، ان میں سے دو تو ادغدائی خان اور چغتائی خان تھے، چغتائی خان نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے گھوڑے کی آڑ میں لے کر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ میں ہواؤں کے جھونکوں سے محفوظ ہو گیا۔ پھر ادغدائی خان بھی ہمارے پاس ہی آ گیا۔ ان لوگوں نے ہوا کے جھکڑوں سے بچنے کی یہ عجیب ترکیب نکالی کہ اپنے ساٹھ ستر گھوڑوں کو دو قطاروں میں ہوا کے رخ پر کھڑا کر کے ان کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ انہی میں، میں نے ادغدائی کی بیوی تور اکینہ اور خرمانی کو اس حال میں دیکھا کہ ان کی آنکھوں پر سے سینے تک ایک سفید دبیز کپڑا پردے کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ ایک طرف یوچینت سائی اور محمد بلوچ بھی موجود تھے، لیکن ان سب میں ایک ایسا شخص بھی تھا جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا اور جو اپنی صورت شکل اور لباس سے زنخا معلوم ہوتا تھا اس کی بڑی بڑی زلفیں بالکل عورتوں کی طرح تھیں، لباس بھی عورتوں ہی جیسا تھا اور داڑھی مونچھیں ندارد تھیں، زنخا اور مخبوط الحواس یا نیم پاگل۔

یہ بالکل اتفاقی امر تھا کہ ان سب کے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی آندھی کا زور ٹوٹنے لگا اور نیلے آسمان کا ایک گوشہ صاف نظر آنے لگا۔ خاقان اور اس کے کنبے کے سوا تمام منگول آسمان کے اس نیلے گوشے کی طرف سربسجود ہو گئے۔ پھر جب مطلع صاف ہو گیا تو مجھ پر مایوسی اور موت کے خوف نے پھر غلبہ کر لیا میرا خیال تھا کہ مجھے اس ہجوم کے سامنے قتل کیا جائے گا لیکن میری توقع کے خلاف چغتائی خان نے مجھے مخاطب کر کے کچھ کہا جسے میں نہیں سمجھ سکا۔ پھر اس نے منگولوں کو مخاطب کیا۔ وہ دیر تک ان سے مخاطب رہا۔ اپنی تقریر کے دوران اس نے کئی بار میری طرف اشارے کیے اور کبھی کبھی وہ مخبوط الحواس زنخے کی طرف بھی اشارے کر دیتا تھا۔ جب وہ تقریر ختم کر چکا تو میں نے دیکھا کہ خرمانی کی آنکھیں ڈبڈبا آئی ہیں، اس نے انہیں نہایت ہوشیاری سے چہرے پر پڑے ہوئے رومال سے پونچھ ڈالا۔

چغتائی کے بعد ادغدائی خان نے کچھ کہا اور پھر خاقان اعظم کے اشارے پر محمد بلوچ

میرے قریب آیا اور کہنے لگا۔

"جنید! تم بڑے خوش قسمت انسان ہو جو کام تورا کینہ کی سفارش اور لیوچیت سائی کی دانائی انجام نہ دے سکی تھی، اسے آندھی اور اس شامان نے انجام دے دیا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے نتنخ مخبوط الحواس کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کہتا رہا۔ "یہ یہاں کا شامان ہے، قراقرم کا ساحر، یہ شخص جاودانی نیلے آسمان سے باتیں کر سکتا ہے، یہ یہاں کا روحانی معالج بھی ہے، جب مشرق اور شمال مشرق سے آندھی کے آثار ہویدا ہو رہے تھے تو یہ شامان بھاگتا ہوا خاقان کے یورت میں داخل ہو گیا، اور اس نے چیخ چیخ کر خاقان اعظم کو یہ بتایا کہ اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مونگ کے تینگری (جاودانی نیلے آسمان) کا یہ پیغام وصول کیا ہے کہ کوئی بے گناہ قتل کیا جا رہا ہے، اگر اسے قتل کر دیا گیا تو آسمانی جلال قراقرم کو تہس نہس کر دے گا۔ شامان کے انتباہ نے اور غلائی، اس کی بیوی تورا کینہ اور چغتائی خان وغیرہ کو بدحواس اور پریشان کر دیا اور یہ فوراً ہی ہوا کے دوش پر سوار ہو کر تمہیں بچانے کے لئے یہاں آ گئے، اب تمہیں کوئی بھی نہیں قتل کر سکتا، جاودانی نیلے آسمان کی تائید تمہارے ساتھ ہے!"

مجھے معلوم نہیں کہ سزائے قتل کی منسوخی کی خبر کا عباس پر کیا اثر ہوا لیکن خود مجھ پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی، مجھے ایک گھوڑا پیش کیا گیا، میں اس پر سوار ہو کر خاقان تورا کینہ، چغتائی خان اور خرمانی وغیرہ کے ساتھ ٹیلے سے نیچے اترنے لگا۔

-

اب میں نے پہلا کام یہ کیا کہ عباس سے علیحدگی اختیار کر لی، میں نے نہایت بے دردی اور بے مروتی سے اپنا حصہ الگ کر لیا۔ اب عباس بھیگی بلی بن چکا تھا۔ خرمانی کا شوہر اوتے خان قدم قدم پر میری مدد کر رہا تھا اس نے میرے لئے ایک یورت کا انتظام کر دیا۔ میں اپنے سامان کے ساتھ اس میں منتقل ہو گیا۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے بھی خاقان اعظم کی طرف سے پروانۂ چاکری مل جاتے لیکن اس کا ابھی وقت نہیں آیا تھا، دوسرے یہ کہ خرمانی بھی ایسا کرنے سے منع کر رہی تھی وہ کہتی تھی کہ میں بدستور تجارت کرتا رہوں اور قراقرم میں مستقل قیام کا خیال ذہن سے نکال دوں، اور یہ بات طے تھی کہ میں خرمانی کا کہنا نہیں ٹال سکتا تھا، وہ روز بروز میرے ذہن پر قابض ہوتی جا رہی تھی۔ میرے دل و دماغ اس کے قبضے میں جا چکے تھے۔

مجھے قراقرم میں رہتے ہوئے چار ماہ گزر چکے تھے۔ اس عرصے میں خرمانی سے بہت زیادہ قریب ہو چکا تھا اور بہت زیادہ باتیں کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ خرمانی اپنے حالات اور ماحول سے کچھ زیادہ دل برداشتہ نہیں ہے اور مجھے ایک ناتجربہ کار، جذباتی اور غیر مآل اندیش نوجوان سمجھتی ہے اور یہ انکشاف بھی ہوا کہ اسے تورا کینہ کی مصاحبت حاصل ہے اور وہ تورا کینہ کے بہت سے رازوں سے واقف ہے۔

بیشتر تاجر اپنا سامان فروخت کر چکے تھے اور اب واپسی کی تیاریاں ہو رہی تھیں، عباس مجھ سے ملنے آیا۔ میں یہ سمجھا کہ مجھ سے واپسی کے لئے کہے گا۔ لیکن اس نے کچھ دوسری باتیں کیں، اس نے پوچھا۔ "کیا تم واپسی کی تیاریاں کر چکے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "ابھی نہیں، کیوں؟"

کہنے لگا۔ "سر دست میں خود نہیں جا رہا، میں ابھی کچھ دن اور یہاں رہوں گا۔ میرا خیال ہے تم اپنا سامان فروخت کر چکے ہو اور تمہیں واپس چلا جانا چاہیئے۔"

میں نے بے رخی سے جواب دیا۔ "میں واپسی کا ارادہ ہی نہیں رکھتا، میں یہیں رہ جانا چاہتا ہوں۔"

عباس نے حیرت سے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

میں نے جواب دیا۔ "مجھ جیسے آوارہ و بے خانماں کے لئے ہرات اور قراقرم میں کوئی فرق نہیں۔"

اس نے مجھے تعجب سے دیکھا اور کہنے لگا۔ "تب پھر مجھے اپنا پیغام کسی اور کے ذریعے روانہ کرنا ہوگا۔"

دراصل وہ اپنے ہونے والے خسر احمد کو یہ پیغام بھیجنا چاہتا تھا کہ وہ کسی وجہ سے ابھی سال ڈیڑھ سال قراقرم میں اور ٹھیرے گا۔ کیوں ٹھیرے گا کچھ پتہ نہ تھا۔ میں خود بھی حیران تھا کہ عباس جیسا کاروباری مزاج انسان یہاں اتنا وقت کیوں ضائع کرنا چاہتا ہے۔

ایک دن مجھے یہ خبر ملی کہ اوقتے خان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی ہے، میں بھاگا ہوا اس کے یورت پہنچا۔ اس دن اس یورت کا منظر ہی کچھ اور تھا۔ ایک تخت پر مخملیں نمدے کے بستر پر اوقتے خان آنکھیں بند کئے پڑا ہوا تھا اور اس کے آس پاس بیس بائیس عورتیں اور لڑکیاں سوگوار بیٹھی تھیں اور وہی شامان جس نے میری جان بچائی تھی سرہانے بیٹھا بڑبڑ کچھ پڑھ رہا تھا۔ خرمانی بھی بہت اداس تھی، اس نے مجھے یورت کے دوسرے حصے میں بٹھا دیا۔

میں نے اس سے دریافت کیا۔ "یہ اوقتے خان کو ہو کیا گیا آخر؟"

خرمانی نے جواب دیا۔ "شراب اور عیاشی نے اس کا وقت سے پہلے ہی کام تمام کر دیا ہے۔"

میں نے حیرت سے سوال کیا۔ "کیا تمہارے علاوہ بھی اوقتے خان کی بیویاں ہیں؟"

خرمانی نے دکھ سے جواب دیا۔ "کوئی ایک دو! میرے علاوہ اس کی بیس بائیس بیویاں اور ہیں، یہ ساری عورتیں اور لڑکیاں جو اس کے آس پاس جمع ہیں، اس کی بیویاں ہیں

ان میں چین اور سمرقند و بخارا کے درمیانی تمام ملکوں کی عورتیں موجود ہیں!"

میرے دل میں کچھ امیدیں گھر کرنے لگیں، میں نے پوچھا۔ "یہ شامان کیا کر رہا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "علاج"

"کیا یہ معالج بھی ہوتا ہے؟"

"ہاں۔ پجاری، طبیب، ساحر اور نیلے جاودانی آسمان سے ہم کلام ہونے والا بازی گر یہ سبھی کچھ ہوتا ہے۔"

"کیا یہ اوقتے خان کو اچھا کر لے گا۔"

"کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا!"

"لیکن اس نے مجھے تو بچا ہی لیا تھا۔"

"ہاں!" وہ کہنے لگی۔ "اگر میں اسے لمبی رشوت نہ دیتی تو یہ کبھی بھی تمہیں نہ بچا سکتا۔"

"تم نے میری خاطر اسے رشوت دی تھی!" میں چونک پڑا۔ "یہ بات تم نے مجھے پہلے تو نہیں بتائی تھی؟"

"اس وقت بھی نہ بتاتی، بس زبان سے نکل گئی یہ بات، لیکن تم وعدہ کرو کہ اس کا ذکر کسی اور سے نہیں کرو گے!"

"وعدہ!" میں نے جواب دیا، میرے دل میں خرمانی کے لئے امید کا چراغ روشن ہو گیا۔ میں نے پھر سوال کیا۔ "کیا اوقتے خان جانبر ہو جائے گا۔"

"شاید نہیں!" اس نے دکھ سے جواب دیا۔

میں نے ڈرتے ڈرتے ایک ایسا سوال کر دیا جو اس نازک اور سوگوار لمحے میں ہرگز جائز نہ قرار دیا جا سکتا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "اگر خدانخواستہ اوقتے خان نہ بچ سکا تو اس کے بعد تمہارا کیا منصوبہ ہو گا؟"

اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "کچھ معلوم نہیں، یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔"

اور اسی دن شام تک اوقتے خان کا انتقال ہو گیا۔

میں کئی دن تک خرمانی سے نہیں ملا، مجھے نہیں معلوم تھا کہ اوقتے خان کے بعد اس کے یورت میں جانا منگول قوانین کی رو سے کیسا تھا؟ لیکن ایک دن میں خیمے کے چند ٹکڑے لے کر پہنچ گیا۔ میں نے یہ ٹکڑے اس کے حوالے کیے اور اس سے کہا کہ "انہیں پانی کی صراحیوں پر لپیٹ دو پانی ٹھنڈا رہے گا۔"

وہ مجھ سے اس طرح ملی جیسے میرا انتظار کر رہی ہو، میں نے اسے ٹٹولنے کی خاطر جھوٹی خبر سنائی۔ "خرمانی! اب میرا کام یہاں ختم ہو چکا ہے ہرات واپس جانا چاہتا ہوں!"

اس کی ویران نظریں میرے چہرے پر ٹک گئیں، پوچھا۔ "کب واپس جا رہے ہو؟"
میں نے جواب دیا۔ "ابھی کوئی پانچ سات دن اور یہاں ہوں!"
وہ کسی سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ سوچتی ہوئی بولی۔ "اچھا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ دو چار ماہ اور رک جاؤ؟"

میں نے کہا۔ "رک تو سکتا ہوں لیکن فائدہ؟ مقصد؟"

وہ کچھ یاد کرتی ہوئی بولی۔ "لیکن ایک بار تم نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ تم یہاں مستقلاً رہنا چاہتے ہو، لیکن اب جب کہ میں بہت غمزدہ ہوں، تم مجھے چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتے ہو؟"

میں نے سوچا کہ اب بات صاف صاف ہی کر لینا چاہیئے، حلق میں خشکی دوڑ جانے سے خراش سی محسوس ہو رہی تھی، میں کھنکھارتا ہوا بولا۔ "اس وقت تمہیں دیکھ کر قراقرم میں کچھ حسن محسوس کرنے لگا تھا۔"

اس نے بات کاٹ دی، کہنے لگی۔ "لیکن اب میں کہاں چلی گئی ہوں اب بھی تو یہیں موجود ہوں۔"

میں نے جواب دیا۔ "معلوم نہیں کیوں، تم میری بات کیوں نہیں سمجھ رہی ہو تم اتنی نادان تو نہیں ہو!"

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور یورت کے اندرونی در پر جا کر بیٹھ گئی اور مجھے بھی اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ جب میں اس کے پاس پہنچا تو اس نے مجھے اپنی داہنی جانب کی چوکی پر بٹھا دیا اور خود میرے بائیں طرف تقریباً میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔ میں نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ بھی سامنے چوکی پر، میرے مقابل بیٹھ جائے لیکن وہ بدستور میرے قدموں ہی میں بیٹھی رہی، کہنے لگی۔ "ہاں اب وہ باتیں کرو جو ابھی کر رہے تھے۔"

میں نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ "خرمائی تم جانتی ہو کہ میں کیا چاہتا ہوں، لیکن ہم دونوں کے حالات کچھ اتنے مختلف اور متضاد ہیں کہ شاید ایک نہ ہو سکیں۔"

خرمائی نے کہا۔ "بات یہ نہیں ہے، میں اگر چاہوں تو تمہیں اپنے ساتھ رکھ سکتی ہوں، اب مجھ پر جبر نہیں کیا جائے گا۔ اوغدائی کہتا تھا کہ میں دوسری شادی کر لوں لیکن میں نے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ میں اب شادی نہیں کروں گی اپنے بچے کی تعلیم و تربیت پر وقت صرف کروں گی۔"

"تمہارا کوئی بچہ بھی ہے؟"
"ہاں، تین سال کا!"

"وہ کہاں ہے؟"

"وہ اپنی دادی دادا کے پاس رہتا ہے، وہ اسے قبائلی تربیت دے کر جنگجو اٹھانا چاہتے ہیں۔"

"اچھا!" اس انکشاف سے میں خوش نہ ہوا۔ "تمہارے جواب پر ادغدائی نے کیا کہا؟"

"وہ بہت خوش ہوا اور میرے جذبۂ ایثار کو سراہنے لگا۔ اس نے مجھ سے کہہ دیا ہے کہ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں جو چاہوں کروں!"

"میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"تم ابھی یہیں رہو اور وقت کا انتظار کرو!"

"کس وقت کا انتظار؟ کیا اب بھی کوئی وقت آسکتا ہے؟"

"بالکل آسکتا ہے" وہ کہنے لگی۔ "یہاں منگولوں میں یہ رسم ہے کہ عورتیں یورتوں کے در پر اس طرح بیٹھا کرتی ہیں کہ ان کا شوہر چوکی پر بیٹھتا ہے اور بیوی اس کے بائیں طرف، شوہر کے قدموں میں، منگولوں کا اعتقاد ہے کہ دل چونکہ بائیں طرف ہوتا ہے اس لئے آدمی کو جس سے بہت زیادہ محبت ہو، اسے اس کے قدموں میں دل کے قریب ہی بیٹھنا چاہیئے!" یہ کہتے کہتے وہ شرما گئی اور گردن جھکالی۔

خرمانی کو اپنی بابت جو کچھ کہنا تھا، بحسن وخوبی کہہ چکی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "تب پھر مجھے کب تک انتظار کرنا پڑے گا؟"

"ابھی کچھ بھی معلوم نہیں؟" اس نے دوٹوک جواب دیا۔ "سردست تم خاقان کی چاکری کرلو، میرے سامنے چند مقاصد ہیں یا یوں سمجھ لو کہ چند رکاوٹیں ہیں، میں انہیں دور کئے بغیر تم سے کوئی وعدہ نہیں کرسکتی۔"

میں نے کہا۔ "ان رکاوٹوں کی بابت کچھ مجھے بتاؤ شاید میں تمہاری کوئی مدد کرسکوں!"

"تم میری کوئی مدد نہیں کرسکتے۔" وہ کہنے لگی۔ "ویسے میں یہ تمہیں بتاتے دیتی ہوں کہ مجھے ان منگولوں سے کوئی دلچسپی نہیں، ان کے جسموں سے معلوم نہیں کیسی بو آتی رہتی ہے اگر میرے بچے کا مستقبل ان لوگوں سے وابستہ نہ ہوتا تو میں کسی بھی طرح یہاں سے فرار ہوچکی ہوتی۔"

ادغدائی اس بات سے بہت خوش ہوا کہ میں قراقرم کو امن وانصاف کی سرزمین سمجھ کر مستقلاً یہیں بس جانا چاہتا ہوں، توراکینہ نے میرے سپرد یہ خدمت کی کہ میں خانوں کے بچوں کو پڑھا لکھا دیا کروں، محمد یلوچ اور یوچت سائی، دونوں نے تقریباً یک زبان ہو کر کہا

کہ "تمہیں اپنی خدمت نہایت، محنت اور ہوشیاری سے انجام دینی چاہئیں، اور اس مقصد کو ذہن میں رکھ کر منگول بچوں کی تعلیم کرو کہ جہالت اور وحشت کو آخر کار تہذیب و تمدن کے ہاتھوں مفتوح ہونا ہے، وہ منگول جو رحم کا نام تک نہیں جانتے تھے اب رحم اور ہمدردی کی طرف مائل نظر آنے لگے ہیں۔"

خاقان کے بچوں کو پڑھانے کے سلسلے میں مجھے ان کے یورتوں میں جانے کا موقع ملا، یہ عجیب جنگلی لوگ تھے، بات بات پر آگ بگولا ہو جانا ان کی فطرت میں داخل تھا۔ میں جلدی ہی ان سے عاجز آگیا، اگر خرِمانی کی طمع نہ ہوتی تو میں انہیں کب کا چھوڑ چکا ہوتا۔ خرِمانی سے میں بار بار یہ پوچھتا رہا کہ آخر وہ وقت کب آئے گا جس کا میں انتظار کر رہا ہوں" وہ کہتی "کچھ دن اور۔"

اسی طرح ایک سال گزر گیا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ خرِمانی نے جن رکاوٹوں کا ذکر کیا تھا، ان کا کہیں کوئی وجود نہ تھا، دراصل وہ تذبذب کا شکار تھی۔ ایک طرف نفس تھا، دوسری طرف بچہ تھا۔ اس کے دل میں معلوم نہیں کس طرح یہ موہوم سی امید پیدا ہو گئی تھی کہ اس کا بچہ بھی بڑا ہو کر جنگجو نکلے گا اور قبائلی رسم و رواج شاید اس کی غیر معمولی صفات کے پیشِ نظر اسے بھی خاقان یا اس سے کوئی کمتر منصب عطا فرما دیں، کیونکہ بچے کے دادا دادی جس غیر معمولی انہماک سے اس کی پرورش کر رہے تھے اس سے کچھ بھی بعید نہ تھا، میں نے سوچا یہ تو سائے کے پیچھے بھاگنے والی عورت ہے، میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اب اس کے چہرے پر زیادہ نکھار آتا جا رہا تھا میں نے اس کے پاس آمد و رفت کم کر دی کیونکہ قراقرم میں یاسا کا قانون رائج تھا، جس میں بدکاری کے مرتکب کو قتل کر دیا جاتا ہے، خرِمانی کے پاس زیادہ آنے جانے سے سنگین لغزش کا ہر وقت امکان موجود رہتا تھا لیکن خرِمانی یہ چاہتی تھی کہ میں روزانہ ہی اس سے ملتا رہوں۔

پھر قدرت نے مجھے ایک ایسا موقع عطا کیا کہ میں نے خرِمانی کو بھی اسی کرب اور اذیت میں مبتلا کر دیا، جس کا میں خود شکار تھا۔ ایک دن صبح ہی صبح ادغدائی نے ایک منگول سپاہی کے ذریعے مجھے اپنے یورت میں طلب کیا۔ یہ لوگ اکھڑ اور اجڈ تو ہوتے ہی ہیں، اس منگول سپاہی نے ادغدائی کے خیمے میں حاضر ہونے کا حکم جس طرح سنایا اس سے مجھے یہ شبہ گزرا کہ ضرور کوئی مصیبت کھڑی ہونے والی ہے۔

جب میں ادغدائی کے یورت میں داخل ہوا تو وہاں ادغدائی کے علاوہ چینی دانا لیوچت سائی بھی موجود تھا۔

ادغدائی نے مجھے اپنے قریب بلایا اور چوکی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ میرا دل: دھک دھک

کر رہا تھا۔ وہ بڑا مردم شناس تھا۔ کہنے لگا۔ "تو پریشان کیوں ہے؟ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ہم نے تجھ یہاں غصے یا رنجش میں طلب کیا ہے؟"

میں نے ادب سے عرض کیا۔ "جسے جاودانی نیلے آسمان نے معافی دی ہو اسے خاقان کس طرح دکھ یا اذیت پہنچا سکتا ہے!"

اوغدائی میرے جواب سے بہت خوش ہوا۔ لیوچت سائی سے کہنے لگا۔ "دیکھ یہ کیسی عقل کی باتیں کرتا ہے!"

چینی دانا نے جواب دیا۔ "یہ عالم ہے اور علم عقل کو جلا دیتا ہے۔ اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ یہاں مدرسے ہونے چاہئیں تاکہ خانوں کے بچے فاتح اور جنگجوئی میں بے مثال ہونے کے ساتھ ساتھ عقل و دانش اور علم و ادراک میں بھی دوسروں پر سبقت لے جائیں۔"

اوغدائی نے کہا۔ "ایسا ہو گا' ایسا ہی ہو گا لیکن میرا عظیم اور فاتح عالم باپ کہا کرتا تھا کہ پکے مکانوں اور خانقاہوں میں رہنے والے نظر تا نرم، کمزور اور بزدل ہو جاتے ہیں صرف جنگجو اور مہیب لوگ ہی دوسروں پر حکومت کر سکتے ہیں۔ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ خانوں کے بچے پڑھ لکھ کر چینیوں اور مسلمانوں کی طرح ہو جائیں؟"

لیوچت سائی کہنے لگا۔ "ملکوں کو فتح کر لینا الگ بات ہے اور ان پر انصاف اور دانائی سے حکومت کرنا الگ بات، خاقان انصاف کرنے کے لئے ہر جگہ تو پہنچ نہیں سکتا' یہ جہاں نہیں پہنچ سکتا' وہاں اس کے مقرر کیے ہوئے عالم اور دانا حضرات اس کا کام چلاتے ہیں۔"

اوغدائی ان باتوں سے اکتا گیا اور اچانک ایک عجیب سا سوال کر دیا۔ مجھ سے پوچھا۔ "تیرے بادشاہ اپنے محلوں میں کتنی عورتیں رکھتے ہیں؟"

جھوٹ بولنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ "بہت زیادہ، کبھی کبھی ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ جاتی ہے، لیکن از روئے اسلام یہ جائز نہیں ہے!"

میں نے آخری بات اس لئے کہی تھی کہ اگر میرے سچ میں کوئی بات اوغدائی کی مرضی کے خلاف ہوئی تو جملے کا آخری فقرہ اس کی تلافی کر سکے۔

اوغدائی میرے جواب سے بہت خوش ہوا۔ لیوچت سائی سے کہنے لگا۔ "اور تو مجھے صرف اٹھائیس عورتوں کا پابند رکھنا چاہتا ہے، میں کہتا ہوں کہ میرے لئے اتنی ہی عورتوں کا انتظام اور کر، اور یہ تیری ذمے داری ہے کہ تو ہر سال میرے لئے حسین ترین عورتیں مہیا کر دیا کرے!"

لیوچت سائی نے جھنجلا کر جواب دیا۔ "میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ

خاقان کا بھی وہی حشر ہو جو اس کے بھتیجے بوتے خان کا ہوا ہے!"

ابھی یہ بحث جاری تھی کہ ایک منگول خدمت گار نے اندر آکر یہ خبر سنائی کہ "ادترات قبیلے نے اس کے حکم کے خلاف قدم اٹھایا ہے اور اپنی لڑکیوں کی شادیاں، خاموشی سے اپنے قبیلے ہی کے نوجوانوں سے کر دی ہیں!"

اوغدائی کا چہرہ غصے میں نہایت بھیانک ہو گیا۔ اس نے حکم دیا۔ "ادترات والوں کو حکم دو کہ وہ اسی وقت اپنی سات سال سے اوپر کی لڑکیوں اور نئی شادی شدہ دلہنوں کو لے کر آبادی کے باہر میدان میں جمع ہو جائیں۔ یہ میرا حکم ہے، اوغدائی کا جو بوگدو (چنگیز خان) کا جانشین ہے!"

ایک تہلکا مچ گیا۔ آناً فاناً منگول شہ سوار ردوان دواں نظر آنے لگے جو خاقان اعظم کے حکم کی تعمیل کرانے کی غرض سے ادترات قبیلے کی طرف بھاگے چلے جا رہے تھے۔

بات صرف اتنی سی تھی کہ خاقان ادترات قبیلے کی لڑکیوں کی شادیاں کہیں اور کرنا چاہتا تھا جب قبیلے والوں کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے اپنی لڑکیوں کی شادیاں چپ چپاتے قبیلے ہی کے نوجوانوں سے کر دیں اور جب خاقان کو اس سرتابی کی خبر ملی تو وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ میں واپس جانے کا خواہشمند تھا لیکن خاقان نے مجھے روک لیا۔

جب ہم خاقان اور لیوچت سائی کے ساتھ اس میدان میں پہنچے جہاں ادترات قبیلے والے اپنی لڑکیوں اور نئی شادی شدہ دلہنوں کے ساتھ میدان میں جمع ہو چکے تھے۔ ہم سے پہلے ہی منگولوں کا عظیم الشان اجتماع ہو چکا تھا، یہ لوگ یہ دیکھنے آئے تھے کہ خاقان انہیں کیا سزا دیتا ہے۔

میدان میں چار ہزار لڑکیاں اور دلہنیں جمع تھیں، ان کے پیچھے قبیلے کے مرد ہراسانی اور خوف کے عالم میں خاقان کے فیصلے کے منتظر تھے، اوغدائی نے اردو (لشکر) کے افسروں کو حکم دیا۔ "لڑکیوں اور دلہنوں کو دو قطاروں میں کھڑا کیا جائے!"

حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔ خاقان لیوچت سائی اور مجھے لے کر قطاروں کے درمیان داخل ہو گیا اور دونوں قطاروں کی لڑکیوں اور دلہنوں میں سے اپنی پسند کی الگ کرنے لگا۔ سینکڑوں لڑکیاں اس کے انتخاب میں آچکی تھیں اس کے بعد اس نے اپنی فوج کے سرداروں کو حکم دیا کہ وہ بھی اپنی اپنی پسند کی لڑکیاں چن لیں۔

پھر وہ میری طرف گھوما اور کہنے لگا۔ "تو کیا دیکھتا ہے، تو بھی اپنی پسند کی ایک عورت حاصل کر سکتا ہے!"

مجھے معلوم تھا کہ خاقان کے حکم کی تعمیل نہ کرنے کا کیا مطلب تھا، میں نے بھی ایک حسین لڑکی اپنے لیئے الگ کرلی، سب سے آخر میں اوغدائی نے اردو کے عام سپاہیوں کو حکم دیا کہ "جسے جو بھی پسند آئے اپنے ساتھ لے جائے۔"

دیکھتے ہی دیکھتے ساری لڑکیاں میدان سے غائب ہوگئیں۔

خاقان نے بے دست و پا اور مظلوم و مجبور اوترائی مردوں کی طرف دیکھا اور درشت لہجے میں چیخ کر کہا۔ "یہ ہے خاقان کی حکم عدولی کی سزا" تمہیں معاف کیا جاتا ہے تم سب اپنے قبیلے میں واپس جاؤ۔"

جب خاقان کی پسندیدہ لڑکیوں اور دلہنوں کا گلہ اس کے یورت کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو ان خوش و خرم منگولوں میں لیوچیت سائی تنہا وہ شخص تھا جو بہت اداس تھا۔

خاقان نے مسکراتے ہوئے اس چینی دانا کو دیکھا اور کہنے لگا۔ "اس سال تو میں نے خود ہی اپنے لیئے عورتوں کا انتظام کرلیا ہے لیکن آئندہ سال سے یہ کام تجھے انجام دینا ہوگا!"

لیوچیت سائی نے خفگی سے جواب دیا۔ "جب گدڑیا خود ہی بھیڑیا بن جائے تو اس کے گلے کی حفاظت کون کرسکتا ہے، میں بار بار یہی کہوں گا کہ خاقان کو اس میٹھے زہر سے پرہیز کرنا چاہیئے یہ زہر تو ہڈیوں کے گودے تک میں اتر جاتا ہے اور اسے کھوکھلا کرکے ہلاک کردیتا ہے۔"

اوغدائی اس طرح ہنسا، گویا آج اس نے لیوچیت سائی کو شکست دے دی تھی۔

جب میں لڑکی کو لے کر اپنے یورت میں داخل ہوا تو اس وقت میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ یہ خبر کسی طرح خیرمائی کو ہو جائے اور وہ دوڑی دوڑی میرے پاس آجائے۔ میں اس کے قلبی تاثرات کا اس کے چہرے سے اندازہ لگانا چاہتا تھا۔

میری توقع کے مطابق خبر سنتے ہی وہ بھاگی ہوئی میرے یورت میں آئی اور لڑکی کو سر سے پیر تک نہایت غور سے دیکھا گو کہ خیرمائی کے حسن سے اس کا کوئی مقابلہ نہ تھا لیکن یہ خیرمائی سے کم عمر ضرور تھی، میں نے دیکھا وہ لڑکی کو دیکھ دیکھ کر بہت جل رہی تھی۔

اس نے کہا۔ "جنید! اس لڑکی کو تم اوترائت والوں میں واپس بھیج دو۔"

میں نے کہا۔ "واہ یہ کیونکر ہوسکتا ہے، یہ خاقان کا تحفہ ہے جو انہوں نے مجھے عطا کیا

ہے، میں خاقان کی بے حرمتی کس طرح کر سکتا ہوں۔"

خرمانی جیسے اپنے ہوش میں نہ تھی، پوچھا۔ "کیا تم مجھے میرے وعدے واپس لوٹا رہے ہو؟"

"نہیں تو!" میں نے اسے چھیڑا۔ "میں اب بھی اس وقت کا انتظار کروں گا جس کا تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے؟"

وہ کہنے لگی۔ "اگر تم مجھے چاہتے ہو تو تمہیں اس لڑکی سے پرہیز کرنا پڑے گا۔"

"یہ کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا تم دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں؟"

"نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "یہ میرا آخری فیصلہ ہے!"

میں نے سوچا خرمانی سے اب باآسانی معاملہ ہو سکتا ہے، میں نے دریافت کیا۔ "کیا تم میرے ساتھ ہرات چلنے پر آمادہ ہو؟"

"نہیں،"

"یہاں رہ کر میں خاقان کے تحفے کو اپنے پاس رکھنے پر مجبور ہوں!"

معلوم نہیں کیا سوچ کر بولی۔ "اچھا کچھ سوچنے کا مجھے وقت دو!" پھر پوچھا۔ "کیا آج شام کا کھانا میرے یورت میں کھانا پسند کرو گے؟"

"کیوں نہیں، میں تمہاری دعوت کس طرح ٹال سکتا ہوں؟"

اس نے کہا۔ "ہاں آنا ضرور، کھانے کے بعد تفصیلی باتیں کروں گی اور شاید فیصلہ کن بھی۔"

وہ چلی گئی، اور میں اس وقت یوں بہت خوش تھا کہ میں نے اس سرکش، مذبذب اور چالاک لڑکی کو بہت زیادہ ستایا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اب وہ میرے قابو میں آ کر رہے گی۔

شام کو جب میں اس کے یورت میں داخل ہوا تو پتہ چلا کہ وہاں کچھ اور مہمان بھی آنے والے ہیں، یورت میں پچاس قندیلوں والا فانوس روشن تھا اور یورت میں دن جیسی روشنی پھیلی ہوئی تھی، اس وقت خرمانی بہت خوش تھی، اور اس کے انگ انگ سے شادمانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی اور دیکھتے دیکھتے عورتوں اور مردوں کا ایک اچھا خاصا اجتماع ہو گیا۔ یورت میں مختلف رنگ و نسل کے مہمان جمع تھے، میرا ان سے تعارف کرایا گیا۔ یورت کے مغربی گوشے میں جو جوڑا بیٹھا تھا وہ میری توجہ کا خاص مرکز بن گیا۔

تو منگول تھا لیکن لڑکی اپنی طرف کے خدوخال رکھتی تھی، مجھے شبہ ہوتا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے، لڑکی بھی مجھے باربار دیکھ رہی تھی، خرمانی نے اس جوڑے سے میرا تعارف نہیں کرایا تھا۔ میں نے اس سے دریافت کیا۔ "خرمانی! تم نے اس جوڑے کا تعارف نہیں کرایا؟" کہنے لگی۔ "پہچانو۔ ان کا تعارف غائبانہ کرادوں گی، وہ بھی اس وقت نہیں، کل صبح تمہیں اس یورت میں آنے کی زحمت ایکبار اور گوارا کرنا پڑے گی!"

پھر میرا دم گھٹنے لگا۔ سر چکرا گیا۔ میں نے اس لڑکی کو پہچان لیا تھا، یہ روشنک تھی میری چچازاد بہن، میری منگیتر، وہ باربار مجھے دیکھ رہی تھی، شاید اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا یا پہچاننے کی کوشش کررہی تھی، اس وقت میں اپنے قابو میں نہ تھا۔ میں کسی سے کچھ کہے سنے بغیر یورت کے باہر چلا گیا۔ باہر اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن تاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں، کچھ دیر بعد بہت کچھ نظر آنے لگا۔ اتنے میں ایک شخص یورت کے اندر جھانکتا ہوا پاس سے گزرا، میں نے اسے پکڑ لیا کیونکہ بغیر اجازت چوروں کی طرح۔ یورت میں جھانکنا، یاسا میں جرم قرار دیا گیا تھا جب اس شخص کا چہرہ سامنے آیا اور اس کے منہ سے بے ساختہ "کون ہے" کی آواز نکلی تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ عباس تھا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور جب یہ پوچھا کہ "وہ اندر کیوں جھانک رہا تھا؟" تو وہ جواب دیئے بغیر ہی فرار ہوگیا۔

میں اس وقت تک باہر ہی رہا جب تک کہ مہمان کھاپی کر رخصت نہ ہوگئے اور مجھے اس بات کی حیرت تھی کہ خرمانی مجھے بلانے بھی نہ آئی وہ گویا میری موجودگی فراموش کرچکی تھی، اسے اپنی ہتک تصور کرتے ہوئے میں اپنے یورت چلا گیا اور پوری رات میں نے کرب و اضطراب میں گزار دی، وہ کسی طرح بھی خرمانی سے کم حسین نہ تھی، میں دل ہی دل میں رات بھر یہ دعا مانگتا رہا کہ خدا کرے اس کے ساتھ والا منگول اس کا جبری شوہر نہ ہو۔ پھر میرے کانوں میں خرمانی کی یہ آواز گونجی کہ "پہچانو۔" میں نے سوچا کہ "کیا خرمانی، روشنک اور میرے تعلق سے آگاہ ہے؟" وہ رات قیامت کی رات تھی، صبح جب فجر کی اذان ہوئی، میں جاگ رہا تھا۔

دھوپ چاروں طرف پھیل گئی تھی، میں بے چینی سے خرمانی کا انتظار کررہا تھا۔ اللہ اللہ کرکے خرمانی آئی تو فوراً یہ سوال کیا۔ "کل رات تم کہاں چلے گئے تھے؟" میں نے جواب دیا۔ "گھر چلا آیا تھا۔" اس کے بعد میں نے پوچھا۔ "خرمانی! میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، کیا تم اس کا صحیح صحیح جواب دوگی؟"

"پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو، لیکن شاید جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو، میں جانتی ہوں!"

تم کیا جانتی ہو؟"

"یہی کہ تم روشنک کی بابت کچھ پوچھو گے جو کبھی تمہاری منگیتر تھی لیکن اب وہ ایک معزز منگول کی بیوی ہے!"

میری آنکھوں تلے اندھیرا پھیل گیا لیکن خرمانی کی آواز بدستور سنائی دیتی رہی۔ "مجھے تمہاری بابت بہت پہلے ہی سب کچھ معلوم ہو چکا ہے جب میں نے روشنک سے تمہارا ذکر کیا تھا تو وہ تمہارا نام سنتے ہی 'تمہیں' پہچان گئی تھی، کئی بار میرے جی میں آئی کہ تمہیں اس راز سے آگاہ کر دوں لیکن یہ سوچ کر خوفزدہ ہو گئی کہ تم ذرا بے صبرے نوجوان ہو فوراً کوئی ایسی ویسی حرکت کر گزرو گے، جس سے تم دونوں کو نقصان اٹھانا پڑے گا۔ تم مجھ سے عشق کرتے رہے اور میں بھی تمہارے مصنوعی عشق میں مبتلا رہی۔" کچھ دیر کے لئے وہ چپ ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب وہ جو باتیں کہنا چاہتی ہے، ذرا احتیاط اور سوچ سمجھ کے بعد کہنا چاہتی ہے۔

میں نے دکھ بھری آواز میں کہا۔ "تم چپ کیوں ہو گئیں، سب کچھ صاف صاف کہہ دو خرمانی۔"

وہ کہنے لگی۔ "اس درمیان میں اسی کوشش میں لگی رہی کہ کسی طرح روشنک کو یہاں سے فرار کرا دوں لیکن یہ بڑا دشوار کام تھا اسی لئے میں نے تمہیں روک رکھا تھا، جب وہ چلی جاتی تو میں تمہیں بھی یہاں سے رخصت کر دیتی لیکن میں آج تک اپنے اس منصوبے میں ناکام ہوں!"

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "روشنک کے ساتھ اس کی ماں بھی تو یہاں آئی تھیں؟"

"ہاں، وہ یہاں آنے کے ایک سال بعد ہی انتقال کر گئیں، وہ خود کو اس ماحول کا عادی نہ بنا سکیں۔"

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، میں نے اوپر نظر جو اٹھائی تو پتہ چلا کہ خرمانی بھی رو رہی ہے۔

میں نے پوچھا۔ "تم کیوں رو رہی ہو خرمانی؟"

اس نے اپنی حالت پر قابو پانے کی ناکام کوشش کی، بولی۔ "یہ خوشی کے آنسو ہیں!" پھر رک کر بولی۔ "میں نہیں چاہتی تھی کہ روشنک کے ہوتے ہوئے تم اور ترات لڑکی کو اپنے ساتھ رکھو۔"

مجھے اس بے مثل کردار کی لڑکی سے بہت زیادہ محبت محسوس ہو رہی تھی۔
اس نے اچانک ایک عجیب سوال کیا۔ "کہو اب تم خرمانی کے لئے کیا فیصلہ کرو گے؟ کیا تمہیں اب بھی مجھ سے محبت ہے؟"
اس کا جواب بہت مشکل تھا۔ پھر بھی آنکھیں بند کر کے منہ کھول دیا۔ "مجھے تم سے بھی محبت ہے خرمانی!"
"پاگل، احمق، بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ تم ایک وقت میں دو لڑکیوں سے محبت کرو۔"
میں نے جواب دیا۔ "یہ بات ممکن ہو یا ناممکن، لیکن یہ سچ ضرور ہے اب میں تمہیں بھی نہیں چھوڑ سکتا۔"
خرمانی نے کہا۔ "بکواس، فضول باتیں۔ اب تمہیں فوراً ہی یہاں سے چلا جانا ہے۔"
"کہاں؟"
"ہرات!"
"کیوں؟"
"اس لئے کہ اب یہاں مزید رکنا بے کار اور خطرناک ہے میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتی، تم بے احتیاطی میں ضرور کوئی ایسا قدم اٹھا سکتے ہو جس سے تمہاری اور روشنک کی جانیں ہلاکت میں پڑ جائیں!"
میں نے اسے لاکھ لاکھ اپنی احتیاط پسندی اور محتاط روی کا یقین دلانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانی۔ میں اسے یہ بات کس طرح بتاتا کہ اب میرے دل میں روشنک سے زیادہ خود اس کی محبت کارفرما تھی۔
اس نے کہا۔ "تم فکر نہ کرنا۔ تم ہرات میں روشنک کا انتظار کرنا میں اس کو کسی بھی طرح بھیج دوں گی!"
میں نے جواب دیا۔ "لیکن یہاں سے جا ہی کون رہا ہے، میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ اپنی پوری زندگی یہیں فرادم میں گزار دوں گا۔"
"ابھی تم یہاں کے رسم و رواج سے اچھی طرح واقف نہیں ہوئے، بس یہ سمجھ لو کہ کسی وقت اور کسی بھی لمحے تم یہاں کسی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے ہو!"
لیکن اس وقت میری سمجھ میں اس کی باتیں نہیں آئیں۔

میں برابر اس کوشش میں رہا کہ کسی بھی طرح ایک بار میں روشنک کو اور دیکھ لوں لیکن خرمانی نے میری درخواست مسترد کر دی اور یہی ضد کرتی رہی کہ میں قراقرم سے جلد از جلد نکل جاؤں۔

ایک دن اس نے اپنے بچے سے بھی میری ملاقات کرادی، وہ بالکل منگول تھا۔ آنکھیں جبڑے، کان اور سر سب کچھ منگولوں ہی جیسا تھا۔ اسے سینے سے چمٹا کر کہنے لگی۔ "اب تو میں اس کے سہارے زندہ ہوں، صرف اس کے لئے، میرا منا بڑا ہو کر بڑا مرد بنے گا، یہ میرا دل کہتا ہے، اسی لیے میں اس کو قراقرم میں رکھنا چاہتی ہوں، یہ فاتحین کی بستی ہے اس بستی کے سوا جو کچھ ہے مفتوحین کا ہے!"

اس دن مجھے اس کا صحیح اندازہ ہوا کہ وہ اپنے بیٹے کو کس قدر چاہتی ہے۔

بڑی دیر سے بادل گھر گھر کر آرہے تھے، میں بارش سے پہلے ہی اپنے یورت میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ یورت میں اوبرات لڑکی تنہا تھی، لیکن خرمانی نے مجھے روک رکھا تھا کہ بارش ہونے ہی والی ہے، جب یہ ہو چکے، میں چلا جاؤں، اور ذرا دیر بعد واقعی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی بارش کے ساتھ دم بدم زور زور سے بجلی چمکتی اور بار بار اس کا کڑکا ہوتا۔ منگولوں کا بہت برا حال ہوگا کیونکہ میں نے سن رکھا تھا کہ وہ بجلی اور اس کے کڑکے سے بہت ڈرتے ہیں تقریباً نصف ساعت زور کی بارش ہوتی رہی، یکایک اتنا زور سے بجلی کڑکی کہ خرمانی نے بچے کو اپنے سینے سے لگا کے انگلیاں کانوں میں دے لیں۔ میں نے بجلی کو زمین کی طرف آتے دیکھا تھا اور مجھے یقین تھا کہ بجلی کہیں قریب ہی گری ضرور ہے۔

جب پانی رکا اور بادلوں کا گرجنا اور بجلی کا چمکنا موقوف ہوا تو شاید سارے ہی منگول اپنے اپنے یورتوں سے باہر آگئے اور اس سمت چل پڑے جدھر بجلی گری تھی۔

خرمانی نے خوفزدہ آواز میں کہا۔ "معلوم نہیں وہ کون بدقسمت ہے جس پر جاودانی نیلے آسمان کا یہ قہر نازل ہوا ہے!"

میں اس کا مطلب نہیں سمجھا، اس سے پوچھا۔ "بجلی کدھر گری تھی؟"

میں نے اس طرف اشارہ کر دیا، ادھر ہی میرا یورت بھی تھا۔ بولی۔ "خدا خیر کرے تمہارا یورت بھی تو اسی طرف ہے!"

"ہاں مگر کیوں؟"

وہ کہنے لگی۔ "بجلی جس یورت پر بھی گری ہو گی وہ "راندہ درگاہ" قرار پائے گا، یہ منگول اس شخص یا خاندان کو نہایت منحوس سمجھتے ہیں، جس پر یہ آسمانی قہر نازل ہو۔"

اب تو میں بھی سہم گیا اور ڈرا کہ کہیں وہ میرے ہی یورت پر نہ گری ہو۔

دھڑکتے دل اور لرزتے قدموں سے جب میں اپنے یورت کے قریب پہنچا تو پتہ چلا کہ وہ بہت سارے منگولوں کے محاصرے میں ہے بجلی اسی پر گری تھی، میں نے لوگوں کو ہاتھوں سے ادھر ادھر ہٹانا چاہا تو ان میں سے کچھ نے مجھے پہچان لیا اور بدک کر دور ہو گئے پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہر شخص مجھ سے دور بھاگنے لگا۔ میں ان کی نظر میں منحوس انسان تھا۔ ایسا منحوس انسان، جس پر نیلے آسمان کی جاودانی قوت نے اپنا جلال بھیجا تھا۔

میں ڈرا سہما، یورت میں داخل ہوا۔ مجھے اوغرات لڑکی کا خیال آ رہا تھا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے کس طرح روشنی حاصل کی، یہ کچھ میرا ہی دل جانتا ہے کیونکہ وہاں کا ہر شخص مجھ سے نفور اور خوفزدہ تھا۔ جب میں موم کی شمع لے کر اندر داخل ہوا تو وہاں ایک چوکی پر جھلسی ہوئی اوغرات لڑکی دکھائی دی، میرے منہ سے بے چیخ نکل گئی اور میں اس کے سرہانے بیٹھ کر بچوں کی طرح رونے لگا۔

علی الصباح خاقان کا آدمی آیا اور مجھے بلا لے گیا۔ اس دن مجھے خاقان کے یورت میں داخلے کی اجازت بھی نہ مل سکی، خاقان چند تومان باشیوں اور ترخانوں کے ساتھ یورت کے دروازے پر نمودار ہوا اور افسوسناک لہجے میں بولا "افسوس کہ تو نے خاتون کے بچوں کو پڑھایا لکھایا ہے اور تو وہی ہے جسے ایک بار نیلے آسمان کی جاودانی قوت نے موت کے منہ سے بچایا تھا لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ اب آسمانی دیوتا تجھ سے ناراض ہو چکے ہیں اور رات تیرا یورت جلال آسمانی سے جھلس گیا۔ ایسا کیوں ہوا، ابھی ہمیں نہیں معلوم، لیکن میں نے سنا ہے کہ تو نے اوقے خان کی بیوی سے دوستی کر رکھی ہے، میرے آدمی تحقیقات کر رہے ہیں اگر کوئی ایسی ویسی بات ثابت ہو گئی تو، تو خِربانی کے ساتھ ہی ہلاک کر دیا جائے گا۔ ورنہ تجھے دو دن کے اندر ہی یہاں سے چلا جانا ہے۔"

میں خاموش رہا۔ اوغدائی نے چپ رہ کر میرے جواب کا انتظار کیا، پھر پوچھا "تجھے کچھ کہنا ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "خاقان کے حکم کی تعمیل مجھ پر واجب ہے، میں دو دن کے اندر ہی قراقرم سے چلا جاؤں گا۔"

اوغدائی نے پوچھا۔ "تجھے کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

میں نے نفی میں گردن ہلا دی، لیکن خاقان نے میرے انکار کے باوجود سونے کی بیس

سلاخیں مجھے عنایت کیں، اور کہا۔ "تو عرب تاجر ہے یہ سلاخیں تجھے اس لئے دی جا رہی ہیں تاکہ اپنے وطن جاکر یہ نہ کہہ سکے کہ خاقان بخیل تھا اور اس کے گھر میں تاجروں کی قدردانی نہیں ہوتی۔"

اب میں خرمانی سے کس طرح مل سکتا تھا۔ میں نے اپنا سامان سمیٹا۔ عباس ملنے آیا اور پیش آنے والے سانحے پر افسوس کا اظہار کیا۔ میں نے پوچھا۔ "تم کب چلوگے؟"

کہنے لگا۔ "میں ابھی رہوں گا!"

میں سمجھ گیا کہ یہ ضرور کسی چکر میں پڑ چکا ہے اور کسی نہ کسی دن میری ہی طرح ذلیل کر کے نکالا جائے گا۔

خاقان کے آدمیوں نے خرمانی اور میرے معاملے کی تحقیقات کی اور ہمیں بے گناہ قرار دیا۔

جب میں قراقرم سے رخصت ہوا تو خرمانی کے سوا کوئی بھی میرے پاس نہ آیا۔

خرمانی نے کہا۔ "جنید! میری بات یاد رکھنا، تم شادی میں عجلت سے کام نہ لینا۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ روشنک کو ضرور بھیج دوں گی۔"

میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "خرمانی! اب مجھے روشنک سے زیادہ تمہاری ضرورت ہے، تم معلوم نہیں کیوں میری بات نہیں سمجھتیں!"

"بکواس! تم پاگل ہوگئے ہو، ہاں تو وعدہ کرو کہ تم شادی میں عجلت سے کام نہ لوگے؟"

میں نے وعدہ کرلیا۔ تب کہیں اس نے جانے کی اجازت دی۔

ایک چھوٹا سا قافلہ قرہ خطائی کی طرف جارہا تھا، میں بھی اسی میں شامل ہو گیا۔ میں نے کئی بار پلٹ پلٹ کر دیکھا، خرمانی آنکھوں پر ہاتھ رکھے مجھے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

اس وقت میں تاجر تھا۔ جب میں نے اپنے نفع نقصان پر غور کیا تو پتہ چلا خسارے کے سوا کچھ بھی نہیں ملا۔

قرہ خطائی سے ذرا پہلے شاہراہِ ریشم کے آس پاس اوغدائی کا چھوٹا بھائی تولی اپنے عظیم اردو کے ساتھ پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔ وہ کسی علاقے کو فتح کرکے آرہا تھا۔ میرے پاس پانی کم پڑ گیا۔ میں ان کے لشکر میں پہنچا اور بے تکلفی سے پانی مانگنے لگا، میں نے جس

شخص سے پانی مانگا تھا وہ اپنے تھیلے الٹ کر کسی شے کی گنتی کر رہا تھا۔ میں اس کے اور زیادہ قریب پہنچ گیا، وہ حقیقتاً انسانوں کے کٹے ہوئے کانوں کا ڈھیر لگا رہا تھا۔ میں پانی مانگنا بھول گیا۔ اس سے پوچھا "یہ کان کس کے ہیں؟" "دشمن کے!" یہ کہہ کر وہ کانوں کی گنتی کرنے لگا۔

جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے کہا۔ "دراصل ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ ہماری قوم جب دشمنوں پر فتح حاصل کرتی ہے، اور ہم ان کے مقتولوں کی گنتی کرنا چاہتے ہیں تو ہم لوگ ان کے داہنے کان کاٹ لیتے ہیں پھر اطمینان سے ان کی گنتی کرتے رہتے ہیں۔"

میں نے کسی نہ کسی طرح اس سے پانی لیا اور وہاں سے چلا آیا۔

جب میں ہرات میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا، احمد تاجر آنے والے تاجروں میں مجھے اور عباس کو تلاش کرتا پھر رہا ہے، میں اس سے چمٹ کر بہت رو دیا۔

اس نے عباس کی بابت سوالات کئے میں نے احمد تاجر کو پورا واقعہ سنا کے کہا۔ "اس نے تو میری جان لینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی لیکن قسمت تھی جو بچ گیا۔"

احمد تاجر نے بے چینی سے پوچھا "لیکن وہ واپس کیوں نہیں آیا؟"

میں نے جواب دیا۔ "کسی جگہ دل لگا بیٹھا ہوگا۔"

تاجر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "ہاں تیری بات درست ہی ہوگی، کچھ اور لوگوں نے بھی مجھے یہی بات بتائی تھی۔" اس کے بعد اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں آنسو آگئے، بولا "بس ذرا بیٹی کا خیال تھا، اگر وہ نہیں آتا تو نہ آئے مجھے بھی اس کی کوئی پرواہ نہیں، یہ کیا کم ہے کہ تم آگئے۔ اب تم ہی میرے لئے سب کچھ ہو!"

میں خاموش رہا۔ میں اس سے یہ کہہ سکتا تھا کہ للّٰہ مجھ سے کوئی غلط توقع نہ لگانا کیونکہ میں بھی کسی کا پابند ہوں اور مجھے بھی کسی کا انتظار کرنا ہے۔ لیکن کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

میں نے اس وقت تک ہرات ہی میں رہنے کا منصوبہ بنایا جب تک روشنک آ نہیں جاتی تاجروں کے قافلے ادھر ادھر آتے جاتے رہتے لیکن میں پتھر کی طرح ہرات ہی میں پڑا رہا۔ میں نے بتدریج احمد سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ وہ اس تبدیلی پر حیران تھا، وہ پوچھتا تھا کہ آخر مجھے ہو کیا گیا ہے۔

میں جب بھی یہ خبر پاتا کہ چین کی عظیم تجارتی سڑک، شاہراہ ریشم سے کوئی قافلہ آیا ہے، یں پڑاؤ پہونچ جاتا اور روشنک کو تلاش کرتا رہتا لیکن پھر ناکام واپس آتا۔ اسی طرح تقریباً آٹھ ماہ گزر گئے۔ ایک دن، مغرب سے ذرا پہلے ہرات کی سرائے کا آدمی میرے پاس آیا اور بتایا کہ چین کے شمال سے ایک عورت آئی ہوئی ہے اور مجھ سے ملنا چاہتی ہے، میں سمجھ گیا کہ روشنک ہی ہوگی، فرطِ خوشی میں بھاگا ہوا سرائے پہنچا۔ جب میں سرائے کی کوٹھری میں داخل ہوا تو تھوڑی دیر کے لئے مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ سامنے روشنک کی جگہ خرمانی بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"خرمانی یہ تم۔"

وہ بہت افسردہ اور طول تھی، صحت بھی گر چکی تھی۔ تھوڑی دیر تک ڈبڈبائی آنکھوں سے اس نے مجھے دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر مجھ سے چمٹ گئی۔ "انہوں نے میرا بچہ چھین کر مجھے نکال دیا جنید!"

میں نے بھی اسے پوری طاقت سے چمٹا لیا اور آہستہ آہستہ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ میں نے کہا۔ "تم مت رو خرمانی، مجھے تمہاری ہی ضرورت تھی، مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ آج میں بہت خوش ہوں۔"

ہم دونوں اس طرح کچھ دیر تک ہم آغوش روتے رہے، اس کے بعد میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ پہلے میں اپنے گھر میں تنہا تھا اور گھر بھائیں بھائیں کرتا تھا، خرمانی کے آتے ہی وہ آباد ہوگیا اور اس کے در و دیوار مسکرانے لگے۔

رات دیر تک ہم دونوں باتیں کرتے رہے، خرمانی نے مجھے جو داستان سنائی وہ بڑی افسوسناک تھی، خرمانی کو اس جرم میں کہ وہ آسمانی جلال کے معتوب انسان کو پڑاؤ تک رخصت کرنے کیوں گئی، بڑی اذیتیں دی گئیں، اس کا سماجی قطع تعلق ہوا، اس کے بچے کو، اس سے دور رکھا گیا اور آخر اسے مجبور کیا کہ وہ قراقرم چھوڑ کر کہیں بھی چلی جائے، اسے اس مصیبت میں، میں یاد آیا۔

میں نے پوچھا۔ "روشنک کا کیا حال ہے؟"

خرمانی نے جواب دیا۔ "اس نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن پکڑی گئی اور اس کے سر میں کیلوں سے لاتعداد سوراخ کر کے جھیل میں ڈبو دیا گیا۔"

مجھے جھرجھری آگئی اور معلوم نہیں کیوں، مجھے اس خبر سے صدمہ نہیں پہنچا۔

میں نے عباس کی خیریت پوچھی تو کہنے لگی۔ "یہ بات میں اب تمہیں بتاتی ہوں کہ یہ

روشنک ہی تو تھی جس کی وجہ سے عباس وہاں رکا ہوا تھا۔ سامان تجارت کی خریداری کے دوران ایک کا دوسرے سے سامنا ہو گیا تھا۔ پھر عباس اس کے گرد چکر لگاتا رہا۔ لیکن یہ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ خود روشنک عباس پر ملتفت نہ تھی، وہ عباس کے ساتھ فرار ہو کر اس ماحول سے نکلنا ضرور چاہتی تھی، چنانچہ روشنک کے ساتھ عباس کو بھی موت کی سزا بھگتنا پڑی۔"

اسی لمحے مجھے یاد آیا کہ جس رات میں نے روشنک کو خرمانی کے ہاں دعوت میں دیکھا تھا، عباس کو بھی یورت کے باہر ٹہلتے ہوتے پایا تھا۔

میں نے خرمانی سے شادی کر تو ضرور لی لیکن اس کے بعد مجھے جن اذیتوں اور دکھوں کا سامنا کرنا پڑا وہ بڑا ہولناک ہے، وہ ہر وقت اپنے بچے کو یاد کرتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہاں تک پاگل پنے کا دورہ پڑتا ہے کہ غصے میں یہ کہنے لگتی ہے کہ تمہارے پہنچنے سے پہلے میں کتنی خوش تھی لیکن یہ تم ہو جس نے مجھے اپنے بچے سے جدا کر دیا اور یہ تم ہو جس نے مجھ سے قراقرم چھڑوایا۔ مجھے گھر سے بے گھر کیا۔"

میں اسے ہر طرح یہ سمجھانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں کہ تمہارا گھر قراقرم میں نہیں، خوارزم، ماوراالنہر یا فارس میں ہو سکتا ہے۔"

لیکن وہ میری کوئی بات نہیں مانتی، میں نے سوچا تھا کہ جب اس کے ایک آدھ بچہ ہو جائے گا تو اس کی طبیعت میں ٹھہراؤ آجائے گا لیکن اب جبکہ وہ ایک لڑکی اور ایک لڑکا پیدا کر چکی ہے، اپنے منگول بچے کو برابر یاد کرتی رہتی ہے اور اس کے دل میں یہ بات پتھر کی انمٹ لکیر کی طرح جم گئی ہے کہ اس کا بیٹا جوان ہو کر خاقان ضرور بنے گا اور ایک نہ ایک دن وہ سارا علاقہ، جو منگولوں کی فتوحات سے بچا ہوا ہے، اس کا خاقان بیٹا اسے بھی فتح کر لے گا اور اس وقت وہ، ایک بار پھر قراقرم واپس جائے گی، خرمانی کی حیثیت سے نہیں، خاقان کی ماں کی حیثیت سے، جس کی پورا اردو تومان باشی، ترخان، ارخان اور شامان وغیرہ عزت و تکریم کرتے ہوں گے۔"

بزورِ شمشیر



شہر کے نامی گرامی اوباشوں اور لفنگوں نے نوعمر اور ناتجربہ کار شہزادے میراں حسین کو شیشے میں اتار لیا۔ یہ شہزادہ احمد نگر کے حکمران مرتضیٰ نظام شاہ کا بیٹا اور چاند بی بی کا بھتیجا تھا۔ خود اعتمادی سے محروم، شکی اور حبالغے اور جنون کی حد تک مذہب کا دلدادہ مرتضیٰ نظام شہزادے کی تعلیم و تربیت پر کوئی توجہ نہ دے سکا تھا اور شہر کے چالاک اوباشوں کو یہ معلوم تھا کہ احمد نگر کے مستقبل کی حکمرانی میراں حسین کی تقدیر میں لکھی جا چکی ہے اس لئے انہوں نے اپنی چکنی چپڑی باتوں اور اعلیٰ درجے کی مصاحبت کے عوض شہزادے کا اعتماد حاصل کر لیا۔ اب شہزادے کا عزیز ترین مشغلہ یہ تھا کہ شب و روز کا امتیاز کئے بغیر وہ ہتھیاروں سے لیس ہو کر شاہی محل سے نکلتا اور اپنے اوباش ساتھیوں کے ہمراہ کمزوروں کو نشانہ بنایا کرتا۔ جسے چاہتا نیزے سے چھید کر خاک میں ملا دیتا اور کسی راہ گیر کی شامت آجاتی تو شہزادہ تلوار کے ایک ہی وار سے اسے زمین پر لٹا دیتا۔ لوگ اس سے اتنے زیادہ دہشت زدہ ہوئے کہ وہ جس راہ سے گزرتا دور دور آدمیوں کا نشان نہ ملتا۔ وہ طلائے بے درماں کی صورت آبادی میں دندناتا پھرتا اور ویرانی اور سنسانی ہر قدم پر اس کی پیشوائی کو حاضر رہتی۔

باغ نظام کے باہر کالے چبوترے پر اوباشوں کا مجمع تھا اور سامنے کے میدان میں شہزادہ اپنے ہم نشینوں کے ساتھ چوگان بازی میں مشغول تھا۔ وہ اپنے مشکی رنگ کے گھوڑے پر پانچ بار کوشش کر چکا تھا لیکن نشانے کی لکڑی کو نیزے سے اٹھانے میں ناکام رہا تھا۔ چہرہ گرد و غبار اور ناکامی کے تکدر سے دھندلا گیا تھا۔ اس کے اوباش مصاحب تماشائی ناکامی کی صورت میں بھی داد دے کر حق نمک ادا کرنے میں مصروف تھے اور ہر بار یہی کہتے کہ اللہ نے چاہا تو حضور اس بار ضرور کامیاب ہوں گے! شہزادہ مسلسل ناکامیوں سے تنگ آ کے ستانے کی خاطر کالے چبوترے پر آن بیٹھا۔ تکان دور کر کے تھوڑی دیر بعد وہ پھر گھوڑے کی پشت پر جا بیٹھا اور نیزے کی نوک سے نشانے کی لکڑی اکھاڑنے میں مشغول ہو گیا۔ اس بار اسے مسلسل سات بار ناکامیاں اٹھانی پڑیں۔ آٹھویں بار اس نے پھر کوشش کی لیکن ناکام گھوڑا دوڑائے آگے بڑھتا چلا گیا۔ اسی وقت اس کے سامنے سے ایک نوجوان نے بھاگنے کی کوشش کی، وہ کہیں جا رہا تھا اور شہزادے کو سرپٹ گھوڑا بھگاتے دیکھا تو ایک طرف بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کی۔ شہزادے کے گالوں پر خوشی کی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے بھاگتے ہوئے نوجوان کا تعاقب کیا اور آخر لکڑی کے بجائے اس نوجوان کی پشت میں نیزا پیوست کر دیا۔ نوجوان چیخ مار کے گر گیا۔ شہزادے کے ہاتھ سے نیزا چھوٹ گیا اور اس کا توازن بگڑ گیا۔ کچھ نہ چلے وہ خود بھی گھوڑے سے گر گیا۔ مصاحبین آہ و واویلا کرتے دوڑ پڑے اور شہزادے کو ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ اسے کالے چبوترے پر لائے اور دوا سنگھا کے ہوش و حواس میں لانے کی کوشش کرنے لگے۔ کسی مصاحب نے خوشامدانہ کہا "شہزادے! مبارک ہو آٹھویں بار نشانہ صحیح بیٹھا!"

شہزادے کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا۔ آہستہ سے کہا۔ "تم لوگ میرے شکار کو میرے پاس لاؤ۔ میں اس خوش قسمت کی شکل دیکھنا چاہتا ہوں جس نے مجھے کامیاب اور کامران کیا!"

مصاحبین تیر کی طرح بھاگ کے اس زخمی کو بھی شہزادے کے پاس لے آئے۔ اس کی مسیں بھیگ چلی تھیں، خوبصورت اور غیر معمولی دلکشی کا مالک نوجوان جاں کنی کا عذاب جھیل رہا تھا۔ سخت دل شہزادے نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "تمھاری کوئی آخری خواہش؟"

دم توڑتے نوجوان نے اٹک اٹک کے بدقت تمام جواب دیا: "میں چنگیز خان کا بیٹا ہوں، وہ چنگیز خان جو کبھی بادشاہ کا مقرب خاص اور اس کے سیاہ و سفید کا مالک ہوا کرتا تھا اور جس نے بادشاہ کی رضا حاصل کرنے کی خاطر جانتے بوجھتے سقراط کی طرح زہر کا پیالہ پی کے خود کو ہلاک کر دیا تھا!"

"اچھا!" شہزادہ کھلکھلا کے ہنس دیا۔ "تمھارے باپ نے میرے باپ کی خاطر جان دے دی اور تم میری خوشنودی پر جان دے رہے ہو، خوب! اقبال مند بادشاہوں کے نمک خوار ایسے ہی ہوا کرتے ہیں؟" پھر ذرا رک کے پوچھا: "کوئی آخری خواہش؟"

جاں بہ لب نوجوان نے کراہتے ہوئے کہا: "پہلے اپنا نیزا تو میری پشت سے نکال لیں!"

شہزادے نے بڑی بڑی مونچھوں اور پچکے گالوں والے پستہ قامت مصاحب کو حکم دیا۔ "اس کا نیزا کھینچ کر نکال لیا جائے!"

مصاحب نے آگے بڑھ کے اوندھے منہ لیٹے ہوئے نوجوان کی پشت پر اپنا پیر رکھ کر دبایا اور دونوں ہاتھوں کا زور لگا کے نیزا کھینچ لیا۔ خون کا فوارہ چھوٹا اور ایک دلدوز چیخ سے میدان گونج گیا۔ نوجوان بے ہوش ہو گیا۔

شہزادے نے مصاحبین کو حکم دیا۔ "تھوڑی دیر بعد جب یہ مر جائے تو اس کی لاش اس کے گھر پہنچا دی جائے۔ اس کے بعد میں خود اس کے گھر جاؤں گا، اور اس کے ورثا کو کچھ دے دلا کے خوش کرنے کی کوشش کروں گا!"

پستہ قامت مصاحب نے نقد بیا کان میں سرگوشی سے عرض کیا۔ "حضور والا! یہ خاکسار مرنے والے کے ورثا سے خوب اچھی طرح واقف ہے، ان میں ایک ساحرہ بھی ہے، یعنی اس نوجوان کی بہن اس کے حسن کا بڑا چرچا ہے اگر حضور وہاں تشریف لے جائیں تو جیب میں مرد امیر کی ایک تسبیح ضرور لیتے جائیں اور حفیظ کا ورد فرماتے رہیں!"

شہزادے کے دل میں گدگدی سی ہوئی چیں بہ چیں ہو کے اوباشوں کے لہجے میں کہا۔ "یا حفیظ کا ورد میں کیوں کرنے لگا؟ اگر وہ ساحرہ ہے تو میں ساحر۔ نہ میں اس سے بچنا چاہتا ہوں اور نہ وہ مجھ سے بچ سکے گی۔"

شہزادہ دیراں حسین دوپہر تک اپنے اوباش مصاحبین کے جرغے میں ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ اس دوران شہزادے نے کسی راہ گیر کو شکار کیا کسی کے کاج کر لیے کسی کی ناک ناکارہ کر دی کسی کی

پشت میں بٹیرے کی اس مجبوری اور اپنی ہر حرکت پر زور زور سے قہقہے لگاتا رہا۔ ان قہقہوں میں مصاحبین بھی شریک رہتے۔ دوپہر کے کھانے میں مصاحبین بھی شریکِ طعام رہے۔ کھانے کے دوران ہی بادشاہ مرتضیٰ نظام کا مصاحبِ خاص صاحب خان حاضر ہوا اور ایک متکبرانہ شان سے کھڑا ہو گیا۔ شہزادے کے ایک مصاحب نے کنکھیوں سے صاحب خان کو دیکھا اور آہستہ سے شہزادے کو آگاہ کیا۔ "دال میں کچھ کالا ہے"

شہزادے نے نوالہ چباتے ہوئے سر اوپر اٹھایا اور صاحب خان سے پوچھا۔ "اس بے وقت حاضری کا مقصد؟"

صاحب خان نے مٹھی میں دبے ہوئے کاغذ کی جھلک دکھا کے عرض کیا۔ "غلام نے اسے بادشاہ تک نہیں پہنچنے دیا، اگر ایسا کرتا تو قیامت آجاتی اور بادشاہ حضور کے ساتھ معلوم نہیں کیا سلوک کرتے!"

چالاک شہزادہ سب کچھ سمجھ گیا، کھڑے ہوتے ہوئے مصاحبین سے کہا۔ "تم لوگ کھاتے رہو، مجھے صاحب خان سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں!"

مصاحبین نے قدرے جھجک کا اظہار کیا لیکن پھر کھانے میں مشغول ہو گئے۔ صاحب خان شہزادے کو ایک کونے میں لے گیا اور مٹھی کا کاغذ شہزادے کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "ناچیز نے اسے آگے نہیں جانے دیا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام؟"

شہزادے نے کاغذ پڑھا، یہ چنگیز خان کی بیوہ کا فریاد نامہ تھا جو جوان بیٹے کی موت پر بادشاہ کے نام شکایتاً لکھا گیا تھا۔ پورا خط پڑھ کے شہزادے نے اسے پھاڑ دیا اور کہا: "صاحب خان! میں احمد نگر کا ولی عہد ہوں اور ایک ولی عہد کو کیا اپنی رعایا کے جان و مال پر تصرف کا کوئی حق نہیں ہوتا؟"

صاحب خان نے جواب دیا۔ "بالکل ہوتا ہے لیکن حضور کو تو معلوم ہی ہے کہ بادشاہ سلامت عزلت نشین ہیں اور وہ معاملاتِ حکومت میں دخل نہیں دینا چاہتے!"

شہزادے نے پوچھا: "اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

صاحب خان نے جواب دیا: "کھائیں پئیں مست رہیں لیکن اس ناچیز کی عزت آبرو کا ضرور خیال رکھیں میں آخر کب تک اس قسم کی درخواستیں اور فریادیں بادشاہ تک نہ پہنچنے دوں گا!"

شہزادے نے صاحب خان کا مطلب سمجھ لیا اور جواب دیا: "میں مبلغ (رشوت) تمہارے پاس بھیجتا رہوں گا اور تم اس کی سفارش پر اپنی زبان تک تم بند ہی رکھنا!"

صاحب خان نے پہلی قسط اسی وقت وصول کی اور کہا: "حضور! اگر مناسب سمجھیں تو چنگیز خان کی بیوہ کے پاس ضرور چلے جائیں کیونکہ اگر اسے راضی رکھنے کی کوشش نہ کی گئی تو وہ کسی نہ کسی دن دوبارہ دعویٰ بادشاہ کی خدمت میں پہنچ جائے گی اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ بادشاہ سلامت کس مزاج کے آدمی ہیں!"

شہزادہ گھبرا گیا۔ پہلے اس کا ارادہ تھا کہ وہ مقتول کے گھر رات کی تاریکی میں جائے گا لیکن صاحب خان کی بات چیت کے بعد اس فیصلے کو بدلنا پڑا اور وہ مغرب سے پہلے ہی مقتول کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں ایک

کہرام برپا تھا۔ اس وقت تک مقتول کی تجہیز و تکفین ہو چکی تھی اور خاندان کے چند افراد کے سوا سبھی اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ شہزادے کو سامنے دیکھ کر سبھی ادب سے کھڑے ہو گئے۔ ان میں شہزادے کو ایک شکل شناسا سی نظر آئی۔ یہ فتحی شاہ مصاحب خاص بادشاہ تھا۔ نہایت حسین و جمیل، نہایت متناسب اور توانا ہوئے جسم کا مالک۔ شہزادے کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بادشاہ جن لوگوں پر بہت مہربان رہتا ہے ان میں فتحی شاہ کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ فتحی شاہ، شہزادے کو اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا گیا۔ یہی حال خود شہزادے کا تھا۔ اسے گمان گزرا کہ فتحی شاہ شاید مقتول کی ماں کی فریاد پر بادشاہ کا بھیجا ہوا وہاں پہنچا ہے۔ فتحی شاہ شہزادے کے آگے ذرا جھکا اور ادب سے عرض کیا: "یہ بہت اچھا ہوا جو حضور خود تشریف لے آئے۔ لوگ اس قتل کے سلسلے میں جو کچھ کہتے پھر رہے ہیں، اس خاکسار کو ان پر یقین نہیں آتا!"

شہزادے کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور اسے یقین سا ہو گیا کہ اس کی شکایت بادشاہ تک ضرور پہنچ چکی ہے۔ اس نے بناوٹی افسوس کا اظہار کیا۔

"میں مقتول کی ماں سے معافی مانگنے آیا ہوں اور یہ بتانے آیا ہوں کہ مجھ سے یہ جو کچھ بھی ہوا ہے غلطی سے ہوا ہے اور میں اپنی اس غلطی کا تاوان زندگی بھر چکاتے رہنے کا وعدہ کرتا ہوں!"

فتحی شاہ اندر کی طرف جاتا ہوا بولا: "یہ بات ہے تو آپ میرے ساتھ آئیے، بادشاہ اور شہزادوں سے پردہ نہیں کیا جاتا۔ یہی باتیں جو ابھی آپ نے مجھ سے کہی ہیں چل کر مقتول کی ماں سے کہہ دیں تو شاید اسے صبر آ جائے!"

یہ کسی معمولی شخص کا گھر نہیں تھا۔ چنگیز خان کا چھوٹا سا محل تھا۔ وہ چنگیز خان جو کبھی احمد نگر کا سب سے اہم شخص تھا اور جسے بادشاہ کے مزاج میں سب سے زیادہ رسوخ حاصل تھا۔ اندر رہائشی حصے کے اس پار ایک دلکش خوب صورت باغیچہ تھا۔ وہاں کے سبزے پر چاندنیاں بچھی تھیں اور ان چاندنیوں پر ادھر ادھر کئی گاؤ تکیے رکھے تھے۔ یہیں ایک حوض سے متصل بچھی ہوئی چاندنی پر مختلف عمروں کی چند خواتین گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھی تھیں۔ فتحی شاہ کا اندر چلے جانا یہ بتاتا تھا کہ اسے گھر میں بڑی بے تکلفی حاصل ہے۔ فتحی شاہ کے ساتھ ایک اجنبی نوجوان کو آتا دیکھ کر خواتین بے چینی سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور چادروں اور ہاتھوں سے اپنے چہرے چھپانے لگیں۔ چند اونچے اونچے درختوں کے پیچھے چلی گئیں اور ایک غمزدہ ادھیڑ عمر سے متجاوز خاتون اپنی جگہ پر ہی اوندھے منہ سجدے میں چلی گئیں۔

فتحی شاہ کے چہرے پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہو گئی۔ اس نے با آواز بلند خواتین کو مخاطب کیا: "معزز خواتین! شہزادے میراں حسین مقتول کی تعزیت کو تشریف لائے ہیں، ان سے پردہ بے سود ہے۔ براہ کرم اپنی اپنی جگہوں پر واپس تشریف لے آئیں۔"

سجدے میں گری ہوئی خاتون تلملا کر اٹھ بیٹھیں اور خونخوار نظروں سے شہزادے کو گھورا۔

دوسری خواتین بھی باری باری اپنی جگہوں پر واپس آ گئیں، شہزادے کی نظریں ان میں اس

سالمرہ کو تلاش کر رہی تھیں، جس کا وہ صبح سے ذکر سن رہا تھا۔ اسی وقت ایک شراب و شباب کا ڈھڑ تا مجسمہ غمزدہ خاتون کے پہلو میں جا بیٹھا۔ فتحی شاہ نے ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "شہزادے! یہ خاتون چنگیز کی بیوہ اور مقتول کی ماں ہیں۔" اور پھر پہلو میں بیٹھی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور یہ چنگیز خان کی بیٹی اور مقتول کی بہن مونسہ خاتون ہیں۔" پھر شہزادے سے جو بات چیت ہوئی تھی، اسے ان خواتین کے سامنے دہرا دیا۔ آخر میں کہا "شہزادے کو اس سانحہ کا دلی رنج ہے لیکن اب وہ کر بھی کیا سکتے ہیں، انہوں نے اس ناچیز سے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ زندگی بھر اپنی اس غلطی کا تاوان چکاتے رہیں گے۔"

ناراض اور غمزدہ خاتون غصے میں شہزادے کے قریب پہنچ گئیں اور بلک بلک کر رونے لگیں: "تمہاری حیثیت احمد نگر کی رعایا میں باپ جیسی ہے، کیا باپ اپنے بیٹوں کو اسی طرح قتل کر دیا کرتے ہیں؟"

لیکن مونسہ خاتون نے ماں کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا بولی: "ماں! اب اس ذکر کو بار بار چھیڑیے ختم کیجیے!"

ماں نے دونوں ہاتھوں سے چھاتی کوٹ ڈالی، میرے سینے میں آگ لگی ہے آخر یہ کس طرح بجھے؟ لوگو! میں لٹ گئی، میں تباہ ہو گئی، میں برباد ہو گئی مجھے صبر کس طرح آئے؟"

شہزادہ بے دھڑک مونسہ کے قریب پہنچ گیا، فتحی شاہ ہکا بکا رہ گیا۔ شہزادے نے بے تکلفی سے مونسہ کو مخاطب کیا "تم انہیں سمجھاؤ، میں اپنی غلطی پر نادم و شرمسار ہوں، میں زندگی بھر تم دونوں کا بوجھ اٹھانے کو تیار ہوں!"

مونسہ نے ٹوٹتے پھوٹتے لہجے اور آواز میں ماں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن انھیں جتنا سمجھایا جاتا، وہ اسی قدر تیز آواز میں رونا شروع کر دیتیں۔ شہزادے نے ہاتھ کے اشارے سے مونسہ کو حوض کے اس پار چلنے کی دعوت دی۔ وہ شہزادے کی بات ٹال نہیں سکتی تھی۔ حوض کی آڑ میں شہزادہ بے تکلفی سے گھاس پر بیٹھ گیا لیکن مونسہ سر جھکائے کھڑی رہی۔ شہزادے نے حسن و شباب کے اس شہ پارے کو للچائی نظروں سے دیکھا، مونسہ کا چہرہ اور زیادہ سرخ ہو گیا اور وحشت کے آثار زیادہ نمایاں ہونے لگے

شہزادے نے دل کی گہرائی سے آواز نکالی بولا "مونسہ جب میں اپنی غلطی پر نادم ہوں تو تمہاری والدہ مجھے معاف کیوں نہیں کر دیتیں؟"

مونسہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بدستور سر جھکائے کھڑی رہی۔ فتحی شاہ دور کھڑا رشک و حسد سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

شہزادے نے شوخی سے کہا "مونسہ اگر میں نے تمہیں پہلے دیکھ لیا ہوتا تو آج یہ خاندان اتنا سوگوار نہ ہوتا!"

مونسہ نے کہا: "قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے اور پھر کیا آپ نے ایسا قصداً کیا ہے ؟"

شہزادہ گھبرا گیا، بولا: "نہیں، ایسا تو نہیں بلکہ ۔ میرا مطلب یہ تھا کہ میں اسے اپنا بھائی بنا لیتا!"

مونسہ کچھ کہے بغیر جھپاک سے بھاگ کر ماں کے پاس پہنچ گئی۔ فتحی شاہ نے ایک سرسری نظر شہزادے پر ڈالی اور مونسہ کو دھیمے لیکن تلخ لہجے میں خبردار کیا: "مونسہ! احتیاط ۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں، تم اسے بغیر کہے ہی سمجھنے کی کوشش کرو، دیوانے باپ کا ناخلف بیٹا! میں سمجھتا ہوں تمہارے لیے یہ اشارہ کافی ہوگا؟"

مونسہ نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے کچھ سمجھاؤ مت ۔ کیا میں شہزادے کی باتوں میں خواہ مخواہ آجاؤں گی؟"

شہزادہ آہستہ آہستہ مونسہ کے قریب پہنچ گیا۔ ایک شانِ بے نیازی سے کہا: "اچھا تو اب میں واپس جاؤں گا اور وعدے کے مطابق اپنی غلطی کا تاوان زندگی بھر ادا کرتا رہوں گا۔!"

مونسہ نے آہستہ سے کہا۔ "شکریہ۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں، ہمارے لئے یہی اعزاز بہت کافی ہے کہ شہزادے محترم ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے اور اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا!"

"خوب! بہت خوب!!" شہزادے نے کہا، "مونسہ! تم نے مجھے ہر طرح متاثر کیا ہے۔ کیا تم مجھے دوبارہ حاضری کی اجازت دو گی؟"

مونسہ نے جواب دیا: "درست لیکن شہزادے کی جرأت کے آس پاس حکم احکام کی دیوار تو میں کھڑی کرنے سے رہی!"

مونسہ نے گھبرا کر فتحی شاہ کی طرف دیکھا۔ فتحی شاہ نے شہزادے کو دیکھ کر آنکھ کے اشارے سے مونسہ کو منع کیا کہ وہ انکار کر دے لیکن مونسہ اتنی ہمت نہیں کر سکی۔ مونسہ کی جگہ ماں کی آواز گونجی۔ "میں اپنے بیٹے کے قاتل کو اپنے گھر میں بار بار آنے کی اجازت ہرگز نہ دوں گی!"

فتحی شاہ کے چہرے پر شگفتگی آگئی لیکن شہزادہ جھنجھلا گیا۔ تحکمانہ کہا: "یہ احمد نگر ہے یہاں کی ہر شے میرے اقتدار اور تسلط میں ہے۔ پوچھ کر آنا جانا محض اخلاقی ضابطے کی بات تھی ورنہ احمد نگر میں کون ہے جو مجھے کہیں آنے جانے سے روکنے کی ہمت رکھتا ہو!"

غصے میں پیچ و تاب کھاتا ہوا شہزادہ وہاں سے چلا گیا۔ جاتے وقت اس نے پیروں کو اتنی زور زور سے زمین پر پٹکا کہ مقتول کی ماں کے سوا سبھی چونک گئے۔ فتحی شاہ نے مونسہ سے کہا: "شہزادے کا اس گھر میں داخلہ اچھی بات نہیں ہے!"

"بہرحال پھر بھی۔" فتحی شاہ نے بے بسی سے کہا۔ "دیوانے بادشاہ کی بے اعتدالی اولاد میں کہاں تک نہ آئے گی۔ اور میں بار بار یہی کہوں گا احتیاط، احتیاط اور احتیاط!"

مونسہ کا جادو چل چکا تھا اور یہ ایسا خاموش اور مست اثر جادو تھا کہ شہزادے کو اس کی شدت کا احساس گھنٹوں بعد ہوا۔ یہ اثر اس چوٹ کی طرح تھا جس کی تکلیف اور اذیت کا اندازہ فوراً ہی نہیں ہوتا بلکہ وقت اور ساعتیں گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے درد کی لہریں اپنی جگہ سے ابھر کر بتدریج پورے اعصاب جسمانی کو متاثر کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ مونسہ کے خیال میں نصف سے زیادہ رات گزار چکنے کے بعد معلوم نہیں کس طرح فتحی شاہ کا خیال آ گیا۔ اُسے فتحی شاہ کا کردار مشتبہ محسوس ہوتا تھا۔ ایسے مصاحبین بھی محل ہی کے ایک حصّے میں رہ رہے تھے رات کے سنّاٹے میں اسے اپنا پستہ قامت مصاحب یاد آیا، کچھ سوچ کر اس نے بستر چھوڑ دیا اور خنجر ہتھیار اور کمند لے کر محل سے باہر نکلا۔ ایک خدمت گار کے ذریعے اپنے پستہ قامت مصاحب کو طلب کیا اور اسے ساتھ لے کر مونسہ کے گھر چل دیا۔

پستہ قامت مصاحب نے تشویش سے کہا: حضور! چند سپاہی اپنے ساتھ اور لے لیں!"

شہزادے نے جواب دیا: "ابھی میں اس راز کو طشت از بام نہیں کرنا چاہتا!"

مصاحب نے رک رک کے اپنی بے چینی کا اظہار کیا: "اگر وہاں مزاحمت کا سامنا ہو تو دو آدمی اس کا کس طرح مقابلہ کریں گے؟"

شہزادے نے جواب دیا: "ابھی اس جانِ عاشقاں کے پاس مردانہ وار جانے کا وقت نہیں آیا۔ پہلے میں اس سے اپنے تعلقات استوار کرنا چاہتا ہوں، اس کے بعد کوئی اور اقدام!"

سنسان اور خاموش فضا کو کتّوں کے بھونکنے اور گیدڑوں کے رونے کی آوازیں تہ و بالا کر رہی تھیں یہ دونوں تاروں کی مدھم روشنی میں نظروں سے غیر معمولی کام لیتے ہوئے مونسہ کے مکان تک پہنچ گئے۔ مکان کی عقبی دیواریں ذرا نیچی تھیں اور اسی حصّے میں وہ باغیچہ تھا جہاں شہزادہ کی مونسہ کے خاندان والوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ شہزادہ اپنے مصاحب کے ساتھ کمندوں کے ذریعے باغیچے میں اتر گیا اس نے اپنے پستہ قامت مصاحب کو ایک ناریل کے درخت کی جڑ میں بٹھا دیا، اس درخت سے ذرا آگے مہندی کی گھنی جھاڑی تھی۔ شہزادے نے کہا: "تم میری تالیوں پر گوش بر آواز رہنا!"

پستہ قامت خوف زدہ مصاحب نے ذرا اکتاہٹ سے کہا: "اگر بندہ حضور کی جگہ ہوتا تو یہاں اس طرح ہر گز نہ آتا بلکہ دو چار سو جاں نثاروں کو بھیج کر گوہرِ مقصود اٹھوا لیتا!"

شہزادے نے ہنس کر کہا: "ہاں ایسا کرنا میرے لئے بہت آسان تھا لیکن اس میں وہ لذت کہاں جو میں مونسہ کو اپنے دست و بازو سے حاصل کر کے پاؤں گا!"

شہزادہ اپنے مصاحب کو وہیں چھوڑ کے کسی مزاحمت کے بغیر کمند کے ذریعے مکان کی چھت پر پہنچ گیا اور دبے قدموں صحن میں اتر گیا، یہاں اسے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اُسے کس کمرے تک پہنچنا ہے اور مونسہ کس کمرے میں ہو سکتی ہے؟ کئی کمروں کی کھڑکیوں سے اندر جلتے ہوئے چراغوں اور شمعوں کی روشنی چھن چھن کے صحن میں آ رہی تھی۔ شہزادے کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے احتیاطاً خنجر ہاتھ میں لے لیا۔ ابھی یہ

لپنے پیچھے اس نے دیوار سے زمین پر کسی چیز کے گرنے کی آواز محسوس کی گھبرا کے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک موٹا سفید بلا اس کی ٹانگوں کے بیچ سے گزر کر ایک کمرے میں گھس گیا۔ چالاک شہزادے نے اندازہ لگایا کہ یہ بلا یقیناً مونسہ کا ہو گا اور یہ مونسہ کے کمرے ہی میں داخل ہوا ہو گا۔ یہ پنجوں کے بل چل کے اس کمرے کی کھڑکی کے ایک طرف کھڑا ہو کے دروازے سے اندر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اندر ایک تخت پر مونسہ کی ماں ایک بڑی سی موم شمع کی روشنی میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔ اس سے ذرا دور ایک مسہری پر کوئی سو رہا تھا جو مونسہ کے علاوہ کوئی اور نہ ہو سکتا تھا۔ شہزادے کا ادباش ذہن طرح طرح کے منصوبے بنانے لگا۔ کبھی سوچتا وہ اچانک اندر داخل ہو جائے اور خنجر کے پے در پے وار کر کے اس عورت کا کام تمام کر دے لیکن پھر اس کے نتائج سوچتا کہ اس طرح مونسہ کی محبت کے بجائے نفرت ہی حاصل کر سکے گا۔ مونسہ کے بھائی اور ماں کا قاتل اس کی محبت کا مستحق کس طرح قرار پا سکتا تھا۔ کافی غور و فکر کے بعد اس نے مفاہمانہ روش اختیار کی اور اس نے اس عورت سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سوچا اس بڑے گھر میں یہ دونوں تنہا تو نہ رہتی ہوں گی۔ اس نے دبے قدموں چل پھر کے دوسرے کمروں کا بھی جائزہ لیا۔ ان میں سے بعض بند تھے اور تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کمروں کے مقابل ذرا فاصلے پر وہ بیٹھک تھی جس سے گزر کر وہ دن میں اندر داخل ہوا تھا۔ اس نے سوچا شاید اسی بیٹھک کے کسی حصے میں وہ شخص رہتا ہو گا جس کے ذمے اس گھر کی چوکیداری ہو گی۔ اس خیال کے ساتھ ہی ذہن نے پورا منصوبہ تیار کر دیا۔ انسانی زندگی شہزادے کی نظر میں کوئی خاص قیمت نہ رکھتی تھی۔ وہ چپ چاپ سوتے ہوئے چوکیدار کے سر پر پہنچ گیا اور اس کے سینے میں پوری قوت سے خنجر اتار دیا۔ خوفناک چیخ نے رات کے سناٹے کو لرزا دیا۔ شہزادے نے پے در پے حملوں سے چوکیدار کا کام تمام کر دیا۔ اس کی چیخوں نے خاتون کو چونکا کر دیا اور وہ خنجر لے کر مردانہ وار چوکیدار کی کوٹھری کی طرف دوڑ پڑی۔ مرحوم نے تیل کا دیا جھلملا جھلملا کے کوٹھری کو روشن کئے ہوئے تھا۔ شہزادہ کوٹھری سے نکل کے اس کے برابر بنے ہوئے غسل خانے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ نڈر خاتون خنجر لئے ہوئے چوکیدار کے کمرے میں داخل ہو گئی اس کے پیچھے ہی نہایت پھرتی سے شہزادہ بھی اندر داخل ہو گیا اور اس نے خاتون کی کلائی مروڑ کے خنجر چھین لیا اور دوسرے ہی لمحے اس نے کوٹھری کو اندر سے بند کر دیا۔ خاتون نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کے کہا۔

”شہزادے یہ تم؟“

شہزادے نے جواب دیا: ”ہاں یہ میں ہوں اور میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ شور و غل مت کرنا۔ میں تم سے چند باتیں کر کے واپس چلا جاؤں گا۔“

خاتون نے شہزادے کو غصے اور نفرت سے گھور کر لہولہان مردہ چوکیدار کو دیکھتے ہوئے سوال کیا ”اسے کس نے ہلاک کیا؟“

شہزادے نے مسکرا کر جواب دیا: ”میں نے، اور صرف اس لئے کہ اگر میں ایسا نہ کرتا تو چوکیدار کی چیخ کے بغیر تم یہاں تک تنہا اور بے اختیار ہرگز نہ آتیں۔“

خاتون نے جوش میں آگے بڑھ کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن شہزادے نے اسے روک لیا۔

بولا: "خاتون! میں اگر چاہوں تو تمھاری لڑکی مونسہ کو زبردستی اپنے حرم میں ڈال سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کرنا چاہتا!"

خاتون نے ضدی لہجے میں کہا: "لیکن میں نے بھی یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے بیٹے کے قاتل کے ہاتھ میں مونسہ کا ہاتھ ہرگز نہ دوں گی۔"

شہزادے نے بے زاری سے کہا: "ارے اس فضول منحوس مقتول کا ذکر بار بار کر کے تم میری دل آزاری کیوں کرتی ہو؟"

خاتون نے کچھ سوچ کے نرم رویہ اختیار کیا، بولیں: "اچھا یہاں سے تو نکلو اور کمرے میں چلو، وہیں باتیں کی جائیں گی؟"

شہزادہ بے اختیار ہنس دیا، بولا: "گویا میں اتنا بے وقوف انسان ہوں کہ قابو میں آئی ہوئی شیرنی کو یوں آسانی سے رہا کر دوں گا!" پھر پوچھا: "یہاں اور کون کون رہتا ہے؟"

خاتون نے نفرت سے جواب دیا: "پتہ نہیں!"

شہزادے نے کہا: "اتنے بڑے گھر میں کسی مرد کے بغیر رہنا عقل مندی تو نہیں!"

خاتون نے دل جلے لہجے میں جواب دیا: "عقلمندی کمزور کے پاس ہوتی ہی کہاں ہے، یہ تو بادشاہوں اور شہزادوں کے پاس ہوتی ہے، تم حکمراں لوگ جو چاہتے ہو طاقت کے ذریعے حاصل کر لیتے ہو اور ہم کمزور لوگ عقل کی تہمت رکھنے کے باوجود مجبور اور بے بس رہتے ہیں!"

شہزادے نے کہا: "میں ایک اور جوا کھیلوں گا!" اس کے بعد خاموش رہ کے باہر کی سن گن لینے لگا۔ وہاں بالکل سناٹا تھا، باہر سے مطمئن ہو کے شہزادے نے کہا: "غالباً چوکیدار کی چیخ دوسروں کے کانوں تک نہیں پہنچی!"

اس کے بعد شہزادہ پھرتی سے باہر نکلا اور کوٹھری باہر سے بند کر کے زنجیر لگادی۔ بولا: "خاتون تم یہیں رہو اور میری واپسی کا انتظار کرو!"

شہزادے نے اس کے بعد مونسہ کے کمرے کو باہر سے بند کر دیا۔ اور اس طرح باری باری تمام کمرے باہر سے بند کرتا گیا اور دوبارہ مونسہ کے کمرے کو کھول کے اندر داخل ہو گیا۔ یہاں قرآن کھلا ہوا رکھا تھا اور مونسہ ابھی بھی بدستور گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی، شہزادے نے واپس جا کے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا اور دوبارہ پھر مونسہ کے قریب جا کھڑا ہوا۔ دوپٹے سے بے نیاز سینہ سانسوں کے مدوجزر میں مبتلا تھا۔ سیاہ زلفوں کی چند الجھی الجھی لٹیں آنکھوں سے گزر کے رخساروں سے ہوتی ہوئی سینے تک آگئی تھیں۔ اس کا ایک ہاتھ پیٹ پر رکھا تھا اور دوسرا پہلو میں پڑا تھا۔ شہزادہ کچھ دیر محویت سے مونسہ کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے بالوں کی ایک لٹ مٹھی میں لے کر ناک سے لگالی اور سانسیں اوپر کھینچ کر سونگھنے لگا۔ پھر بے چینیوں میں اضافہ ہوا اور دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ ضبط و احتیاط نے جواب دے دیا اور

اس نے بے اختیار مونسہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے چومنے لگا۔ مونسہ چونک کے بیدار ہوگئی اور تھوڑی دیر تک مبہوت سی اس شہزادے اور کمرے کو کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں دیکھتی رہی، اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا دیکھ رہی ہے۔ موم شمع کی روشنی صبح کے ابھرتے سورج کی شعاع محسوس ہو رہی تھی لیکن دفعتہ دفعتہ حواس نے کام کرنا شروع کر دیا اور اس نے شہزادے کو پہچان لیا۔ وہ گھبرا کے مسہری پر بیٹھ گئی اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئی کہ اسے اغوا کر کے شہزادے کی خلوت گاہ میں پہنچا دیا گیا ہے۔ اس نے دونوں گھٹنوں میں سینہ چھپا لیا اور دونوں ہاتھ گھٹنوں کی گرفت میں لے کر ایک دوسرے میں پیوست کر لیے۔ اس نے گھبرا کے پوچھا: "میں کہاں ہوں؟"

شہزادے نے مسکرا کے جواب دیا: "اپنے کمرے میں!"

"تم کہاں ہو؟"

"تمھارے کمرے میں!"

مونسہ حیران پریشان اِدھر اُدھر اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ شہزادے نے کہا: "اپنی ماں کو دیکھ رہی ہو؟ افسوس کہ وہ ابھی یہاں نہیں آئیں گی۔ خود انھوں نے مجھے تمھارے پاس بھیجا ہے!"

مونسہ کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے اور زیادہ سمٹنے کی کوشش کی، شہزادہ مسہری کے پاس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ مونسہ نے پیر اور زیادہ سمیٹ لیے۔ خوف زدہ لہجے میں پوچھا: "لیکن اس وقت تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟"

شہزادے نے جواب دیا: "صرف یہ جتانے کہ میں محض شہزادہ ہی نہیں ہوں، میں یہاں تک صرف اپنی جرأت اور فراست سے پہنچا ہوں۔ اب تمھیں اور تمھاری ماں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ میں تمھیں جب بھی چاہوں گا اپنے ساتھ لے جاؤں گا مونسہ! میں ذرا اہم جو واقع ہوا ہوں اور اپنی جرأت سے بڑی مشکل پر اپنی ذہانت اور حوصلے سے قابو پانے میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔"

مونسہ نے پھر پوچھا: "ماں کہاں ہیں؟"

شہزادے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور سرشار لہجے میں کہا: "اس بوڑھی عورت کا بار بار نام لے کر میرے عاشقانہ جذبات کو سرد کرنے کی کوشش نہ کرو مونسہ تم مجھ سے محبت کی باتیں کرو، پیار اور محبت کی باتیں، محبت سے کچھ عہد و پیمان لینے آیا ہوں مونسہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں، میں تم پر اپنا سب کچھ نثار کر دینے کا عہد کرنے کو تیار ہوں؟"

مونسہ نے عاجز آتے ہوئے لہجے میں کہا: "خدا کے لیے اس وقت تم یہاں سے چلے جاؤ اور دن کی روشنی میں آ کے باتیں کرو، میرا دل اُڑا جا رہا ہے۔"

شہزادے نے اس کا ہاتھ ہونٹوں سے لگا لیا اور سرشاری سے بوسہ دے کر بولا: "پہلے وعدہ کرو کہ تم مجھ سے شادی کرو گی!"

مونسہ نے کہا۔ لیکن تمہاری شادی تو بیجاپور کے حکمراں ابراہیم عادل شاہ کی بہن سے ہو چکی ہے!"

شہزادے نے جواب دیا: "ہاں ہو تو چکی ہے لیکن میری دلہن ابھی میرے پاس نہیں پہنچی۔ رخصتی کی رسم معلوم نہیں کب تک ادا کی جائے!"

مونسہ نے عاجزی سے کہا: "شہزادے! خدا کے لئے تم میرا خیال اپنے دل سے نکال دو۔ بیجاپور کے حکمراں کی بہن اور میرا کوئی مقابلہ نہیں، اس کے مقابلے میں، میں خود کو ہمیشہ حقیر اور کمتر محسوس کرتی رہوں گی!"

شہزادے نے جواب دیا: "میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں ایک دوسرے محل میں رکھوں گا!"

مونسہ نے بے بسی سے کہا: "اچھا۔ لیکن اس وقت تو یہاں سے چلے جاؤ!"

شہزادے نے شرارت آمیز انداز میں کہا: "لیکن تم وعدہ تو کرو کہ تم میری محبت کا جواب محبت سے دو گی!"

مونسہ نے کہا: "محبت جبر اور زبردستی سے نہیں کرائی جاتی!"

شہزادے نے جھپٹ کر مونسہ کو آغوش میں لے لیا اور زبردستی بوس و کنار کرتا ہوا بولا: "ظاہر ہے مجھے یہاں سے جانا تو پڑے گا لیکن جانے سے پہلے میں تمہیں کسی اور کے لائق نہیں چھوڑوں گا۔ میں محرومی کا قائل نہیں ہوں، اپنی نامرادی اور ناآسودگی کی راہ میں حائل ہونے والی ہر چھوٹی سے بڑی رکاوٹ جبر و طاقت سے دور کر دینے کا قائل ہوں!"

مونسہ نے شہزادے کے چنگل سے بچنے کے لئے ہاتھ پیر مارنے شروع کر دیئے۔ اس نے ناخنوں سے شہزادے کا منہ نوچنا شروع کر دیا۔ شہزادے نے منہ بچا لیا۔ اس نے شہزادے کے ہاتھ میں کاٹ لیا۔ شہزادے کی گرفت ڈھیلی پڑی اور مونسہ نے بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن شہزادے نے پھر پکڑ لیا۔ ہانپتا ہوا بولا: "اب تو میں تمہیں کسی قیمت پر بھی نہ بخشوں گا!"

مونسہ دونوں ہاتھوں سے شہزادے کے سینے پر ضربیں لگانے لگی!"

ابھی دونوں میں یہ مقابلہ جاری تھا کہ مونسہ کا سفید بلا شہزادے پر جھپٹا اور اسے لہولہان کر دیا!

شہزادے نے خنجر ہاتھ میں لے لیا اور بلے کو مار دینے کی کوشش کی لیکن وہ اچھل کے کھڑکی پر چڑھ گیا اور وہاں سے جست لگانے کی حالت قائم کرنے لگا۔ شہزادے کو معلوم تھا کہ بلے کا اس قسم کا حملہ ہمیشہ خطرناک ہوا کرتا ہے، وہ گھبرا کے کمرے سے باہر نکل گیا مونسہ نے موقع غنیمت جانا اور کمرے کو فوراً ہی اندر سے بند کر لیا۔

شہزادہ غصے میں بھرا دروازے کو پیٹتا رہا اور مونسہ کو برا بھلا کہتا رہا۔ اس نے کہا۔

"مونسہ! تم یہ نہ سمجھو کہ اندر سے دروازہ بند کر کے تم مجھ سے محفوظ رہو گی، پہلے میں تمہیں اپنی دلہن بنانا چاہتا تھا لیکن اب میں تمہیں کنیز بنا کے رکھوں گا۔ میں ایک ضدی اور سرکش انسان ہوں اور مجھے نفرت

اور غصّے سے رام نہیں کیا جا سکتا!"

یہ کہتے کہتے اس نے کئی لاتیں دروازے پر رسید کیں اور جب یہ محسوس کیا کہ اب مونسہ تک پہنچنا ناممکن ہے تو غصّے میں خنجر ہاتھ میں لے کے چوکیدار کی کوٹھری کی طرف جاتا ہوا بولا "مونسہ! میں تیری ماں کو قتل کر دوں گا لیکن اگر تو کمرے کا دروازہ کھول دے گی تو اسے معاف کر دیا جائے گا!"

لیکن مونسہ نے دروازہ نہیں کھولا۔

شہزادے نے چوکیدار کے دروازے پر پہنچ کے سیدھے ہاتھ سے خنجر پکڑا اور بائیں ہاتھ سے نہایت آہستہ سے کوٹھری کی زنجیر کھولی اور مونسہ کی ماں پر حملہ کرنے کی غرض سے دیوانہ وار کوٹھری میں داخل ہو گیا لیکن وہاں مونسہ کی ماں نہیں نظر آئی وہ گھبراہٹ اور وحشت میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کوٹھری کے ایک گوشے میں مونسہ کی ماں خون میں تر بتر پڑی ہوئی تھی، اس نے اپنا خنجر پیٹ میں اتار کے خود کو ہلاک کر لیا تھا! اِدھر بھی ناکامی ہوئی تھی، مایوسی اور محرومی سے آپے جھنجھی، وہ غصّے میں مردہ خاتون کی طرف بڑھا اور خنجر کے پے در پے حملوں سے اس کا جسم چھلنی کر دیا! اور کوٹھری سے نکل کے وہ ایک بار پھر مونسہ کے کمرے کی طرف بڑھا۔ کمرہ بدستور بند تھا۔ اس نے دروازے سے منہ لگا کے کہا "مونسہ! میں نے تیری ماں کو قتل کر دیا، وہ سسک رہی ہے، اگر تو اس کی آخری آواز سننا چاہتی ہے تو کمرے سے باہر نکل اور اس کے سسکتے کراہتے نیم مردہ جسم کے قریب کھڑے ہو کے چند باتیں کر لے!"

مونسہ نے بھرائی آواز میں کہا "اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اس طرح دروازہ کھلوا لو تو تمھیں ناکامی ہو گی۔ ظلم کی ناؤ ہمیشہ نہیں بہتی، میں اپنا معاملہ خدا پر چھوڑتی ہوں، آخری فیصلہ وہی کرے گا!"

شہزادہ تلملایا ہوا اٹھا، چیخ کر کہا "اگر تم نے میرا حکم نہ مانا تو تمھیں عبرت ناک حالت سے گزرنا پڑے گا میں صبح ہوتے ہی تمھارے مکان کو خاک میں ملا دوں گا اور تمھیں اپنے مصاحبین کے حوالے کر کے وہ مظاہرہ کراؤں گا کہ تم اس کا قبل از وقت تصور تک نہ کر سکو گی!"

مونسہ نے اندر سے چیخ کر جواب دیا "ایسا وقت جب آئے گا تو میں خودکشی کر چکی ہوں گی!"

شہزادے کا اب مزید ٹھہرنا کسی طرح بھی مناسب نہ تھا! وہ جس راستے سے اندر داخل ہوا تھا! اسی سے عقبی باغیچے میں واپس گیا اور اپنے پستہ قامت مصاحب کی تلاش میں ناریل کے درخت کے نیچے پہنچا لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ یہ اس کی تلاش میں مہندی کی جھاڑی میں داخل ہوا اور اس طرح خاصی دیر تلاش میں لگا رہا لیکن پستہ قامت مصاحب کا کہیں پتہ نہ تھا۔ یہ ابھی اپنے مصاحب کی تلاش میں تگ و دو ہی کر رہا تھا کہ مکان کا باغیچہ کی طرف کھلنے والا دروازہ کھل گیا اور اندر سے بارہ تیرہ آدمی نمودار ہوئے ان میں سے چند مشعلیں لئے ہوئے تھے مشعلوں کی روشنی میں آنے والوں کا اسلحہ چمک رہا تھا۔ شہزادے نے گھبراہٹ میں دیوار پر چڑھنا چاہا لیکن نیچے سبزے پر گر گیا۔ اتنی دیر میں یہ لوگ دوڑ کر شہزادے کے سر پر پہنچ گئے۔ ان میں سے کسی ایک نے شہزادے کو حکم دیا "بس شہزادے! بھاگنے کی کوشش نہ کریں، ورنہ نقصان اٹھائیں گے میں آپ سے چند حتمی اور فیصلہ کن باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

شہزادے میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان بارہ تیرہ مسلح افراد کا تنہا مقابلہ کرتا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا جس آواز نے اسے مخاطب کیا تھا وہ پہنچانی ہوئی لگتی تھی) وہ مجرم کی طرح ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ایک مشعل بردار نے اپنی مشعل کی روشنی شہزادے کے چہرے پر ڈالی۔ اس شناسا آواز نے شہزادے کو مخاطب کیا: "شہزادے! ادھر آیئے ہم سب سبزے پر بیٹھ کر باتیں کریں گے!"

اب شہزادہ اس شخص کو پہنچان چکا تھا۔ یہ فتحی شاہ تھا۔ شہزادے کو ذرا قرار آیا اور فتحی شاہ کی ایما پر سبزے پر بیٹھ گیا۔ ان دونوں کے چاروں طرف مسلح افراد بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر تک گہرا سکوت چھایا رہا غالباً دونوں ہی گفتگو کا آغاز خود نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آخر کار فتحی شاہ نے سکوت توڑ دیا۔ بولا: "شہزادے! یہ علاقہ آپ کا ہے، یہاں آپ کے والد کی حکومت ہے، کیا ہم آپ سے پوچھ سکتے ہیں کہ ایک مالک و مختار اور حکمراں شہزادے کو اس مکان میں چوروں کی طرح داخلے پر کس جذبے نے مجبور کیا؟ کس ضرورت نے رات کی تاریکی میں شہزادے کو اس گھر میں داخلے پر مجبور کر دیا؟"

شہزادے کے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب نہ تھا۔ وہ خاموش رہا

فتحی شاہ نے جواب کے لئے اصرار بھی نہیں کیا بلکہ دوسرا سوال بھی کر دیا: "احمد نگر کے تاج و تخت کا وارث کون ہے؟"

شہزادے نے جواب دیا: "میں اور صرف میں، لیکن کیوں؟"

فتحی شاہ نے جھنجھلا کر کہا: "اگر احمد نگر کے تاج و تخت کے واقعی آپ ہی وارث ہیں تو آپ کا کردار بھی شاہانہ ہونا چاہئے، اوباشوں کی صحبت ترک کیجئے اور شرفا کی صحبت اختیار کیجئے!"

شہزادے نے خفگی سے کہا: "تم میرے مصاحبین کو اوباش مت کہو، وہ سب کے سب شریف ہیں!"

فتحی شاہ نے بے نیازی سے جواب دیا: "ہوں گے لیکن ان کی صحبت کا جو رنگ آپ پر چڑھا ہے اس سے وہ شریف تو نہیں لگتے، درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اور کوئی شخص اپنے دوستوں سے!"

شہزادے نے اکتاہٹ سے کہا: "میں محل واپس جانا چاہتا ہوں، تمہیں مجھ سے جو باتیں بھی کرنا ہیں فوراً کر ڈالو، میں لمبی چوڑی تمہید کے بجائے مطلب کی باتیں سننا چاہتا ہوں!"

فتحی شاہ نے آزردگی سے کہا: "شہزادے! ذرا سوچئے تو آپ کی نادانیاں اور بچپن کیسے کیسے ستم ڈھا رہے ہیں، خوف زدہ اور ستم رسیدہ لوگ برملا شکایت تک نہیں کر سکتے۔ آپ نے چنگیز خان کے نوجوان بیٹے کو ہلاک کر دیا اور تھوڑی دیر پہلے چوکیدار اور چنگیز خان کی بیوہ کو بھی قتل کر دیا۔ آخر ایسا آپ کیوں کر رہے ہیں، آپ کیا چاہتے ہیں، آپ کیا چاہتے ہیں؟"

شہزادے نے خاتون کے قتل سے بے تعلقی کا اعلان کیا۔ کہا: "خاتون کو میں نے نہیں قتل کیا انہوں نے خودکشی کی ہے!"

فتحی شاہ نے افسوس سے کہا: "ان کا خنجر کی ضربات سے داغ دار جسم خود کشی سے بسات کا اعلان کر رہا ہے!"

شہزادہ زیادہ دیر گفتگو کرنے پر آمادہ ہی نہ تھا، بولا: "میں جانا چاہتا ہوں!"

فتحی شاہ نے احترام سے جواب دیا: "آپ جانا چاہیں گے تو کس میں اتنی طاقت ہے جو روک لے لیکن جانے سے پہلے چند بنیادی باتوں پر سمجھوتہ کر لیا جائے تو بہتر ہے!"

شہزادہ فتحی شاہ کی صورت دیکھنے لگا۔ فتحی شاہ سوگوار انداز میں کہنے لگا: "شاید آپ مونسہ کو پسند فرمانے لگے ہیں، بعض اوقات انسان کا حسن اس کے لئے وبالِ جان بن جاتا ہے، یہی معاملہ مونسہ کے ساتھ بھی پیش آیا، وہ حسین ہے، غیر معمولی حسین اور جو شخص بھی اسے ایک نظر دیکھے گا، دل و جان سے عاشق ہو جائے گا۔ ہم آپ سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتے، جب ہم نے پہلی بار مونسہ کو دیکھا تھا تو پہلی ہی نظر میں اس کے اسیر ہو گئے تھے۔ چنگیز خان کی موت کے بعد ہم نے اس چھوٹے سے کنبے کو سہارا دیا اور شاید ہمارے اسی سلوک نے مونسہ کو بھی ہماری جانب ملتفت کر دیا۔ ہم یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے کہ مونسہ ہم سے محبت کرتی ہے لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ وہ ہمارا بڑا خیال رکھتی ہے!"

شہزادہ گفتگو کے اس موڑ میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا۔ فتحی شاہ کہتا رہا: "پھر ایک دن پہلے ایک نہایت خوشگوار اور المناک موقع پر آپ نے بھی مونسہ کو دیکھ لیا اور ہمارا خیال ہے کہ ہماری طرح آپ بھی اپنا دل ہار بیٹھے اور اسی اضطراب اور بے چینی میں آپ سے یہ سارے افسوسناک افعال سرزد ہوتے رہے!"

فتحی شاہ کے ساتھی گونگوں کی طرح باتیں سُن تو رہے تھے لیکن شہزادے کا رعب انھیں خاموش رہنے پر مجبور کئے ہوئے تھا۔

شہزادے کو بھاگ نکلنے کی فکر پریشان کئے ہوئے تھی کہ اچانک فتحی شاہ نے سوال کیا: "اچھا شہزادے صاحب! آپ یہ بتائیں کہ کیا آپ مونسہ سے واقعی عشق فرماتے ہیں؟"

شہزادے نے جواب دیا: "کیا چوروں کی طرح آدھی رات گئے اس جگہ میرا آنا یہ بات نہیں ظاہر کرتا کہ میں مونسہ سے واقعی عشق کرتا ہوں!"

فتحی شاہ نے کہا: "عشق تو ہم بھی کرتے ہیں لیکن اس طرح چوروں کے انداز میں ہم اس گھر میں ایک بار بھی داخل نہیں ہوئے!"

شہزادے نے بے غیرتی سے جواب دیا: "اپنے اپنے ظرف اور حوصلے کی بات ہوتی ہے!"

فتحی شاہ نے پوچھا: "کیا آپ مونسہ سے شادی کرنے پر آمادہ ہیں؟"

شہزادے نے جواب دیا: "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ میں واقعی اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں!"

فتحی شاہ نے کہا: "جس لڑکی کے دل کو آپ فتح کرنا چاہتے ہیں اب وہ کس طرح آپ سے محبت کرے گی؟ ہماری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا!"

شہزادے نے بعجلت جواب دیا۔ "جناب! میں تو یہ فیصلہ کر چکا ہوں کہ مونسہ کو حاصل کر کے ہی دم لوں گا آگے خدا کی مرضی! میں ایک مجبور اور محروم شخص کہلانا ہرگز پسند نہیں کرتا۔"

فتحی شاہ ایک دم اداس ہو گیا، کہنے لگا: "لیکن ہم آپ کو یہ مشورہ دیں گے کہ آپ مونسہ کے چکر میں نہ پڑیں۔ آپ کی بیجاپور کے فرماں روا کی بہن سے شادی ہو چکی ہے، اس کے علاوہ اور بہت سی حسین و جمیل لڑکیاں بھی آپ کے ایک اشارے پر بھیجی جا سکتی ہیں کیا یہ اچھا مشورہ نہیں ہے کہ مونسہ کو آپ اپنے اس غلام کو بخش دیں؟"

شہزادہ ایک دم چراغ پا ہو گیا، بولا "میں یہ فضول باتیں نہیں سننا چاہتا میں مونسہ کو پسند کرتا ہوں اس لئے کسی کمتر درجے کے نمک خوار کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مونسہ کا اپنے دل میں خیال تک لائے!"

فتحی شاہ نے ہمت سے کام لیا، "یہ دل کا معاملہ ہے ہم چاہتے تھے یہ پیچیدہ مسئلہ آپ کی گفت و شنید سے طے پا جائے تو اچھا ہے لیکن اگر شہزادے کی یہ خواہش ہے کہ وہ ہمارے دل کا خون کر دیں اور لذت حاصل کریں تو کوئی بھی صاحب دل کسی کو بھی یہ جارحانہ اجازت نہیں دے گا!"

شہزادہ اندر ہی اندر انتقام کی آگ میں جل رہا تھا، بولا: "بکواس بند کرو اور مجھے جانے دو!"

فتحی شاہ اٹھ کھڑا ہوا بولا بسم اللہ آپ تشریف لے جا سکتے ہیں!"

شہزادہ کھڑا ہو گیا اور دیوار کی طرف بڑھا فتحی شاہ نے کہا: "نہیں شہزادے آپ اس عقبی دیوار سے پھلانگ کر کیوں تشریف لے جائیں آپ باقاعدہ مکان کے اس راستے سے واپس جائیں جس سے کبھی آتے جاتے رہتے ہیں!"

وہ شہزادے کو لے کر مکان میں داخل ہوا اور مکان سے باہر کی بیٹھک کی طرف بڑھا جب وہ چوکیدار کی کوٹھری کے پاس سے گذر رہا تھا تو کوٹھری کے اندر سے مونسہ کے بین کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ شہزادے کو بری طرح کوس رہی تھی شہزادہ ذرا اٹھٹکا تو فتحی شاہ نے بے مروتی سے کہا: "آپ رکیے نہیں، چپ چاپ باہر تشریف لے جائیں ورنہ ڈر ہے کہ آپ کا یہ غلام بے اختیاری میں کوئی گستاخی کر بیٹھے۔"

فتحی شاہ کے خطرناک تیور نے شہزادے کو خوف زدہ کر دیا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔ فتحی شاہ شہزادے کو باہر چھوڑ کے اندر مونسہ کے پاس پہنچا، مونسہ اس سے چمٹ گئی روتی ہوئی بولی۔ "فتحی انتقام، انتقام۔"

فتحی شاہ نے اس کی پشت تھپتھپائی اور بھرائی آواز میں کہا، "مونسہ صبر، صبر، ذرا صبر!"

اور پھر دونوں ہی پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے۔

کئی دن تک سکوت چھایا رہا۔ شہزادہ، فتحی شاہ سے ڈرتا تھا کیونکہ فتحی شاہ اس کے باپ مرتضیٰ نظام شاہ کا نہایت قریبی مصاحب تھا اور وہ جو کام بھی چاہتا تھا بادشاہ سے کرا لیتا تھا۔ شہزادے کو خوب اچھی طرح یہ معلوم تھا کہ فتحی شاہ جب بھی چاہے دیوانے بادشاہ سے اس کے خلاف فرمان حاصل کر لے۔ دوسری طرف فتحی شاہ بھی اپنی قدر و قیمت سے خوب اچھی طرح واقف تھا۔ وہ بادشاہ سے شہزادے کی شکایت کر کے بڑی سے بڑی سزا دلوا

سکتا تھا لیکن اس کی دور اندیشی اسے ایسا کرنے سے برابر منع کر رہی تھی کیونکہ فتحی شاہ کو معلوم تھا کہ مرتضیٰ نظام شاہ کے بعد اسی شہزادے کو تاج و تخت سنبھالنا ہے، پھر وہ اس کی مخالفت کیوں مول لے وہ مونسہ سے محبت کرتا تھا اور شادی کر لینے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن شہزادے کی دخل اندازی نے یہ آسان کام بہت دشوار کر دیا تھا اب یہ خدشہ ہر وقت موجود تھا کہ شہزادے کے اوباش مصاحب مونسہ کے گھر پر حملہ کر کے اسے اغوا کر لیں۔ اس نے مونسہ کی نگہبانی اور حفاظت کے لئے بیس سپاہی ملازم رکھ لئے تھے جو ہر وقت باغیچے میں موجود رہتے۔ فتحی شاہ موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ بادشاہ سے انعام و اکرام لے کر احمد نگر سے چلا جانا چاہتا تھا اس نے رات کو نکلنا بھی بند کر دیا کیونکہ اسے ڈر تھا کہ شہزادے کے آدمی اسے دھوکے سے قتل کر سکتے ہیں۔ شہزادے کے ارادوں کا اسے کوئی علم نہ تھا لیکن جب بھی اس کا سامنا ہوتا شہزادے کی آنکھوں میں حسد اور انتقام کی آگ محسوس ہوتی۔

سہ پہر کو بادشاہ کی صحبت سے اٹھ کر وہ مونسہ کے پاس جا رہا تھا اس کا گھوڑا آہستہ آہستہ اس سڑک پر چل رہا تھا جو شاہی محل سے نکل کر امراء کی بستی میں داخل ہو جاتی تھی۔ کافی آگے جانے کے بعد املی کے گھنیرے درخت کے نیچے چرہی پر اس نے کئی جانوروں کو پانی پیتے دیکھا چرہی سے متصل کنوئیں سے پانی بھرا جا رہا تھا۔

فتحی شاہ کے گھوڑے نے پانی کی طلب میں چرہی کی طرف بار بار مڑ جانے کی کوشش کی لیکن فتحی شاہ مونسہ کے گھر پہنچ کے پانی دینا چاہتا تھا۔

اچانک ایک نوجوان اس کے اور گھوڑے کے درمیان حائل ہو گیا اور اس سے تقریباً ایک گز کے فاصلے پر سینہ تان کے کھڑا ہو گیا فتحی شاہ نے اسے سرسری نظر سے دیکھا لیکن دوسرے لمحے چونک کے احتراماً اسے بھی کھڑا ہو جانا پڑا۔ یہ شہزادہ تھا جو اسے طنز و ملامت کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

فتحی شاہ!" شہزادے نے کھردرے اور حاکمانہ لہجے میں کہا: "تمہارے جیسے کتے میری مزاحمت نہیں کر سکتے، تم ہوش و حواس سے کام لو اور میری راہ سے ہٹ جاؤ!"

فتحی شاہ نے نرمی سے جواب دیا، "ہم ہوش و حواس میں ہیں اور ہماری درخواست ہے کہ شہزادے خدا کی طرف سے بخشی ہوئی اقبال مندی اور طاقت کو غلط اور معمولی مقاصد میں نہ استعمال کریں!"

بات انا کی ہے تم میری راہ سے ہٹ جاؤ اور یقین رکھو کہ میں جو طے کر لیتا ہوں، اس سے منہ موڑنا اپنی توہین سمجھتا ہوں، مونسہ میری انا اور وقار کا مسئلہ ہے اور اسے میں اپنی خواہش اور مرضی کے مطابق طے کروں گا!"

فتحی شاہ نے مستقل مزاجی کا اظہار کیا، بولا: "ہمیں نہیں معلوم کہ ایک چیونٹی بھی ہاتھی گرا سکتی ہے، لیکن حق کی راہ میں مزاحمت کرنا ہمارا فرض ہے اور ہم بدرجۂ مجبوری، ظلم کی راہ میں مزاحم ضرور ہوں گے!"

شہزادے نے زور سے پیر پٹکا اور تند و تیز لہجے میں کہا، حضور بادا جان کی مصاحبت نے تیرا دماغ خراب کر دیا ہے لیکن تو یہ کیوں بھولتا ہے کہ وہ ایک خبطی اور دیوانہ شخص ہے اور وہ کسی دن بھی معزول کیا جا سکتا ہے، احمد نگر کے تاج و تخت میرے منتظر ہیں اور جب میرا دیوانہ باپ معزول اور میں برسر اقتدار آ جاؤں گا، اس وقت تجھے میرے قہر و غضب سے کون پناہ دے گا!"

فتح شاہ نے مطمئن لہجے میں جواب دیا: "خدا ہی۔ خدا جس نے اپنے آخری رسول کو کفار مکہ سے محفوظ رکھا تھا۔"

شہزادہ غصے میں چرہی کی طرف گیا اور اچھل کر خالی گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا پھر گھوڑے کو فتح شاہ کے قریب لایا اور غضب ناک لہجے میں کہا: "تو خود کو حق پر اور مجھے باطل پر کیوں سمجھتا ہے؟ یہ کیوں نہیں کہتا کہ تو ایک جائز حکمران کی امانت میں خیانت کا مرتکب ہو رہا ہے اور تو نمک حرامی کا مجرم ہے؟"

فتح شاہ نے آہستہ سے کہا: "کون حق پر ہے اور کس نے باطل کی راہ اختیار کی ہے یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا!"

شہزادے نے گھوڑے کو اس طرح ایڑ لگائی کہ وہ فتح شاہ کو زوردار رگڑ لگا کے پاس سے گزر گیا۔ فتح شاہ قلابازی کھا کے سبزے پر دور تک گھسٹتا چلا گیا۔ اس کا بایاں شانہ گھوڑے کی زوردار رگڑ سے زخمی ہو گیا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور غصے اور جھنجھلاہٹ سے شہزادے کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ چرہی اور کنویں پر موجود تماشائی اس پر ہنس رہے تھے۔

فتح شاہ لنگڑاتا ہوا اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا اور اسے چرہی سے ہٹا کے سبزے پر لے آیا۔ پشت کی زین درست کی اور رکاب پر پیر رکھ کے پشت پر پہنچ گیا۔

اس نے مونسہ کو یہ بات نہیں بتائی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مونسہ اور زیادہ سہم جائے گی۔ اس نے جھوٹ کی بابت یہ بتا دیا کہ گھوڑے نے پانی کی طلب میں الف ہو کر اسے گرا دیا جس سے بائیں شانے میں چوٹ آگئی۔

مونسہ نمک کے گرم پانی سے اس کے زخمی حصے کو دھارتی رہی اور آخر میں ایک مرہم لیپ کر دی۔

فتح شاہ نے کہا: "مونسہ! ابھی میں تمہارا کچھ بھی نہیں ہوں تم یہ جو کچھ کر رہی ہو اگر لوگ اسے دیکھ لیں تو معلوم نہیں کیسی باتیں بنائیں اور میں خود یہ سمجھتا ہوں کہ جب تک ہم دونوں ایک نہ ہو جائیں، ہمیں اپنے درمیان ایک فاصلہ ضرور قائم رکھنا چاہیے!"

مونسہ نے جواب دیا: "جب ہم دونوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم دو الگ الگ انسان نہیں ہیں ایک ہی روح دو قالبوں میں کارفرما ہے تو ہمیں ایسی باتیں بھی نہیں سوچنا چاہیے۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ تم احمد نگر چھوڑ دو اور کسی دوسری مملکت میں نکل چلو، شہزادے کی مخالفت کسی بھی الیے سے دوچار کر سکتی ہے!"

فتح شاہ نے شانے کی ٹیس سے ایک آہ سرد کھینچی اور کہا: "میں نے بادشاہ کے خزانے میں چند قیمتی مالائیں دیکھی ہیں، مجھے یقین ہے کہ اگر میں کسی وقت بادشاہ سے انہیں مانگوں گا تو انکار میں جواب نہیں ملے گا۔ بادشاہ وہ مالائیں مجھے ضرور عطا کر دے گا۔ یوں بھی ابھی تک میں انعام و اکرام کے ذریعے کافی دولت جمع کر چکا ہوں!"

مونسہ نے کہا: "اور ہاں، میں بادشاہوں کے دربار سے بہت زیادہ خوف زدہ رہنے لگی ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ احمد نگر چھوڑنے کے بعد تم کسی دوسرے دربار کا رخ نہ کرو۔ کیا اس دنیا میں آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر گزر بسر کے لیے درباروں کے علاوہ کوئی جگہ نہیں ہے؟"

"بے کیوں نہیں!" فتحی شاہ نے جواب دیا۔ "لیکن وہ باعزت پیشے نہیں ہیں!"

مونسہ نے تکلیف دہ آواز میں کہا۔ "میں باعزت بے عزت نہیں جانتی، میں تو یہ جانتی ہوں کہ زندگی آرام و آسائش میں گزار دوں۔ اس سرکار دربار نے میرے باپ کی جان لی۔ بھائی کو قتل کرایا۔ ماں کو ہلاک کیا اور اب یہ تمھارے تعاقب میں ہے۔ میری عزت و ناموس کا پیچھا کر رہا ہے۔ میں تو سرکار دربار جیسے لفظوں سے عاجز آگئی ہوں۔ یہ لفظ میرے کانوں میں ہتھوڑے کی ضرب بن کے داخل ہوتے ہیں اور دل زخمی کر دیتے ہیں!"

فتحی شاہ نے پیار سے کمال سمجھایا۔ "عورت ہو، لیکن تمھاری ماں بہادر تھیں!"

مونسہ نے شرما کے سر جھکا لیا۔ بولی: "جو کچھ کرنا ہے جلدی کر لو۔ جو ایک ماہ بعد کرنا ہے وہ کل ہی کر ڈالو اور جو کل کرنا ہے اسے آج ہی کر گزرو۔ وقت کا کوئی بھروسا نہیں، کہیں بدقسمتی گھات میں نہ ہو!"

فتحی شاہ نے ہمت بندھائی، بولا: "جب تک میں زندہ ہوں تمھیں نہیں گھبرانا چاہیے! میں تمھاری سپر ہوں، تمھاری ڈھال، میں تمھارا قلعہ ہوں!"

مونسہ نے جواب دیا: "پے در پے صدمات نے مجھے مایوس کر دیا ہے اور میں اپنے چاروں طرف اپنی بدبختی کو مکڑی کے جالے کی طرح تنا ہوا محسوس کرتی ہوں اور بدقسمتی سے یہ جانتی ہوں کہ سپر چھن جاتی ہیں، ڈھالیں ٹوٹ جاتی ہیں اور ناقابل تسخیر قلعے بھی سر کر لیے جاتے ہیں۔"

فتحی شاہ نے اداسی سے کہا: "اس مایوسی کا میرے پاس نہ تو کوئی جواب ہے اور نہ کوئی علاج بس یہی کہہ سکتا ہوں کہ خدا نے قرآنِ پاک میں فرمایا ہے۔

لاتقنطوا من الرحمۃ اللہ (اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو)

کئی دن بعد اچانک شہزادہ مونسہ کے گھر پھر پہنچ گیا۔ پستہ قامت مصاحب اس کے ساتھ تھا۔ فتحی شاہ کے کرائے دار سپاہی شہزادے کو روکنے کی ہمت نہ رکھتے تھے، یہ طلوعِ آفتاب کے دو ساعت بعد کا واقعہ ہے۔ شہزادہ کسی روک ٹوک کے بغیر زنان خانے میں مونسہ کے پاس چلا گیا البتہ قامت مصاحب دو قدم پیچھے ساتھ تھا۔ باغیچے میں ٹھیرے ہوئے کرائے کے سپاہیوں میں ہلچل مچ گئی۔ ان کا ایک سپاہی اسی وقت فتحی شاہ کو شہزادے کی غیر متوقع آمد کی خبر دینے چلا گیا۔ شہزادہ اس سے لاعلم تھا۔

مونسہ، شہزادے کو دیکھتے ہی سفید پڑ گئی۔ گھبرا کے بولی: "تم پھر آگئے؟"

"ہاں میں پھر آگیا ہوں!" شہزادے نے جواب دیا اور مڑ کر پستہ قامت مصاحب کو قریب بلا کے ہدایت کی: "دیکھو تم اس کمرے کی اچھی طرح تلاشی لو اور ہر اس ہتھیار پر قبضہ کر لو جس سے خودکشی کا احتمال پایا جاتا ہو!" اور مونسہ کو حکم دیا: "اور خبردار جو تم نے بھاگنے یا کچھ اور کرنے کی کوشش کی!"

مونسہ کو اپنی بے بسی پر رونا آگیا، گلا رندھ گیا۔ بھرآئی آواز میں بولی: "شہزادے! دلوں کا دکھانا بدترین فعل ہے اور دل آزاری بہت بڑا گناہ ہے، لوگ کہتے ہیں کہ جب کسی مظلوم کا دل دکھتا ہے تو

عرشِ الٰہی ہل جاتا ہے!"

شہزادہ اپنی فتح مندی پر نازاں تھا، ہنس کر کہا "ممکن ہے عرش ہل جاتا ہو اپنے کو تو کچھ پتہ نہیں کیونکہ عرش کے آس پاس سے اپنا کبھی گزر ہوا نہیں پھر وہ باغی کا قہقہہ لگا کے بولا "مظلوم تو میں ہوں! دل تو تم نے میرا دکھایا ہے، اب تک دل آزاری تو میری ہوتی رہی ہے اور اگر عرش الٰہی ہلا بھی ہوگا تو وہ میرے دل کے دکھنے سے ہلا ہوگا!"

مونس کی مسہری پر موٹا بلا آ بیٹھا بار بار اپنی دُم اور پیٹ چاٹ رہا تھا اور چاٹنے کے دوران بار بار زوردار جھرجھری لیتا، شہزادے نے بلے سے نظریں ہٹالیں لیکن مونس بلے کی موجودگی سے خوش ہوئی اور دل کو طاقتور اور توانا محسوس کیا۔

شہزادے نے طنزاً کہا "اس روز تو اس مردود بلے نے تمھاری حمایت میں ایسی زوردار مداخلت کی تھی کہ اس کے پنجوں کے زخم اب بھی سوزش میں مبتلا رکھتے ہیں لیکن اسے آج ایسا موقع نہیں دیا جائے گا!"

پستہ قامت مصاحب کمرے کی تلاشی لے کے واپس آگیا، بولا "جناب پورے کمرے سے ایک خنجر، ایک چاقو اور دو نیزے کی انیاں ملی ہیں اور انھیں میں نے اپنے قبضے میں کرلیا ہے!"

شاباش! "شہزادے نے کہا!" اب تم کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کے تماشا دیکھو!"

مونس کا دل ڈوبنے لگا وہ بلک بلک کے رونے لگی شہزادے نے پستہ قامت مصاحب کی نیام سے تلوار نکالی اور ایک اچانک بھرپور وار سے بلے کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ بولا "اس فتنے کو پہلے ہی ختم کر دینا بہت ضروری ہے!"

مونس اور زیادہ لرز گئی، ایک دوسری مسہری پر اوندھے منہ گر گئی اور روتی ہوئی بولی "خدا کے لئے اسی طرح میرے بھی دو ٹکڑے کر دو، میں عزت و ناموس لٹا کے زندہ رہنا ہرگز پسند نہ کروں گی!"

شہزادے نے خون میں لتھڑی ہوئی تلوار پستہ قامت مصاحب کی نیام میں ڈال دی اور مونس کی طرف بڑھا قریب پہنچ کے کہا "مونس! تم عقل سے کام نہیں لیتیں، تم ایک معزز امیر کی بیٹی ہو اور میں ایک حکمراں کا بیٹا ہوں تم اچھی لگتی ہو اور میں تمھیں سچ مچ ملکہ بنا کے رکھوں گا!"

مونس نے کوئی جواب نہ دیا بس سسکیاں لیتی رہی۔

شہزادے نے کہا "بہت ممکن ہے تمھی شاہ مجھ سے زیادہ حسین ہو لیکن تمھیں یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ وہ صرف ایک مصاحب ہے میرا مصاحب، میرے والد کا مصاحب، وہ میرا ملازم ہے کیا تمھارے لئے یہ فخر کافی نہ ہوگا کہ تمھی شاہ جیسے حسین و جمیل نوجوان تمھارے ادنا ملازموں میں شمار کیا جائے!"

مونس پھر خاموش رہی کوئی جواب نہ دیا۔

شہزادے نے بے تکلفی سے اس کی کمر پر ہاتھ رکھ دیا۔ بولا "سیدھی ہو جاؤ

مونسہ گھبرا کے اٹھ بیٹھی اور دونوں گھٹنوں میں سر دے کے پنڈلیوں کو دونوں ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔

"ایک صورت اور ہے!" شہزادے نے کہا۔ "بات وقار اور انا کی ہے۔ فتحی شاہ نے تمہارے معاملے میں کچھ بڑھ چڑھ کے باتیں کی ہیں اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اسے شرمندہ اور نادم کئے بغیر باز نہ آؤں گا!"

مونسہ کے منہ میں گویا زبان ہی نہ تھی، کسی بات کا جواب ہی نہ دے رہی تھی۔

شہزادے نے تلخی سے کہا۔ "تم بولتی کیوں نہیں؟ تم مجھ سے یہ کیوں نہیں پوچھتیں کہ آخر وہ کون سی تجویز ہے جس سے میری انا اور میرے وقار کو تسکین بھی پہنچ سکتی ہے اور تمہیں بھی زیادہ خسارہ نہیں اٹھانا پڑے گا یعنی یہ کہ تم بھی فتحی شاہ کو اپنا سکو گی!"

مونسہ نے کمزور آواز میں پوچھا۔ "وہ کس طرح؟"

شہزادہ ہنس کے کہنے لگا۔ "مجھے معلوم تھا کہ اب تم چپ نہیں رہو گی۔ کچھ نہ کچھ بولو گی ضرور!"

پھر ذرا دم لے کے بولا۔ "اگر تم میرے ساتھ مستقلاً نہیں رہنا چاہتیں تو کچھ دنوں کے لئے آجاؤ۔ میں تمہیں دو چار ماہ اپنے ساتھ رکھ کے تمہارے گھر واپس پہنچا دوں گا اور تمہیں اختیار حاصل ہوگا کہ جس شخص کو چاہو اپنا لو، اپنا بنا لو!"

مونسہ نے مردہ سی آواز میں پوچھا؟ "اس میں تمہارا کیا فائدہ چھپا ہے؟"

شہزادہ نے جواب دیا۔ "یہ کہ میں فتحی شاہ پر یہ ثابت کر سکوں گا کہ میری انا اور وقار سے ہم پلہ کسی اور کی انا اور وقار کو نہیں سمجھا جا سکتا!"

مونسہ نے افسردگی سے کہا۔ "بس اتنی سی بات کے لئے تم میری پوری زندگی تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہو، تم یہ کیوں یقین کئے بیٹھے ہو کہ فتحی شاہ اس کے بعد بھی مجھے قبول کر لے گا، وہ کچھ بھی ہو لیکن بے غیرت نہیں ہے!"

"تب پھر تم اس غیرت مند انسان کو ہمیشہ کے لئے بھلا کے میرے پاس آجاؤ!"

مونسہ نے کمزور سا عذر کیا۔ "مجھے سوچنے کا موقع دو، ممکن ہے کہ کافی غور و فکر کے بعد میں تمہارے ہی حق میں فیصلہ دے دوں!"

شہزادے نے ہنس کے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "گفتگو اسی موڑ پر پہنچ رہی ہے جہاں اس رات پہنچ کے ختم ہو گئی تھی، میری بدقسمتی اور تمہاری خوش قسمتی سے جہنم رسید بلے کی بے جا اور غیر متوقع مداخلت نے مجھے ناکام اور تمہیں کامران بنا دیا تھا لیکن آج ایسا نہیں ہوگا، تمہیں جو فیصلہ بھی کرنا ہے اسی وقت اور اسی لمحے کرنا ہوگا!"

مونسہ نے کچھ دیر سوچ کے پوچھا۔ "اگر میں یہ کہوں کہ میں عارضی طور پر تمہارے ساتھ رہنے پر آمادہ ہوں تو تمہارا میرے ساتھ کیا طرز عمل ہوگا؟"

شہزادے نے کہا۔ "یہ سوال تم نہیں میں کروں گا، اور تم سے یہ پوچھوں گا کہ اگر تم نے ایمانداری اور خلوص سے میرے ساتھ کچھ دن رہنے کا فیصلہ کیا ہے تو تم یہ کس طرح ثابت کرو گی کہ تم جو کچھ کہہ رہی ہو، خلوص اور دیانتداری سے کہہ رہی ہو؟"

مونسہ نے جواب دیا۔ "تم مجھے اپنے محل میں لے جانے کی ایک تاریخ دو، اور اس دن اگر میں تمہارے

سامنے نہ چلوں گی تو تم مجھے جھوٹا، فریبی اور جو جی میں آئے کہہ لینا لیکن اس سے پہلے تم کچھ بھی نہ کہو گے!"

شہزادے پر ہنسی کا دورہ پڑا، اتنا ہنسا اتنا ہنسا کہ مولنہ بھی سمجھی شہزادہ پاگل ہو گیا ہے، مصاحب سے بولا "میاں بونے! تم نے بھی سنیں اس لڑکی کی باتیں، یہ مرتضیٰ نظام شاہ والیٔ احمد نگر کے ذہین اور عقل مند بیٹے کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہے، خوب! لیکن یہ نہیں سمجھتی کہ جس شخص کو پورے احمد نگر پر حکومت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہو وہ ایک نادان اور کم عقل لڑکی کی باتوں میں کس طرح آ جائے گا؟" پھر مولنہ سے پوچھا۔ "لڑکی! تم نے یہ کس طرح یقین کر لیا کہ میں تمھیں اس معاملے میں کوئی مہلت بھی عطا کروں گا؟"

مولنہ نے کہا: "اتنا بڑا کام جلدی کس طرح انجام پا سکتا ہے؟"

شہزادے نے جواب دیا: "میں تمھیں مہلت فرصت بھی دے سکتا ہوں لیکن تمھیں داغ دار کرنے کے بعد میں اشاروں کنایوں میں بات نہیں کرتا۔ میں تمھاری رضامندی سے اسی وقت معاہدے کی توثیق چاہوں گا ہم دونوں ایک مخصوص عمل سے اسی وقت معاہدے کا اعلان کریں گے اور ہم دونوں کے اشتراک اور تعاون سے انجام پانے والا یہ فعل اس بات کی علامت ہو گا کہ دونوں معاہدے پر خلوص اور دیانت سے عمل پیرا ہونے کی نیت رکھتے ہیں!"

مولنہ بری طرح گھبرا گئی تھی، چالاک اور عیار شہزادے نے فرار کی جملہ راہیں بند کر دی تھیں۔

پست قامت مصاحب اوباشوں کا سرغنہ تھا اس نے شہزادے سے کہا "قبلۂ عالم! خوامخواہ کی باتوں میں وقت کیوں ضائع فرما رہے ہیں؟ کیا آپ نے داناؤں کی یہ مثل نہیں سنی کہ عورت اور گھوڑا ران کی چیزیں ہیں، انھیں ران ہی کے نیچے رکھنا چاہیے کیونکہ یہ اسی طرح قابو میں رکھی جا سکتی ہیں!"

شہزادے نے مشورے کا شکریہ ادا کیا اور اسے حکم دیا "تم کمرے سے باہر جاؤ اور پہرے داری کرتے رہو اور اس دوران کوئی شخص بھی ادھر نہ آنے پائے!"

پست قامت مصاحب کمرے سے نکل گیا اور اسے باہر سے بند بھی کر دیا۔

شہزادہ درندے کی طرح مولنہ پر جھپٹا لیکن مولنہ بچ نکلی، بس بھاگ دوڑ نے مولنہ کو تھکا دیا، لیکن وہ شہزادے کو پھر بھی نچاتی رہی۔ پست قامت مصاحب بار بار پوچھتا "قبلۂ عالم! کتنی کامیابی ہوئی؟ جلدی بہت جلدی، آپ کے قابو میں ایک لڑکی نہیں آتی، یہ بھی کمال ہے، جناب کچھ تو بہادری دکھائیں!"

ادھر مولنہ موقع پا کے مسہری کے نیچے گھس گئی تھی وہاں رسیاں اور موٹے کپڑے سینے والا تقریباً دو انگلیاں جتنا ایک سوا پڑا مل گیا۔ مولنہ کی جان میں جان آئی اور وہ اپنے تئیں طاقت ور محسوس کرنے لگی۔ شہزادے نے جھک کر دیکھا اور مولنہ کو حکم دیا۔

"مسہری کے نیچے سے نکلو، گھر میں کیا دھرا جو کبھی بچا رکھی ہے دیکھو اگر تم مجبور کرو گی تو ہم بھی خاموشی کے بجائے دھینگا مشتی اختیار کریں گے، ورنہ مسہری اسی میں ہے مسہری سے باہر آ جاؤ!"

مونسہ نے جواب دیا: "اس وقت میرے ہاتھ میں ایک بڑا سا سوا ہے اور یہ یاد رکھو کہ اگر تم نے مسہری کے نیچے آنے کی کوشش کی تو میں کسی رعایت کے بغیر سوئے سے زخمی کر دوں گی!"

شہزادے نے کہا: "کیا قیامت عورت ہے، کیسی فتنہ لڑکی ہے!!"

مونسہ نے کہا: "اس وقت میں خود بھی جان پہ کھیل جانے کا تہیہ کر چکی ہوں۔ تم مجھے اپنی طاقت اور دولت کے ذریعے فتح کر لینا چاہتے ہو، ایسا ناممکن ہے۔"

اسی وقت پستہ قامت مصاحب نے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا: "قبلۂ عالم! غضب ہو گیا ستم ہو گیا، براہ کرم اس لڑکی کا پیچھا چھوڑ دیجئے، یہ تو کسی آسیب کی اولاد لگتی ہے!"

شہزادے نے ہنس کر کہا: "آخر تو کیوں مرا جا رہا ہے؟ تو کیوں حواس باختہ ہو رہا ہے؟"

پستہ قامت مصاحب نے جواب دیا: "حضور والا! باہر حضور والا کے پدر بزرگوار کے سپاہی آدمی آ چکے ہیں اور بادشاہ کے حکم پر قبلۂ عالم کو گرفتار کر لینا چاہتے ہیں!"

بازی ہاتھ سے جاتے جو دیکھی اور اپنی گرفتاری کی منحوس خبر سنی تو شہزادے کے حواس ہی جاتے رہے۔ شہزادہ پستہ قامت مصاحب کے ساتھ باہر نکلا، وہاں بادشاہ کا ایک مصاحب خاص تقریباً پچاس سپاہیوں کے ہمراہ شہزادے کے نام پروانۂ شاہی لئے کھڑا تھا۔ بادشاہ کے مصاحب خاص نے طنزاً سوال کیا: "حضور والا کیا آپ پروانۂ شاہی میرے ہاتھ میں دیکھ کے گھبرا نہیں گئے؟"

شہزادے نے اپنا ہاتھ پروانۂ شاہی کی طرف بڑھایا اور بعجلت پروانہ پڑھنے لگا۔ بادشاہ نے لکھا تھا "عزیز از جان شہزادے! یہ تمھیں ہو کیا گیا ہے؟ سننے میں آیا ہے کہ تم مرحوم چنگیز خان کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"جی بندہ پرور حضور نے بالکل صحیح فرمایا۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ وہ شاہی پروانہ پڑھتا رہا۔ یہ چند سطری پروانہ عجلت میں لکھوایا گیا تھا۔ اس میں لکھا تھا۔

"یہ چنگیز خان ہمارا جاں نثار اور وفادار امیر تھا، اچھا منتظم، اعلیٰ سمجھ بوجھ کا مالک اور بہترین فوجی۔ اس کے حاسدوں اور بدخواہوں نے ہمیں اس کے خلاف بھڑکایا اور ایک دن ہم نے اسے شربت میں زہر دیکر مار دینے کا منصوبہ بنایا۔ چنگیز خان ہمارے منصوبے سے واقف تھا اس نے ہنسی خوشی مسکراتے ہوئے سقراط کی طرح زہر کا پیالہ پی لیا اور ہمارے نام یہ پیغام بھیجا کہ میں جانتے بوجھتے بادشاہ کا بھیجا ہوا آب حیوان پی کر سفر آخرت پر روانہ ہو رہا ہوں۔ خدا بادشاہ کو تادیر سلامت رکھے، ہم اپنے اس فعل پر آج تک شرمندہ ہیں اور کار دیار سلطنت سے تقریباً ہاتھ اٹھا چکے ہیں اور تم اسی وفادار امیر کی بیٹی کو ستانے پر کمر بستہ ہو۔ فرمان عالی وصول کرتے ہی ہمارے پاس حاضر ہو اور اگر تمھیں اس حکم کی تعمیل میں کسی قسم کا تامل ہو تو ہم نے اپنے جاں نثاروں کو یہ حکم بھی دیدیا ہے کہ تمھاری مزاحمت کی صورت میں وہ جو طریقۂ کار مناسب سمجھیں اختیار کریں، یہاں تک کہ وہ تمھیں قتل بھی کر سکتے ہیں!"

شہزادے کو غصہ تو بہت آیا لیکن اس خطرناک فرمان شاہی کے آگے سر جھکانا ہی پڑ گیا۔ اس نے خود کو

بادشاہ کے حوالے کر دیا۔ پسند قد مصاحب کو گھر واپس جانے کی ہدایت کی اور کہا: بادشاہ نے مجھے طلب کیا ہے تم اس مصیبت میں کیوں پڑو، تم واپس جاکے میرے دوستوں اور جاں نثاروں کو یہ خبر سنا دو کہ بادشاہ نے ایک معمولی مصاحب کی چغلی پر اپنے بیٹے اور ولی عہد کی گرفتاری اور قتل کا فرمان صادر کر دیا ہے۔

بادشاہ نے شہزادے کو دیکھ کر منہ پھیر لیا اور نفرت سے کہا: "احمق لڑکے! کیا تو یہ بھی نہیں جانتا کہ چنگیز خان مظلوم ہی کے سوگ میں ہم تقریباً چودہ پندرہ سال سے عزلت نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں اور کاروبار مملکت اپنے ملازمین کے حوالے کر رکھا ہے اور تیری یہ ہمت کہ اسی مظلوم کی ناموس پر ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے؟"

شہزادے نے جی کڑا کر کے جواب دیا "میں آپ کے مظلوم امیر کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟

بادشاہ نے کہا: "آخر کیوں؟ تیری بیوی بے جا پور میں تیرا انتظار کر رہی ہے!"

شہزادے نے زیادہ ڈھٹائی اختیار کی، بولا "کیا بادشاہوں اور شہزادوں کو ایک ہی بیوی پر گزر بسر کرنا چاہیئے؟ کیا اس میں ان کی توہین نہیں ہے، کیا ایک بادشاہ یا شہزادے کو ایک ہی بیوی پر اکتفا کر کے اپنا شمار غرباء اور اہل افلاس میں کرانا بے عزتی نہیں ہے؟"

بادشاہ نے جھٹکے سے اپنا چہرہ شہزادے کے سامنے کیا اس کی شعلہ بار آنکھوں کی تاب نہ لاکے شہزادے نے گردن جھکا لی، بادشاہ نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا نابکار ناخلف! ہم تجھے عاق کر دیں گے، تجھے قتل کرا دیں گے جب تک ہم بادشاہ ہیں تو احمد نگر کا ایک عام شہری ہے! ور شاہی مراعات اور اعزازات کا مستحق نہیں قرار دیا جا سکتا تو اسی وقت نظروں سے دور ہو جا۔ ورنہ ڈر ہے کہ کہیں ہم تجھے اپنے ہاتھ سے نہ قتل کر دیں۔

حکم پاتے ہی شہزادہ بادشاہ کے سامنے سے ہٹ گیا، محل سے نکلتے وقت اس کا فتحی شاہ سے سامنا ہو گیا، شہزادے نے دانت پیستے ہوئے کہا "میں تجھ سے سمجھ لوں گا، یا تو تو میرے معاملے میں پسپائی اختیار کر یا پھر مرنے اور تباہ و برباد ہونے کے لئے تیار ہو جا اور رہا بادشاہ کا معاملہ تو میں اس کا بھی کوئی حل نکال لوں گا!

مونسہ ڈری ہوئی فتحی شاہ کا انتظار کر رہی تھی، وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا مونسہ کے صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک پڑا اور وہ بلک بلک کے رونے لگی فتحی شاہ صبر کی تلقین کرتا رہا لیکن اندر سے وہ خود بھی ٹوٹتا جا رہا تھا شہزادے کی اس کیفیت نے بتا دیا تھا کہ مونسہ کے معاملے میں کسی بھی طرح ہار ماننے کو تیار نہیں ہے، وہ یہ سوچ سوچ کے اور زیادہ پریشان ہو جاتا کہ شہزادہ مستقبل کا بادشاہ ہے اور مرتضیٰ نظام شاہ کی دماغی کیفیت کا کوئی بھروسہ نہیں کہ اس سے کس وقت کیا فیصلہ صادر ہو جائے، وہ شہزادے کو بھی قتل کرا سکتا تھا اور فتحی شاہ پر بھی عتاب نازل ہو سکتا تھا بہت غور و خوض کے بعد اس نے اسی میں بہتری محسوس کی کہ شہزادے کو کسی بھی تدبیر سے دوست بنا لیا جائے!

مونسہ نے کہا: "تم معلوم نہیں کیا سوچ رہے ہو، اگر آج شاہی دستہ فوراً میرے پہنچتا تو شہزادہ اپنے

مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاتا۔ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے اسے لے کے یہاں سے کہیں اور چلے جائیں اب سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کا وقت نہیں رہا!"

فتحی شاہ نے جواب دیا۔ "چاہتا تو میں بھی یہی ہوں لیکن بادشاہ ایسا کرنے سے منع کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہمیں یہیں رہنا اور مجھے شہزادے سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیئے۔ اب اگر میں بادشاہ کا کہنا نہیں مانوں گا تو انہیں بھی اپنا دشمن بنالوں گا اور جنبلی بادشاہ کی دشمنی مجھے بہت زیادہ نقصان پہنچائے گی، قرب و جوار کی کوئی بھی حکومت ہمیں پناہ بھی نہ دے گی اور اگر پناہ بھی دے گی تو بادشاہ کی طلبی پر ہمیں پھر بادشاہ کے حوالے کر دے گی!"

مونسہ نے سر پکڑ لیا۔ "عجیب مشکل میں جان پھنسی ہے، آخر ہمیں کرنا کیا چاہیئے؟"

فتحی شاہ نے جواب دیا۔ "بادشاہ کہتے ہیں کہ میں تم سے فوراً شادی کر لوں اسی طرح یہ فتنہ دب جائے گا!"

مونسہ نے چونک کے ایک لمحے کے لئے فتحی شاہ کو دیکھا اور شرما کے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

بادشاہ کی ایما پر دونوں کی شادی ہو گئی اور اس شادی میں تھوڑی دیر کے لئے بادشاہ نے بھی شرکت کی۔ دلہن بنی ہوئی مونسہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اسے اپنی بیٹی قرار دیا۔ اس طرح بادشاہ اپنے بیٹے میراں حسین کو یہ جتانا چاہتا تھا کہ مونسہ اب بادشاہ کی بیٹی ہے اور اسکے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے پہلے شہزادے کو اسکے نتائج سے ضرور خبردار رہنا چاہیئے۔

تب عروسی میں شہزادہ اپنے اوباش ساتھیوں کو لے کر فتحی شاہ کے پاس پہنچ گیا اور اسے باہری بیٹھک میں طلب کیا۔ فتحی شاہ اس حسین ترین لمحے کو تکدر و ترددکی نذر نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اتنی طاقت بھی نہ رکھتا تھا کہ شہزادے کو یوں ہی واپس کر دیتا۔

فتحی شاہ بے دلی سے بیٹھک میں پہنچا۔ شہزادے نے پر تپاک انداز میں فتحی شاہ کا خیر مقدم کیا۔ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "مبارک مبارک، سنا ہے بادشاہ نے مونسہ کو اپنی بیٹی بنا لیا ہے گویا اب وہ میری بہن ہو چکی ہے اور تم میرے بہنوئی ہو!"

فتحی شاہ نے عاجزی سے جواب دیا۔ "یہ بھی بندگان عالی کی عزت افزائی اور کرم گستری ہے جو انھوں نے اس ناچیز کی شادی میں شرکت فرمائی اور مونسہ کو اپنی بیٹی قرار دینے کا اعلان فرمایا!"

شہزادے نے کہا۔ "وہ پرانے جھگڑے ختم۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے رشتے دار کی حیثیت سے ملنا چاہیئے، کیا تم مجھے مونسہ کے پاس لے چلوگے تم نے مجھے شادی میں نہیں بلایا، اس کی مجھے کوئی شکایت نہیں کیونکہ اس وقت تک تمھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ مونسہ بادشاہ کی بیٹی بننے والی ہے لیکن اب تو مجھے میری بہن مونسہ کے پاس لے چلو!"

شہزادے کے مزاج کا یہ تغیر فتحی شاہ کے لیے مسرت افزا تھا، وہ اسی وقت شہزادے کو

مونسہ کے پاس لے چلا گیا، مونسہ شبِ زفاف کی خلوت گاہ میں شہزادے کو داخل ہوتے دیکھ کر گھبرائی لیکن فتحی شاہ نے دور ہی سے اعلان کرنا شروع کر دیا۔ مونسہ! شہزادے نے تمھیں اپنی بہن کہہ دیا ہے۔ وہ بادشاہ کے اس اعلان کو نہایت عزت اور قدر و قیمت کی نظر سے دیکھتے ہیں جس کی رو سے تم بادشاہ کی بیٹی قرار پائی ہو!"

مونسہ کو ان باتوں پر یقین نہ آیا۔ وہ متذبذب شہزادے کو دیکھتی رہی۔

شہزادہ اس کے قریب کھڑا ہو کے کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر بمشکل کہا "مونسہ تمھیں شادی اور یہ حسین دولت مبارک ہو!" پھر فتحی شاہ سے کہا "فتحی شاہ! تم جیت گئے۔ تم نے مجھے شکست دیدی، اور چونکہ میں نے اپنی پوری زندگی میں مایوسی اور ناکامی کا منہ نہیں دیکھا اس لیے اس شکست اور ناکامی نے میرے دل ہی کو نہیں روح تک کو گھائل کر دیا ہے، خیر یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے اگر تم پسند کرو تو اس وقت بھی میرے پاس ایک ایسی تجویز ہے جس سے میرے ناکام اور مایوس دل کو سہارا مل سکتا ہے!"

فتحی شاہ اور مونسہ حیرت اور ڈر سے شہزادے کی بقیہ بات کا انتظار کرنے لگے۔ شہزادے نے فتحی شاہ سے کہا "تم نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا!"

فتحی شاہ نے کمزور آواز میں جواب دیا "آپ اپنی تجویز بیان کریں!"

شہزادے نے اپنی جیب سے ایک رومال نکالا اور اس کے ایک کونے میں بندھی ہوئی انگوٹھی نکال کر ہاتھ میں لے لی، بولا "یہ میں مونسہ کے لئے لایا ہوں، یہ رومال اور انگوٹھی یہ دونوں چیزیں میں خود مونسہ کو دینا چاہتا ہوں۔" پھر انگوٹھی والا ہاتھ مونسہ کے ہاتھ کی طرف بڑھاتا ہوا بولا "لاؤ ہاتھ میرے پاس لاؤ یہ انگوٹھی میں خود اپنے ہاتھ سے تمھاری انگلی میں پہنانا چاہتا ہوں!"

مونسہ کو ہاتھ آگے بڑھانے میں تامل ہوا، فتحی شاہ بھی متذبذب، کسی فیصلے کے قابل نہ رہا، شہزادے نے ناگواری سے کہا "مجھے اپنے اس عمل سے یہ تسکین ملے گی کہ اگر مونسہ کو حاصل نہیں کر سکا تو یادگار کے طور پر ایک رومال اور انگوٹھی دینے میں ضرور کامیاب ہو گیا، میرا خیال ہے تم دونوں کو اس حقیر سی مسرت حاصل کرنے میں اعتراض نہیں ہونا چاہیے!"

مونسہ کا سخت دل اب بھی نہ پسیجا تھا لیکن فتحی شاہ نے مونسہ سے درخواست کی "مونسہ! ہمیں شہزادے کی اس خواہش کو رد نہیں کرنا چاہیے اور اپنے اس عمل سے اگر شہزادے کسی قسم کی تسکین حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں مزاحم نہیں ہونا چاہیے!"

مونسہ کا لرزتا ہوا ہاتھ شہزادے کی طرف بڑھا اور شہزادے نے نہایت قیمتی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا کے رومال ہاتھ میں تھما دیا۔ شہزادے کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔

شہزادہ ایک بھائی کی حیثیت سے مونسہ کے پاس بہت زیادہ حاضریاں دینے لگا یہ نئی صورتحال

مونس اور فتحی شاہ دونوں کے لیے پریشان کن تھی لیکن وہ منع بھی نہ کر سکتے تھے۔ شہزادے نے ایک دو بار مونس سے ہنسی ہنسی میں شکایتاً کہا بھی کہ فتحی شاہ سے شادی کر کے اس نے غلطی کی ہے اور اس غلطی کا احساس اسے کچھ عرصے بعد ہوگا۔ مونس نے شہزادے کو یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ آئندہ کبھی بھی اس موضوع پر گفتگو نہ کرے۔

بادشاہ نے مونس کو بیٹی کہا تھا، اس رشتے کے خیال سے اس نے قلعے دار صلابت خان کو حکم دیا کہ خزانے میں جو چند قیمتی مالائیں رکھی ہیں انھیں فتحی شاہ کے حوالے کر دیا جائے۔ بادشاہ کے اس حکم کی شہزادے کو خبر ہوئی تو اس نے صلابت خان کو مجبور کر دیا کہ اس حکم کی تعمیل نہ ہو۔ صلابت خان ٹال گیا۔ فتحی شاہ نے کئی دن بعد ایک مناسب موقع پر بادشاہ کو مطلع کیا کہ ابھی تک وہ قیمتی مالائیں اسے نہیں ملی ہیں۔ بادشاہ نے غصے میں قلعے دار صلابت خان کو طلب کیا اور حکم دیا کہ وہ قیمتی مالائیں اسی وقت فتحی شاہ کے حوالے کر دی جائیں۔ صلابت خان نے تعمیلِ حکم سے پہلے شہزادے سے ملاقات کی اور اسے تازہ صورتحال سے مطلع کیا۔ شہزادے نے پھر اسے تعمیلِ حکم سے انکار پہ آمادہ کر لیا۔

صلابت خان بادشاہ کا حکم بار بار نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس بار اس نے چند معمولی مالائیں فتحی شاہ کے حوالے کر دیں لیکن دو دن بعد ہی فتحی شاہ کو کسی طرح اس دھوکے کا علم ہو گیا اس نے بادشاہ سے شکایت کر دی۔ بادشاہ نے اسی وقت صلابت خان کو بلایا اور جواب طلب کیا۔ صلابت خان تھر تھر کانپنے لگا۔ بادشاہ نے کہا: "خزانے کے تمام ہیرے جواہرات اور دوسری قیمتی اشیاء ہمارے نقرئی محل میں رکھ دی جائیں ہم ان کا معائنہ فرمائیں گے!"

صلابت خان نے شہزادے کو بادشاہ کے نئے حکم سے مطلع کیا۔ شہزادے نے کہا "ان قیمتی مالاؤں کے علاوہ سب کچھ نقرئی محل میں جمع کر دیا جائے!"

صلابت خان نے شہزادے کے حکم کی تعمیل کر دی اور بادشاہ سے اس کے معائنے کی درخواست کی۔ بادشاہ دیر تک اس خزانے کا معائنہ کرتا رہا اور یہاں بھی یہ بات چھپی نہیں رہی کہ قیمتی مالائیں ان میں موجود نہیں ہیں، دو خادم بادشاہ کے آس پاس دو قدم پیچھے چل رہے تھے اور بادشاہ ایک ایک چیز بغور دیکھتا اور آگے بڑھ جاتا آخر بادشاہ نے جھنجھلا کے آگ طلب کی اور خادموں کو باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ جب دونوں خادم باہر چلے گئے تو بادشاہ نے اس بیش بہا خزانے کو آگ لگا دی اور باہر نکل آیا۔ پھر موجود خادموں کو حکم دیا کہ ہال کے دروازے بند کر دیے جائیں، خادم بادشاہ کی حرکت سے لاعلم تھے اور اس وقت تک آگ پھیلی نہیں تھی، ہال کے تمام دروازے بند کرا کے بادشاہ خادموں کے ساتھ محل کی اس عمارت میں گیا جسے عمارت بغداد کہا جاتا تھا اس نے فتحی شاہ کو طلب کیا اور اسے دل جلے انداز میں بتایا: "فتحی! ہم نے اس خزانے ہی کو نذرِ آتش کر دیا جس کی طمع لوگوں کو نافرمان اور کذب گو بنا رہی تھی!"

فتحی شاہ بادشاہ کی بات سمجھ نہیں سکا۔ قدرے جھک کر ادب سے وضاحت چاہی "سجدہ گاہِ خواص و عوام! یہ ناچیز حضور کا کلام رفعت مقام سمجھنے سے قاصر رہا، تشریح و تفصیل کا طالب ہے!"

بادشاہ نے غصے میں جواب دیا "ہمیں معلوم ہے کہ شہزادہ میراں حسین ہمارے خلاف

سازشیں کر رہا ہے۔ ہم اپنے خدام اور نمک خواروں کو ایک حکم دیتے ہیں، میراں حسین تعمیلِ فرمان میں مزاحم ہو جاتا ہے اور ہمارے شہزادے محض اس خیال سے میراں حسین کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ولی عہد ہے اور احمد نگر کا ہمارے بعد وہی حکمراں ہو گا!"

فتح شاہ نے خوفزدہ ہو کے اپنی حیثیت سے زیادہ بات کہہ دی، "حضورِ والا! غلام نے افواہاً ایک ایسی بات بھی سن رکھی ہے کہ اس کا اپنی زبان سے دہرانا بھی غلامانہ سوءِ ادبی کہلائے!"

بادشاہ نے اشتعال و جلال سے فتح شاہ کو دیکھا: "فوراً بیان کرو، اگر اس افواہ میں کوئی ایسا مفہوم موجود ہے جس سے نظامِ شاہی اقتدار کو خطرہ لاحق ہو تو اس کا چھپانا بھی ایک سنگین جرم اور نمک حرامی ہے!"

فتح شاہ نے اٹک اٹک کے عرض کیا: "غلام نے رات کے اندھیرے میں سرگوشیانہ انداز میں یہ سنا ہے کہ حضورِ والا کے کچھ بدخواہ شہزادے کو برسرِ اقتدار لانے کی کوششیں کر رہے ہیں، یہ ناچیز ان کی آواز سے انھیں پہچان نہیں سکا اسی لئے یہ مبہم لیکن خطرناک بات حضور کے روبرو دہرانا نہیں چاہتا تھا!"

بادشاہ نے میراں حسین کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ بولا: "میراں حسین کی سنگ دلی اور سفاکی سے سب کچھ ممکن ہے، ہمیں خود بھی اس کے عزائمِ نامعلوم کا علم ہے لیکن اسے اس کے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا!"

دونوں خادموں میں سے ایک کسی ضروری کام سے باہر چلا گیا اور خزانے کی آتش زدگی اور شہزادے کے خلاف گفتگو کا احوال دوسروں کو بتا کے واپس آ گیا۔ شہزادہ، صلابت خان اور چند دوسرے آدمیوں کو لے کے آتش زدہ حصے میں داخل ہوا۔ اس وقت تک ان اشیاء کے علاوہ جنھیں آگ نہیں جلا سکتی، سب کچھ جل چکا تھا۔ شہزادے نے غصے سے دانت بھینچ لئے اور چہرے پر سفاکی کے آثار ہویدا ہو گئے۔ اس نے کسی کو مخاطب کئے بغیر کہا: "میرا باپ دیوانہ ہو چکا ہے، پاگل بے وقوف، اب اسے حکمراں نہیں رہنا چاہئے، میں اسے ہٹا کے دم لوں گا!"

صلابت خان نے عرض کیا: "حضورِ والا! فتح شاہ جیسے بدخواہ بادشاہ کو ورغلاتے رہتے ہیں، اب حضور کے لئے یہ لازم ہو گیا ہے کہ وہ کچھ دنوں کے لئے بادشاہ کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں!"

شہزادے نے طیش میں کہا: "میں کچھ دنوں کے لئے بیجاپور کیوں نہ چلا جاؤں، یاں میری دلہن کے اپنے پدرِ نسبتی (خسر) کے خاندان سے فوجی مدد حاصل کر سکتا ہوں اور اس سے اپنے باپ کو معزول کر سکتا ہوں!"

صلابت خان نے عاجزی سے عرض کیا: "حضور کچھ بھی نہ کریں بلکہ اپنے جاں نثاروں پر اعتماد فرمائیں، آپ کچھ دنوں کی روپوشی اختیار فرمائیں، اس دوران میں بادشاہ کا غصہ اتر جائے گا اور مستقبل کے لئے کوئی اچھی تدبیر بھی سوچ لی جائے گی!"

شہزادے نے کہا: "مجھے تمھارا مشورہ منظور ہے لیکن میں ایک ذمے داری تمھیں بھی سونپتا ہوں، فتح شاہ نے مجھے پریشان کیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم اس کا علاج ضرور کرو، جب تک میں اسے کوڑی

کو کسی کا محتاج اپنے قدموں میں سسکتا بلکتا نہ دیکھوں گا، مجھے سکون نہیں ملے گا!"

صلابت خان نے عرض کیا: "آپ فکر نہ کریں!"

صلابت خان شہزادے کو ساتھ لے کر غائب ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی بادشاہ کے بھیجے ہوئے دو شمشیر بردار وہاں پہنچے اور شہزادے کے ملنے کا پتہ معلوم کیا وہ دیر تک ادھر ادھر شہزادے کی تلاش میں سرگرداں رہے، انھوں نے صلابت خان کو پکڑ لیا اور اسے ڈرا دھمکا کر شہزادے کا پتہ معلوم کرنا چاہا لیکن صلابت خان بھی کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ قلعے دار تھا اور جب تک وہ قلعے دار تھا اس کی حیثیت بہت مضبوط تھی۔ اس نے بادشاہ کے شمشیر برداروں سے کہا: "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں بادشاہ کا نمک خوار نہیں رہا؟ میں اس کا اب بھی وفادار اور نمک خوار ہوں لیکن یہ ضرور ہے کہ میں تم دونوں کی طرح عقل وخرد سے عاری نہیں ہوں، یہ باپ بیٹے کی جنگ ہے اور ہم نمک خواروں کو کسی کی حمایت اور کسی کی مخالفت میں بڑھ چڑھ کے حصہ نہیں لینا چاہیئے کیونکہ ہمارا دونوں ہی سے واسطہ رہے گا اور ہم دونوں ہی کے نمک خوار ہیں!"

شمشیر بردار کچھ نرم پڑ گئے اور بات ان کی سمجھ میں بھی آگئی وہ واپس گئے اور بادشاہ کو مطلع کیا کہ شہزادہ کہیں فرار ہو چکا ہے، اس کا کہیں پتہ نہیں!

بادشاہ نے شہزادے کے تعاقب اور تلاش میں لومڑی جیسے چالاک اور بھیڑیئے جیسے درندے اور سفاک آدمی چھوڑ دیئے!

باپ بیٹے کی جنگ کا گویا اعلان ہو چکا تھا، شاہی عہدے دار دو حصوں میں تقسیم ہو چکے تھے، ایک حصہ بادشاہ کا حامی تھا، دوسرا شہزادے کا مددگار، بادشاہ کے آدمی شہزادے کو تلاش کرتے پھر رہے تھے اور شہزادے کے مددگار اسے چھپانے میں لگے ہوئے تھے۔ فتحی شاہ اور مولسہ ڈرے سہمے سارے دروازے بند کر کے اندر بیٹھے تھے فتحی شاہ اب بار بار یہ سوچتا کہ اسے شہزادے کی مخالفت نہیں مول لینی چاہیئے تھی، عشق کا نشہ کسی حد تک اتر چکا تھا، جوانی میں ہر لڑکی ہر جان دار اچھا لگتا ہے اور مولسہ تو خوبصورت بھی تھی وہ بہت زیادہ اچھی لگی اور اس نے بہت زیادہ اچھی صورت اور شباب پر سب کچھ داؤ پر لگا دیا، اس کی آزادی چھن گئی، بے فکری غارت ہو گئی، مستقبل خطرے میں پڑ گیا۔ بادشاہ خبطی اور دیوانہ کہلاتا تھا اور کچھ پتہ نہ تھا کہ یہ خبطی اور دیوانہ بھی کب اس کے خلاف ہو جائے؟ شہزادے کے اوباشوں کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا تھا۔ ان فکروں نے اسے آہستہ آہستہ بدلنا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی تو وہ یہاں تک سوچ بیٹھتا کہ اصل شے بے فکری اور دولت ہے، اگر یہ دونوں چیزیں کسی شخص کو حاصل ہوں تو وہ بڑے مزے کی زندگی گزار سکتا ہے۔ ایک حسین لڑکی مل سکتی ہے، نت نئی عورتیں فراہم ہو سکتی ہیں کسی کسی لمحے مولسہ سے عشق اور اس کی حصول یابی کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات اور مقابلے پر اسے ہنسی بھی آتی اور افسوس بھی ہوتا لیکن تیر کمان سے

نکل چکا تھا اور شہزادے کی دشمنی مول لی جا چکی تھی، آہستہ آہستہ مونسہ بھی اس تبدیلی کو محسوس کرنے لگی۔

موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور بادلوں میں لہراتی ہوئی بجلی کی چمک اور بادلوں کی گھن گرج نے ایک طوفان اٹھا رکھا تھا۔ اس حسین اور عاشقانہ موسم میں دونوں کے جذبات نے انگڑائی لی اور وہ ایکدوسرے کا ہاتھ تھامے عقبی باغیچے میں داخل ہو گئے۔ موسلا دھار بارش نے انھیں اپنے دھاروں میں چھپا لیا۔

مونسہ پر بھی اس موسم میں جذبات غالب آ گئے اور وہ جذبات زدہ آواز میں کہنے لگی "فتحی! تم بدل گئے ہو، اتنے بدل گئے ہو کہ اس تبدیلی کا تمھیں خود بھی احساس نہیں ہوتا۔"

فتحی شاہ نے حیرت سے جواب دیا "یہ تمھارا وہم ہے مونسہ اور وہم کا علاج تو لقمان کے پاس بھی نہ تھا۔"

مونسہ نے کہا "تم مجھے باتوں سے نہیں بہلا سکتے۔ یہ میرا وہم نہیں حقیقت ہے، ایک واقعہ تلخ حقیقت ناخوشگوار واقعہ، تم بہت زیادہ بدل چکے ہو فتحی اور اس تبدیلی کو تم نہیں سمجھ سکتے۔"

فتحی نے اسے زبردستی اپنے برابر بٹھا لیا، بولا "اس حسین اور عاشقانہ موسم میں ایسی غیر عاشقانہ باتیں ذرا بھی اچھی نہیں لگتیں۔"

مونسہ کے انگ انگ جسم پر بھیگے کپڑے قیامت ڈھا رہے تھے بالکل ایسا لگتا جیسے آگ کے مجسمے پر بھیگے کپڑوں کا پھایا رکھ دیا گیا ہو، فتحی نے مونسہ کا ہاتھ ہاتھ میں لے لیا اور اسے ہونٹوں پہ رکھ لیا پھر گالوں پر پھیرتا ہوا بولا "ہاں تو جب تک تم مجھے میرا جرم نہ بتاؤ گی میں تمھیں یہاں سے جانے نہ دوں گا۔"

مونسہ نے کہا "فتحی!" اس کی آواز بھر آ گئی "ذرا اس زمانے کو تو یاد کرو جب ہم دونوں کی شادی نہ ہوئی تھی، اس وقت تم میرا پیچھا کیا کرتے تھے لیکن اب وقت بدلا بدلا محسوس ہوتا ہے۔"

فتحی شاہ بے ساختہ ہنس دیا۔ کہا "ارے تم تو واقعی سنجیدہ ہو۔"

مونسہ نے اس کی گود میں سر ڈال دیا۔ بولی "کبھی کبھی میں خود کو بالکل تنہا محسوس کرتی ہوں۔"

فتحی نے معافی مانگی "اگر تم ایسا محسوس کرنے لگی تو میں معذرت چاہتا ہوں اور معافی کا طالب ہوں۔ تمھیں خود کو تنہا نہیں سمجھنا چاہیے جب تک میں موجود ہوں، تم خود کو تنہا اور اکیلا کس طرح محسوس کر سکتی ہو؟"

ان تسلیوں اور دلاسوں نے مونسہ کو مطمئن نہیں کیا۔ بارش تھمنے کا نام نہ لیتی تھی، فتحی نے کہا۔ "مونسہ! چلیں بار بار بجلی چمک رہی ہے۔ ڈر لگتا ہے کہ کہیں گر کر ہم دونوں کو ہلاک نہ کر دے!"

مونسہ نے جواب دیا "مجھے بالکل ڈر نہیں لگتا، مرجانا کون سی بڑی بات ہے جس سے آدمی خوف زدہ ہو!"

فتحی سمجھ گیا کہ اس وقت مونسہ پر چڑچڑے پن کا دورہ پڑا ہوا ہے اس لئے وہ فتحی کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی عیب نکال کے عاجز کر دے گی۔ اسی لمحے باغیچے کی عقبی دیوار سے کئی آدمی جھانکتے نظر آئے۔ انھیں مونسہ نے پہلے دیکھا اور وہ تھر تھر کانپنے لگی ہو گئی۔ ابھی اس نے فتحی شاہ سے کچھ بھی نہ کہا تھا کہ کئی آدمی دیوار سے چھلانگ لگا کے باغیچے میں داخل ہو گئے۔ اب انھیں فتحی شاہ نے بھی دیکھ لیا تھا، وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آنے والوں

یہ شہزادہ سب سے آگے تھا۔ اس کے ہاتھ میں کمان تھی جس میں تیر جوڑے وہ ان دونوں کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔ مونسہ بشرم و غیرت سے بھاگنے لگی۔ بدن پر بھیگے چپکے لباس نے اُسے عریاں کررکھا تھا۔ وہ شہزادے اور اس کے مصاحبوں کے سامنے اس لباس میں کس طرح کھڑی رہ سکتی تھی۔ شہزادے نے چیخ کر کہا: "مونسہ بھاگو مت رُک جاؤ۔ اگر نہ رکیں تو میں تمھیں تیر مار کے زخمی کردوں گا!"

فتحی شاہ کبھی مونسہ کی طرف دیکھتا کبھی شہزادے کو اور کبھی ان کے آدمیوں کو دیکھنے لگتا جو پچھلی دیوار سے برابر چڑھے اُترتے چلے آرہے تھے۔ اُس نے انھیں گنا وہ تقریباً پینتالیس پچاس تھے اور سبھی مسلح اور خونخوار تھے۔

مونسہ ابھی تک نہیں رُکی تھی آخر شہزادے نے ہولے سے تیر چھوڑ ہی دیا مونسہ گھبرا کے بیٹھ گئی اور شہزادہ بھاگ کے اس کے سر پر پہنچ گیا۔ بولا: "مونسہ! مجھ سے بھاگو مت، ورنہ پچھتاؤ گی!"

مونسہ نے جسم چھپانے کی کوشش کی۔ شہزادے نے پکڑ لیا اور بولا: "تم مجھ سے شرما رہی ہو، تمھیں مجھ سے حیا آرہی ہے! خوب! ارے میں تو گویا اسی گھر کا ایک فرد ہوں، کیا تم بھول گئیں کہ والد صاحب نے تمھیں اپنی بیٹی بنا رکھا ہے اور اس رشتے سے تم میری بہن ہوگئی ہو!"

فتحی شاہ کو اوباشوں نے گھیرے میں لے لیا۔ شہزادہ مونسہ کو زبردستی بٹھانے لگا۔ اس نے مونسہ کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ فتحی شاہ نے شہزادے کی یہ حرکت دیکھی لیکن منع نہ کرسکا کیونکہ اُسے تو تقریباً بیندرہ بیس آدمیوں نے نرغے میں لے رکھا تھا۔ شہزادے نے چلا کے حکم دیا: "دوستو! تم سب فتحی کو باندھ کے ڈال دو اور مکان میں گھس کے اپنا اصل کام انجام دو!"

فتحی شاہ کو باندھ کے شہزادے اور مونسہ کے روبرو ڈال دیا گیا اور شہزادے کے ساتھی مکان میں داخل ہوگئے۔

شہزادہ مونسہ کو پکڑے ہوئے فتحی شاہ کے سامنے پہنچا اور کہا: "تم یہ مت سمجھنا کہ میں سب کچھ بھول چکا ہوں، میں ایک عرصے سے اس بہترین موقع کی تلاش میں تھا جو مل چکا ہے، تم نے مونسہ سے شادی کرکے میرے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا تھا۔ آج میں اس سے زیادہ شدید تھپڑ تمھارے گال پر لگانا چاہتا ہوں۔"

پھر اس نے مونسہ کو سبزے پر گرادیا اور فتحی شاہ کو مخاطب کیا: "دیکھو یہ جو کچھ ہو رہا ہے مونسہ کو غور سے دیکھو، کیا تم نے بادشاہ سے میری چغلی نہیں کھائی تھی کہ میراں حسین انھیں قتل کردینا چاہتا ہے، کیا تم نے وقتاً فوقتاً بادشاہ کو یہ مشورہ نہیں دیا کہ میں بادشاہ کا بدخواہ اور دشمن ہوں!!"

فتحی شاہ مجبور اور بے بس سنتا اور دیکھتا رہا۔ اب شہزادے نے مونسہ کو مخاطب کیا: "مونسہ تم کیوں خاموش ہو، تم بھی تو کچھ بولو۔ تم بھی تو زبان رکھتی ہو!"

مونسہ نے جواب دیا: "ظلم اور زبردستی کے آگے زبان کھولنے سے حاصل؟"

شہزادے نے فتحی کے سامنے ہی وہ سب کچھ کر دیا جس کی امید تک نہ کی جاسکتی تھی مونسہ

تلملاتی مچلتی رہی۔ شہزادے نے فراغت کے بعد شہزادہ مونسہ سے کہا۔

"ہم باقاعدہ طور پر تمھیں اپنی بیوی تسلیم کر چکا ہوں۔ وہ رومال اور انگوٹھی میں نے اسی دن کے لئے تمھیں دی تھی۔ میں ایک مایوس عاشق اور ناکام آدھا شوہر ہوں، اس لئے جو کچھ تمھارے ساتھ ہوا اس سے تم معصوم نہ ہونا۔"

مونسہ نے خوفزدہ نظروں سے فتحی شاہ کو دیکھا جو بے بس بندھا پڑا تھا۔ اس کے بعد اس شہزادے کو نفرت اور حقارت سے دیکھا اور اس کے منہ پر تھوک کے گھٹنوں میں سر دے دیا اور آنسو بہانے لگی۔

شہزادے نے ہنس کر کہا: "ارے احمق! تو کیوں رو رہی ہے؟ رو میں تیرے دشمن، میرے محل کا بہترین آراستہ پیراستہ کمرہ تیرا منتظر ہے!"

مونسہ نے بے زاری سے کہا: "مجھے محل وحل نہیں چاہیئے تم بھی ایک برے انسان ثابت ہوئے ہو، یہاں سب ریاکار ہیں، کوئی کسی کا ہمدرد یا دوست نہیں!" اس کے بعد وہ کچھ اس طرح پھوٹ پھوٹ کے روئی کہ پُر کیف سماں اداس اور پھیکا ہو گیا۔

شہزادہ بڑی دیر تک معلوم نہیں کیا کچھ کہتا سنتا رہا، فتحی شاہ نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا تھا، اس نے فتحی شاہ کو اتنا غم زدہ اور دل برداشتہ کیا کہ وہ اس معاملے پر منفی انداز میں سوچنے لگا۔

کافی دیر بعد مکان کے دروازے سے شہزادے کا ایک ساتھی نمودار ہوا اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے شہزادے کو بلایا، شہزادے نے مسکراتے ہوئے فتحی شاہ سے کہا: "اچھا اب میں جا رہا ہوں، میں نے تم دونوں سے جیسا سلوک کیا ہے اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا، میں تم دونوں سے بار بار یہی کہوں گا کہ میری مخالفت اچھی بات نہیں۔ اگر تم مجھ سے انتقام لینا چاہو تو میں اس کے لئے ہر وقت تیار ہوں، خوش آمدید کہوں گا اور اگر دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ گے تو میں دوست بنا لوں گا۔ اور میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ یا تو تم میرے دوست بن جاؤ یا پھر پکے دشمن، درمیان کی کوئی راہ نہیں ہے جس پر چل کے تم زندہ رہ سکو۔"

فتحی شاہ اس کی باتیں خوابوں کی دنیا سے سنتا رہا اور مونسہ کے دل میں نشتر ٹوٹتے رہے!

مونسہ نے اسے آزاد کیا، دونوں ایک دوسرے سے نظریں نہیں ملا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے وہ مکان میں داخل ہوئے تو پتہ چلا شہزادہ ان کا سب کچھ لے جا چکا ہے وہ دونوں ہر طرح تباہ و برباد ہو چکے تھے مونسہ نے ڈبڈبائی آنکھوں سے فتحی کو دیکھا اور چرٹ کے کہنے لگی: "فتحی! جو کچھ ہوا اس میں بے قصور ہوں!"

فتحی نے جواب دیا: "مجھے معلوم ہے کیونکہ جو کچھ ہوا ہے میرے سامنے ہوا ہے!"

مونسہ نے پوچھا: "اب کیا ہو گا؟"

فتحی نے کہا: "میری سوچنے اور غور کرنے کی صلاحیت اس وقت بالکل کام نہیں کر رہی، پھر کسی وقت کوئی فیصلہ کروں گا!"

مونسہ نے کہا: "وہ ہمیں مفلس بھی کر گیا، ہمارا سب کچھ لے گیا!"

فتحی نے جواب دیا: "اس کا انتظام ہو جائے گا بس بادشاہ تک جانے کی دیر ہے۔"

مونسہ تو فتحی کی قوت برداشت سے خوش نہیں ہوتی تھی اس کی باتوں کے جو بھی جوابات دیئے تھے مونسہ ان کے لئے بالکل تیار نہ تھی، وہ تو فتحی کو یہ کہتے سننا چاہتی تھی کہ مونسہ! تم پر جو ظلم ہوا ہے اور شہزادے نے میری غیرت کو للکارا ہے، تم فکر نہ کرو اب یا تو میں زندہ رہوں گا یا شہزادہ۔" لیکن فتحی نے ایسی کوئی بات نہ کی تھی۔

فتحی، مونسہ کو چھوڑ کے بادشاہ کے پاس چلا گیا، بادشاہ نے اسے فوراً ہی اپنے روبرو طلب کر لیا پوچھا: "فتحی شاہ کیا بات ہے تم کچھ پریشان نظر آرہے ہو؟ کیا بات ہو گئی؟"

فتحی نے مونسہ کی ناموس کی بابت کوئی بات نہ کی، بس شہزادے کی لوٹ مار کی کہانی سنادی، آخر میں فتحی شاہ نے رو کر کہا: "حضور والا! میں اتنا مفلس ہو چکا ہوں کہ صبح و شام کی فکر میری جان ہی لے کے ٹلے گی۔"

بادشاہ فتحی کو سمجھاتا رہا اور اسی وقت خزانچی سے کہا کہ یہ جتنی رقم بھی مانگے انکار نہ کیا جائے یہ مسئلہ تو اس طرح بآسانی حل ہو گیا لیکن مونسہ اس حادثے کے بعد کمزور اور بیمار ہوتی چلی گئی۔

بادشاہ کو کسی نے پھر یہ خبر کر دی کہ شہزادہ میران حسین اسے قتل کر دینے کی سازشیں کر رہا ہے۔ بادشاہ کی غصے سے بری حالت تھی، اس نے نہایت ضبط و احتیاط سے کام لیا اور اپنے مصاحبین اور کارگزاروں سے میران حسین کی بابت ایسی باتیں کرنے لگا جس سے لوگ غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے کہ بادشاہ کا بیٹے کی جدائی میں بہت برا حال ہو رہا ہے، بادشاہ کو یقین تھا کہ شہزادے کو چھپا دینے میں صلابت خان کا پورا پورا ہاتھ ہے چنانچہ اس نے صلابت خان کو طلب کیا اور اس سے زمانہ سازی کی باتیں کرنے لگا بڑی دیر بعد اس نے صلابت خان سے کہا: "صلابت خان! اگر شہزادہ میران حسین اب بھی اسی طرح روپوش رہا تو ہم مر جائیں گے۔ ہم سوچتے ہیں کہ اس کی دھن کو اب بدل آنا چاہیئے، ہم کاروبار سلطنت سے اکتا چکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ عنان سلطنت میران حسین کے حوالے کر دیں۔"

صلابت خان نے دریافت کیا: "حضور نے اس ناچیز کو کس لئے طلب فرمایا ہے؟"

بادشاہ نے کہا: "مشورے کی غرض سے، ہم نے جو کچھ کہا ہے تم اس کا مطلب سمجھ گئے ہو یا نہیں؟"

صلابت خان کوئی بے وقوف تو تھا نہیں، جواب دیا: "شہزادہ ابھی نادان ہے، امور مملکت ایک دم اس کے حوالے کر دینا مصلحت کے خلاف ہے اس لئے اس ناچیز کی رائے میں حکومت کی باگ ڈور حضور اپنے ہی ہاتھ میں رکھیں یعنی عنان حکومت بتدریج شہزادے کے ہاتھ میں دی جائے تو مناسب ہوگا۔"

بادشاہ نے کہا: "پہلے تو ہم اس کی دھن کو لانا چاہتے ہیں تاکہ میران حسین کچھ دن عیش و عشرت کر لے" صلابت خان خاموش رہا۔

بادشاہ، صلابت خان کی اندرونی کیفیت کا جائزہ لیتا رہا، اس کی عمیق نظریں صلابت خان کے

دل میں اُتر چکی تھیں اور وہ یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ صلابت خاں کی خاموشی اور غور و فکر کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ کچھ دیر بعد صلابت خان نے سر اٹھایا اور عرض کیا: "لیکن حضورِ والا شہزادہ ہے کہاں؟ وہ تو کہیں روپوش ہو چکا ہے اسے حضور کے اس فیصلے کی خبر کس طرح پہنچائی جائے؟"

بادشاہ نے جواب دیا: "ہمارے ہاتھ پر تم لوگ ہو، یہ کام بھی تمھی لوگ کر سکتے ہو!"

صلابت خان نے عرض کیا: "بندہ کوشش کرے گا اور کچھ آدمی اس کام پر مامور کرے گا!"

شہزادے نے صلابت خان سے بادشاہ کے فیصلے کی خبر سنی تو بہت خوش ہوا اور باپ کے قدموں میں گر کے معافی مانگنے لگا۔ باپ نے قدموں سے اٹھا کے سینے سے لگا لیا اور پیار محبت کے نرم و شیریں کلمات سے اس کی ڈھارس بندھانے لگا۔ بادشاہ نے شہزادے کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے تیرا ہی تو ہے، ہو سکتا ہے کہ ہم نے غصے اور اشتعال میں کچھ ایسی باتیں کیں ہوں جن سے تجھے اذیت پہنچی ہو لیکن میراں حسین تو نے یہ تو سوچا ہوتا کہ میں تیرا باپ ہوں اور باپ اپنے بیٹے پر ظلم کس طرح کر سکتا ہے؟"

میراں حسین نے روتے ہوئے کہا: "حضور کو بعض غلط قسم کے مصاحبین نے مشتعل کر دیا تھا ورنہ حضور کی نرم دلی اور شفقتِ پدری سے یہ ناچیز خوب بھی طرح واقف ہے!"

بادشاہ نے کہا: "غالباً تیرا اشارہ فتحی شاہ کی طرف ہے!"

شہزادے نے کوئی جواب نہ دیا۔ بادشاہ نے کہا: "فتحی شاہ کی بیوی ہمارے وفادار امیر چنگیز خان مرحوم کی بیٹی ہے اور اسے ہم نے بھی بیٹی کہہ دیا ہے، بس اسی شرم اور لحاظ نے فتحی شاہ کو ہمارے بہت زیادہ قریب کر دیا ہے!"

شہزادے نے بادشاہ کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا: "یہ ناچیز تو خود کو حضور کا ادنا غلام تصور کرتا ہے اور اگر حضور بندے کو اس وقت اپنے دستِ مبارک سے قتل فرما دیں تو ناچیز یہ سمجھے گا کہ مجھ سے ماضی میں حضورِ والا کی شان میں جو گستاخیاں اور بے ادبیاں ہوتی رہیں، حضورِ والا اس کی تادیب فرما رہے ہیں!"

بادشاہ نے اس کے سر پر پیار سے چپت لگا دی، بولا: "تم ہمیں ظالم اور سنگ دل سمجھتے ہو، بخدا، جنابِ امیر کی قسم ہم تو تمھیں سزا دینے کی بابت سوچ بھی نہیں سکتے!"

فتحی شاہ کو جب یہ خبر ملی کہ باپ بیٹے میں ملاپ ہو گیا ہے تو وہ بہت گھبرا گیا۔ اس نے مونسہ کو اس عجیب و غریب واقعے کی خبر سناتے ہوئے بے چارگی سے کہا: "مونسہ! اب کیا ہوگا، بادشاہ کتنے ناقابلِ اعتبار ہوتے ہیں، اندازہ آج ہوا!"

"مونسہ نے بیچارگی سے کہا: "یہ ظالم و جابر اور مصلحت اندیش لوگ قابلِ اعتبار کس طرح ہو سکتے ہیں، تم نے ان کی صحبت میں شب و روز گزار کے بھی یہ نکتہ نہ سمجھا!"

فتحی شاہ بہت زیادہ اداس تھا، اب اسے بار بار یہ احساس ستانے لگا تھا کہ اسے مونسہ سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی کیونکہ اس کا رقیب کوئی معمولی شخص نہیں تھا، شہزادہ تھا، ولی عہد، احمد نگر کے مستقبل کا حکمراں۔ اس نے مونسہ سے پوچھا: "ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

مونسہ نے بے دلی سے جواب دیا: "یہ تمھارا اپنا معاملہ ہے، تم خود فیصلہ کرو کہ تمھیں کیا کرنا چاہیئے؟"

فنتی شاہ اس کی بے تعلقی کا مطلب نہیں سمجھ سکا، پریشانی سے سوال کیا: "کیا ہم دونوں کے معاملے الگ الگ بھی ہو سکتے ہیں؟ کیا اس معاملے سے تمہارا کوئی تعلق نہیں؟"

مونسہ نے اسی بے دلی اور بے رُخی سے جواب دیا: "ہاں ادھر کچھ دنوں سے میں یہ محسوس کرنے لگی ہوں کہ ہم دونوں کی ایک راہ نہیں ہے اور شاید تم بھی یہی کچھ سوچا کرتے ہو!"

فنتی شاہ حیران و پریشان ہو کے مونسہ کو دیکھنے لگا، اُسے تعجب تھا کہ مونسہ کو اس کی سوچ کا علم کیوں کر ہوا؟ کہیں وہ بحالت خواب بڑبڑایا تو نہیں؟ اس نے پریشانی سے سوال کیا: "مونسہ! تم اس قسم کی باتیں کیوں کر رہی ہو؟"

مونسہ نے افسردہ دلی سے جواب دیا: "فنتی! ہم نے ایک دوسرے سے شادی کر کے سخت غلطی کی جس کی تلافی ناممکن ہے۔"

فنتی کو شاید کسی حد تک اس انکشاف سے خوشی بھی ہوئی وہ مونسہ کو چاہتا تھا لیکن شہزادے کا مقابلہ کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس نے مونسہ کو اور زیادہ ٹٹولنا چاہا، پوچھا: "اگر تم واقعی یہ محسوس کرنے لگی ہو کہ جو کچھ ہوا اس کی تلافی ناممکن ہے تو پھر کیا تمھارا یہ مشورہ ہے کہ ہمیں موجودہ تبدیلیوں کی فکر نہیں کرنی چاہیے اور جو خطرات ہم دونوں کے گرد منڈلانے والے ہیں ان سے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیئے؟"

مونسہ نے جواب دیا: "موجودہ صورتِ حال کا مقابلہ ہمیں کس طرح کرنا پڑے گا، اس بات کا فیصلہ ہمیں الگ الگ کرنا ہے۔ تمھیں ان سے کس طرح عہدہ برآ ہونا ہے، خود سوچو اور میں ان سے کس طرح نپٹوں گی، خود فیصلہ کروں گی کیونکہ ہم دونوں کے مفاد الگ الگ فیصلوں سے وابستہ ہیں اور کوئی ایسا اقدام جو ہم دونوں اتفاقِ رائے سے دونوں کے مفاد میں اٹھانا چاہیں گے، کسی نہ کسی کو نقصان پہنچا جائے گا!"

فنتی شاہ نے اس کا یہ مطلب لیا کہ شاید مونسہ شہزادے کے بجائے اس سے شادی کر کے پچھتا رہی ہے اس نے سوچا، خوب دونوں کا اندازِ فکر یکساں ہے، دونوں ایک ہی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ فنتی نے مونسہ کے نمایاں پیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: "تم نے جو فیصلہ بھی کیا ہو گا، اس کا تعلق تمھاری اپنی ذات سے ہو گا لیکن اس کا کیا ہو گا جس کے وجود میں میرا اپنا خون بھی شامل ہو گا!"

مونسہ نے بے چین ہو کے جواب دیا: "اس وجود کا فیصلہ میں خود کروں گی کیونکہ اسے میں پرورش کر رہی ہوں اور یہ حق بھی مجھی کو حاصل ہے کہ اس نادان اور سوچ سمجھ سے محروم ذات کی بہتری کس بات میں ہے!"

فنتی شاہ نے تلخی سے کہا: "اسے میں اپنے پاس رکھوں گا۔ ہاں شیر خوارگی کی مدت یہ تمھاری آغوش میں ضرور گزار سکتا ہے!"

مونسہ نے غصے اور نفرت سے آنکھیں بند کر لیں اور اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تنفّر سا پیدا ہو گیا۔

بادشاہ نے صلابت خان کو دندراج پور کے قلعہ میں نظر بند کرا دیا اور شہزادے سے کہا کہ ہم نے صلابت خان کو اس لیئے یہ سزا دی ہے کہ شاید یہی وہ شخص ہے جس نے ہم دونوں میں اختلاف پیدا کرایا اور غلط فہمیاں بڑھا کر رہا!

صلابت خان کی جگہ قاسم بیگ اور میرزا تقی نامی دو امیر مقرر کیئے گئے۔

بادشاہ نے میراں حسین کی دلھن کو لانے کا شاندار اہتمام کیا اور ایک مثالی جشن مسرت منعقد ہوا۔ احمد نگر کے در و دیواریوں روشن ہو گئے جیسے چراغوں کا جنگل اگ آیا ہو۔ خوشی کے شادیانوں نے مغموم دلوں کو بھی خوش کر دیا۔ بیجاپور کے امرا اور معززین کی ایک جماعت میراں حسین کی دلھن کو احمد نگر پہنچانے آئی۔ اس تقریب میں جن لوگوں نے بڑھ چڑھ کے حصہ لیا ان میں فتحی شاہ بھی شامل تھا۔ مولنہ اندر اندر سلگ رہی تھی۔ ان دونوں میں کئی بار تلخ و ترش باتیں بھی ہوئیں۔

میراں حسین نے فتحی شاہ کو حکم دیا تھا کہ وہ اس تقریب میں مولنہ کو ساتھ لائے لیکن مولنہ نے فتحی شاہ کے ساتھ جانے سے اچانک انکار کر دیا اور کہا "فتحی! میں تمھیں بتا چکی ہوں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کیلئے کچھ نہیں۔ مولنہ نہیں گے شہزادے کے تقریب میں تم تنہا شریک رہو، میں کیا چاہتی ہوں اور اس سلسلے میں، میں نے کیا فیصلہ کیا ہے یہ تمھیں کچھ عرصے بعد معلوم ہو گا!"

فتحی شاہ خفا ہو کر چلا گیا اور کافی رات گئے تک باہر ہی رہا۔

میراں حسین رنگ رلیوں میں پھنسا ہوا تھا، وہ کئی بار فتحی شاہ کے ساتھ گھر بھی آیا لیکن مولنہ ہمیشہ ان دونوں سے دور ہی رہنے کی کوشش کرتی رہی، فتحی شاہ بادشاہ کا مصاحب تھا اور اب میراں حسین کی مصاحبت کے خواب دیکھ رہا تھا فتحی شاہ کے نرم رویے نے شہزادے کو بھی نرم کر دیا اور وہ اس کا خیال رکھنے لگا۔

جب مولنہ بار بار بے رخی سے پیش آئی تو شہزادے نے فتحی شاہ سے شکایت کی۔ "آخر مولنہ چاہتی کیا ہے؟"

فتحی شاہ نے جواب دیا۔ "اس کا صحیح علم تو مولنہ ہی کو ہو گا لیکن جہاں تک میں سمجھا ہوں میری طرح وہ بھی نادم اور سر مسار سی رہتی ہے، شہزادے کی مخالفت اور ناراضی شاید اسے بھی پشیمان رکھتی ہے؟"

شہزادے نے پوچھا۔ "پھر بات آگے کس طرح بڑھے گی؟"

فتحی شاہ نے کرب و اذیت سے کہا۔ "بچے کی ولادت کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا!"

شہزادہ چپ ہو رہا۔ ایک دن فتحی شاہ کی عدم موجودگی میں وہ مولنہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس دن مولنہ اس سے ذرا بھی نہ گھبرائی مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ شہزادہ اس تبدیلی پر بہت خوش ہوا، اس نے مولنہ کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن مولنہ نے ہاتھ کھینچ لیا۔ بولی "ابھی نہیں، ذرا صبر!"

شہزادے نے بے پایاں خوشی کا اظہار کیا، بولا: "مونسہ! بیجاپور کے ابراہیم عادل کی بہن میری بیوی ہے اور خوش قسمتی سے آج کل مجھے اس کی آغوش بھی حاصل ہے لیکن میں تمھاری کمی برابر محسوس کرتا رہتا ہوں، تمھارے بغیر میری زندگی ناقص و نامکمل ہے!"

مونسہ کے پاس ایک ہی جواب تھا: "ایک ذرا صبر، کچھ توقف ذرا انتظار!"

شہزادہ، اپنی پچھلی سختیوں اور غلطیوں پر شرمسار تھا کہنے لگا: "مونسہ! میں نے جو زیادتیاں کی ہیں، ان پر شرمسار اور نادم ہوں کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گی؟"

مونسہ کے چہرے پر اذیت اور دُکھ کی لہریں ابھریں اور اس نے سرد آہ بھر کے سر جھکا لیا بولی: "اب انھیں یاد نہ دلائیں تو بہتر ہے، جو گزر گیا سو گزر گیا جو ہو گیا اس کی تلافی معافیوں سے کس طرح ہو سکتی ہے؟"

شہزادے نے کہا: "لیکن میں تو خود کو مجرم اور گناہگار ہی سمجھتا ہوں اور اندر کا یہ احساس گناہ اس وقت تک مجھے پریشان ہی کرتا رہے گا جب تک تم مجھے معاف نہ کر دو گی!"

"یہ فضول باتیں ہیں!" مونسہ نے کہا: "اگر میں زبان سے تمھیں معاف بھی کر دوں گی تو اس سے دل کا کرب تھوڑے ہی دور ہو گا؟ میں اپنا کرب تو کسی سے معافی مانگ کر بھی دُور نہیں کر سکتی!"

شہزادے نے اس کا ہاتھ ایک بار پھر پکڑنا چاہا لیکن مونسہ نے ایسا نہیں کرنے دیا۔

شہزادے نے افسوس سے کہا: "کاش یہ فیصلہ تم نے پہلے ہی کر لیا ہوتا تو آج اس کرب اور بے چینی سے واسطہ نہ پڑتا!"

مونسہ نے جواب دیا: "یہ کرب تو انسان کا مقدر ہے اگر یہ دُکھ نہ ہوتا تو کسی اور دُکھ کا سامنا کرنا پڑتا!"

شہزادہ وہاں کچھ دیر اور ٹھیرا اس کے بعد واپس چلا آیا، اب اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ کچھ انتظار کے بعد آخر مونسہ اسے مل ہی جائے گی، اسے محرومی اور ناکامی سے سخت چڑ تھی اور وہ ان کی بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو ہر وقت تیار رہتا تھا۔

مونسہ کو اور زیادہ تنہائی محسوس ہونے لگی، وہ خود کو شدت سے اکیلا محسوس کرنے لگی، بستر میں گر کر دیر تک آنسو بہاتی رہتی اور دل کا بوجھ تھا کہ آنسوؤں کا دریا بہا دینے کے بعد بھی ہلکا ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ گھر کی نگہبانی اور نگرانی چند دربانوں کے ذمے تھی لیکن یہ دربان بھی کچھ زیادہ مستعد نہ تھے۔ شہزادہ جب بھی اندر آنا چاہتا آجاتا، دربانوں میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ شہزادے کو روک سکتے اور کم ہمت شوہر میں ویسے بھی جرأت کی کمی تھی۔

اندھیری رات میں فتح شاہ مکان میں داخل ہوا تو وہ تنہا نہیں تھا اس کے ساتھ

ایک شخص اور تھا یہ شخص لبادے میں لپٹا ہوا تھا اور چہرہ ایک بڑے رومال میں چھپا رکھا تھا۔ فنی نے سرگوشی میں مونسہ کو مطلع کیا کہ "بادشاہ اپنی منہ بولی بیٹی سے ملنے تشریف لائے ہیں!"

مونسہ احتراماً کھڑی ہو گئی۔ بادشاہ نے اس کے قریب پہنچ کے چہرے سے رومال ہٹا دیا اور بے اختیار اسے سینے سے لگا لیا۔ مونسہ بھی سینے سے لگ کے زار و قطار رونے لگی۔ بالکل اس طرح جیسے لڑکیاں شوہر کے گھر جانے سے پہلے رویا کرتی ہیں۔

بادشاہ نے فنی شاہ کو ہٹا دیا اور تخلیئے میں مونسہ سے بات کرنے لگا۔ اس نے پوچھا "بیٹی اب تجھے کوئی تکلیف ہے؟"

مونسہ جواب کے بجائے رونے لگی۔ بادشاہ نے پھر پوچھا "تجھے کوئی تکلیف ہے؟"

مونسہ نے بھرائی آواز میں جواب دیا "کوئی ایک تکلیف ہو تو بتا بھی دوں۔ مجھے زمانے نے بڑے دکھ دیئے ہیں، میں کس کس کو بیان کروں؟"

بادشاہ نے سوال کیا "کیا شہزادہ پھر یہاں آیا تھا؟"

مونسہ نے جواب دیا "وہ اکثر یہاں آتا رہتا ہے اور پریشان کر کے چلا جاتا ہے۔"

بادشاہ نے حیرت اور افسوس سے کہا "وہ آخری بار کب آیا تھا؟"

"آج ہی اور کافی دیر پریشان کرتا رہا!" مونسہ برابر روئے جا رہی تھی۔

"وہ کیا کہتا تھا؟"

"کہتا تھا، میں اس سے شادی کر لوں!"

"ناخلف، بدمعاش، آوارہ!" بادشاہ بڑبڑایا "بیٹی ہم نے اسے عاق کر دیا ہے لیکن اس کا اعلان ابھی نہیں کیا، عنقریب کر دیا جائے گا!"

مونسہ نے درخواست کی "میں تو حضور والا سے یہ گذارش کروں گی کہ مجھے یہاں سے کہیں اور بھیج دیا جائے، ورنہ احمد نگر کی سرزمین تو میری خوشیوں کو ہضم کر چکی ہے!"

بادشاہ نے کہا "مت گھبرا بیٹی تو مت گھبرا، ہم جلدی ہی تیری مصیبتیں ختم کر دیں گے۔ ہم نے تیرے باپ چنگیز خان کے حق مارے جو ذہنی اور روحانی صدمہ اٹھایا ہے، یہ اسی کا اثر ہے کہ ہمارا کاروبار سلطنت کی طرف دل ہی راغب نہیں ہوتا اور دنیا حقیر نظر آتی ہے، ہم جب بھی دنیا کی طرف غور کرتے ہیں تو دل اچاٹ ہو جاتا ہے!"

مونسہ دیر تک روتی رہی اور بادشاہ اسے تسلیاں دیتا رہا۔

جاتے وقت بادشاہ نے اسے ایک بار پھر یقین دلایا کہ "مونسہ! تو نہ گھبرا شہزادے کی چیرہ دستیوں اور فریاد دہیوں کا علاج سوچ لیا گیا ہے۔ اب تجھے کیا کسی کو بھی اس کے ظلم و جبر کا شکار نہیں بننا پڑے گا!"

مونسہ نے درخواست کی "میں حضور والا سے ایک درخواست کروں گی حضور والا میری

رہائش کے آس پاس خاردار درختوں اور جھاڑیوں کی باڑھ بھری کردیں، یہ جھاڑ اتنی گھنیری اور بڑی ہونی چاہیئے کہ کوئی اُسے عبور نہ کرسکے۔"

بادشاہ نے جواب دیا۔"یہ کام کل ہی انجام پاجائے گا!"

مونسہ نے دوسری درخواست کی۔"شہزادے کو میری وجہ سے کوئی سزا نہ دی جائے!"

بادشاہ نے چونک کے مونسہ کو دیکھا" پوچھا۔"یہ کیوں؟ اس میں تیرا کوئی مفاد پنہاں ہے؟"

"نہیں!" مونسہ نے کہا۔"غالباً شہزادے کے دوسرے ہی جرائم اتنے زیادہ ہیں کہ اگر حضورِ والا اسے سزا دینا چاہیں گے تو اس سزا کے جواز میں وہی بہت کافی ہوں گے رہا میرا معاملہ تو میں اپنا مقدمہ خدا کے روبرو لے جاؤں گی اور اس کا فیصلہ اللہ تعالےٰ سے طلب کروں گی!"

بادشاہ نے شفقت سے مونسہ کے سر پہ ہاتھ پھیرا بولا۔"تو بڑے ظرف کی ہے بیٹی۔ہم چلتے ہیں، ہمارے اہم فیصلے کا انتظار کر!"

بادشاہ محل واپس گیا اور فتحی شاہ نے بادشاہ اور مونسہ کے درمیان ہونے والی بات چیت کی بابت دریافت کیا جس کا مونسہ نے کوئی خاص جواب نہیں دیا۔مونسہ کو شاید پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ بادشاہ فتحی شاہ پہ اعتبار نہیں کرتا۔فتحی شاہ مونسہ کی سردمہری اور بے رخی سے کڑھا لیکن وہ یہ بھی خوب جانتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان بتدریج بڑھتی رہنے والی خلیج ان دونوں کا مقدر ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے اسے جاری رہنا چاہیئے۔

بادشاہ نے صلابت خان کے قائم مقام قاسم بیگ اور میرزا نقی کو طلب کیا اور ان سے نہایت خوش اخلاقی سے پیش آیا۔کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد بادشاہ نے کہا۔"تم لوگ میراں حسین کو سمجھاؤ کہ زندگی عورت ہی کا نام نہیں ہے، وہ احمد نگر کا ولی عہد ہے، ہمارا کوئی بھروسہ نہیں۔کسی وقت بھی رخصت ہوسکتے ہیں، میراں حسین سے کہو، ہماری صحبت میں رہا کرے، اسے رموزِ مملکت سمجھنے ہیں، کاروبارِ سلطنت انجام دینا ہے۔"یہ کہتے کہتے بادشاہ کی آنکھیں نم ہوگئیں، وہ رونے لگا۔بھرائی آواز میں کہا۔"میراں حسین ہمارا جیتا بیٹا ہے، ہمیں اس سے عشق کی حد تک محبت ہے لیکن اس کا یہ حال ہے کہ ہمیں دیکھنے تک نہیں آتا۔اپنی بیوی یا کمتر درجے کے مصاحبین کے پاس ہر وقت موجود رہتا ہے، تم لوگ حکومت کے اعضا ہو۔میراں حسین کو سمجھا بجھا کے ہمارے پاس لاؤ، ہم اسے دیکھنا چاہتے ہیں، اسے سینے سے لگاکے پیار کرنا چاہتے ہیں۔"

قاسم بیگ اور میرزا نقی بادشاہ کی تقریر سے بہت متاثر ہوئے اور وعدہ کیا کہ وہ شہزادے کو ساتھ لے کے بہت جلد دوبارہ حاضر ہوئے ہوں گے۔

تیسرے دن دونوں شہزادے کو لے کر حاضر ہوگئے۔بادشاہ نے شہزادے کو گلے لگایا

اور آنسوؤں سے اپنی داڑھی اور شہزادے کی پشت تر کرتا رہا۔ شہزادہ بھی رو دیا۔ فہمی شاہ بھی یہ رقت انگیز منظر دیکھ رہا تھا۔ حاضرینِ مجلس بھی برداشت نہ کر سکے ان کے دل بھی بھر آئے۔ بادشاہ نے شہزادے کو اپنے سامنے بٹھایا اور دیر تک شفقت کا اظہار کرتا رہا۔ اس نے چپکے میں شہزادے کو ڈانٹا بھی لیکن بار بار یہی جتاتا رہا کہ آخر احمد نگر پر شہزادے ہی کو حکومت کرنی ہے۔ ان دنوں بادشاہ کا قیام عمارت بغداد سے متصل ایک حجرہ میں تھا۔ یہ آراستہ اور سجا ہوا حجرہ بڑا ہی دل کش تھا۔ بادشاہ نے شہزادے سے کہا کہ تمھیں چند دن اسی حجرے میں رہنا ہے۔ تمھیں یہیں رموزِ مملکت سکھائے جائیں گے اور یہیں امورِ سلطنت چلانے کے گر بتائے جائیں گے۔"

شہزادہ باپ کی مہربانیوں پر بہت خوش تھا۔ رات کو بادشاہ شہزادے کے حجرے میں دیر تک موجود رہا۔ بادشاہ نے شہزادے کو سو جانے کا حکم دیا اور خود نماز پڑھنے لگا۔ بادشاہ دیر تک نماز پڑھتا رہا۔ شہزادہ باپ کے تقوے سے بہت متاثر ہوا اور دیر تک نظارہ کرنے کے بعد سو گیا۔ کافی دیر بعد جب بادشاہ کو شہزادے کے سو جانے کا یقین ہو گیا تو وہ مصلّے سے اٹھا اور شہزادے کو گہری نیند میں سوتا ہوا دیکھتا رہا پھر اس نے شہزادے پر تو شک ڈال دی اور تو شک پر لحاف ڈال دیا۔ شہزادہ گہری نیند میں سویا ہوا تھا۔ اس کے بعد بادشاہ نے حجرے کی چند ایسی چیزیں جنھیں آگ بآسانی لگ سکتی تھی، شہزادے کی مسہری کے آس پاس پھیلا دیں اور سب کے آخر میں اس نے کانوں کی شمع سے کپڑوں میں آگ لگا دی اور پھرتی سے بھاگ کر حجرے سے نکل آیا۔ حجرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا اور عمارتِ بغداد میں روپوش ہو گیا۔

سارے کمرے میں دھواں پھیل گیا اور یہی دھواں جب شہزادے کی ناک میں داخل ہوا تو اسے کھانسی آنے لگی اور اس کی آنکھ کھل گئی، وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔ اس نے اپنے آس پاس بہت ساری چیزیں جلتی ہوئی دیکھیں، سارے کمرے میں دھواں بھر چکا تھا۔ وہ مسہری سے کود کے دروازے کی طرف بھاگا اور اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ تو باہر سے بند تھا۔ شہزادے نے دروازے پر مکّوں کی بارش کر دی اور زور زور سے چیخنے لگا لیکن یہ آوازیں عمارتِ بغداد تک بھی نہیں پہنچ سکتی تھیں۔

فہمی شاہ، بادشاہ سے رخصت ہو کے اسی حجرے کے قریب سے گزرا، اس نے حجرے کے اندر آگ لگی دیکھی اور دروازے کے پیٹنے اور شہزادے کی چیخ چیخ کر رونے کی آوازیں بھی سنیں، اُسے سمجھتے دیر نہ لگی کہ یقیناً یہ حرکت بادشاہ کی ہے، وہ گھوم کر دوسرے دروازے تک پہنچا۔ رات کے اندھیرے میں کوئی اسے دیکھ نہ سکتا تھا پھر اس جگہ سے دوسرے محلات ذرا فاصلے پر تھے اور بادشاہ نے اس حجرے کو شہزادے کو مار دینے کے لیے اسی وجہ سے پسند کیا تھا۔ پہلے تو فہمی شاہ نے سوچا کہ چپ ہو کر رہ جائے لیکن پھر یہ سوچا کہ اگر وہ اس وقت شہزادے پر احسان کر دے گا تو شہزادہ اس کا زندگی

بھر احسان مند رہے گا۔ اس نے دروازے سے کان لگا دیے اور سرگوشی سے پوچھا: "کیا بات ہے؟"

شہزادے نے بے چینی سے کہا: "دروازہ کھولو، خدا کے لئے دروازہ کھول دو، رسول ﷺ کی خاطر، جناب امیر کا واسطہ، ائمہ دوازدہ کے صدقے میں، چہاردہ معصومین کے صدقے میں!"

فتحی شاہ نے آس پاس دیکھ کر چپکے سے دروازہ کھول دیا۔ شہزادے نے باہر نکلتے ہی اپنے محسن کو نظر بھر کے دیکھا اور بے ساختہ گلے لگا کے بولا: "فتحی! میں تمھارا یہ احسان زندگی بھر نہ بھولوں گا، اب تم مجھے قاسم بیگ اور میرزا تقی تک پہنچا دو تاکہ میں ان شریف آدمیوں کو یہ بتا سکوں کہ دیکھو میرے ظالم اور دغا باز باپ نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا ہے!"

فتحی شاہ نے دروازہ پھر بند کر دیا اور شہزادے کو قاسم بیگ اور میرزا تقی کے پاس پہنچا دیا۔ ان دونوں نے بھی بادشاہ کی یہ حرکت بالکل پسند نہ کی اور شہزادے کو خاموشی سے دولت آباد روانہ کر دیا۔ فتحی شاہ کو تینوں نے منع کر دیا کہ شہزادے کی دولت آباد کی روانگی کو ہر طرح راز میں رکھا جائے۔ فتحی شاہ نے واقعی اس واقعے کو راز میں ہی رکھا، حد تو یہ ہے کہ اس نے اس کا ذکر بیوی تک سے نہ کیا۔ تیسرے دن بادشاہ نے فتحی شاہ کو فخریہ بتایا کہ اس نے ظالم و جابر شہزادے کو پھونک دیا۔ فتحی شاہ نے نہ خوشی کا اظہار کیا نہ غم کا، بس خاموش رہا۔ بادشاہ جلے ہوئے حجرے میں داخل ہوا۔ وہاں جلی ہوئی چیزوں کی راکھ کا ڈھیر موجود تھا۔ توشک لحاف اور مسہری کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بادشاہ نے چند ادھ جلی چیزیں بھی دیکھیں اور معلوم نہیں کس طرح اس شبہے میں مبتلا ہو گیا کہ شہزادے کو نکال دیا گیا ہے، اس نے فتحی شاہ کو قاہرانہ نظروں سے گھورا اور پوچھا: "اس رات ہماری صحبت سے اٹھ کر جانے والے تم آخری آدمی تھے۔ سچ سچ بتاؤ کہیں تم نے اسے نکال تو نہیں دیا؟"

فتحی شاہ تھر تھر کانپنے لگا لیکن فردِ جرم سے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے غصے میں ایک طمانچہ رسید کیا، بولا: "ہمیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے، تمھاری موت تمھارے گرد منڈلا رہی ہے، جرم کا اعتراف کر لو، ورنہ اس جرم میں جو دوسرے لوگ شریک ہیں، ہم انھیں گواہ کے بطور تمھارے سامنے پیش کر کے تمھیں قتل کرا دیں گے!"

فتحی شاہ ڈر کے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ بادشاہ نے چیخ کر کہا۔

"دغا باز و غدار و نمک حرامو! یہ تم نے کیا کر دیا۔ آہ اب تو وہ ہمارے لئے بلائے بے درماں بن جائے گا؟"

بادشاہ نے فتحی شاہ کو گریبان سے پکڑ لیا اور عمارتِ بغداد میں واپس گیا۔ وہاں اس نے قاسم بیگ اور میرزا تقی کو بھی طلب کیا اور ان کا جرم ان کے علم میں لایا گیا۔ یہ دونوں بھی تھر تھر کانپنے لگے۔

بادشاہ نے چلا کے کہا: "صلابت خان کو واپس لایا جائے اور انھیں معزول سمجھا جائے!"

فتحی شاہ نے آہستہ سے عرض کیا: "حضور! اس ناچیز کو جو بھی سزا دینا چاہیں دے لیں، میں

ہنسی خوشی بھگتنے کو تیار ہوں لیکن ایسی غلطی ہرگز نہ کیجئے کہ دو امرا کی موجودگی میں کسی معزول امیر کو ان موجود امرا کے منصب کے لئے طلب کر لیا جائے، یہ دونوں ہی دشمن ہو جائیں گے اور دوست کو اور دشمن بنا دیں گے!"

بادشاہ نے اس مشورے کو پسند کیا اور قاسم بیگ اور میرزا تقی سے کہا۔ "تم لوگ بدستور کام کرتے رہو، جس شخص کو ایک مرتبہ معزول کر دیا گیا، اب اسے بلانا کیا مطلب رکھتا ہے!" پھر اس نے پوچھا: "اچھا تم لوگ ہمیں یہ تو بتا دو کہ ان دنوں میراں حسین ہے کہاں؟" اُمرا نے لاعلمی کا اظہار کیا، بولے "یہاں سے نکال دینے کے ہم البتہ گناہگار ہیں، احمد نگر سے نکل کر شہزادہ کہاں گیا، ہمیں بالکل نہیں معلوم!"

فکرمند بادشاہ عمارتِ بغداد میں بیٹھ کر میراں حسین کو ٹھکانے لگا دینے کے منصوبے بنا تا تھا۔

اس واقعہ کی خبر فتحی شاہ نے جب مونسہ کو سنائی تو اس نے کوئی دلچسپی نہ لی، بولی: "شاہوں کے محل میں ایسے ہی کھیل کھیلے جاتے ہیں، کوئی خاص بات نہیں!"

فتحی شاہ نے پوچھا: "ہمارے گھر کے آس پاس یہ خاردار درختوں کی نہایت گھنی جھاڑ کس نے کھڑی کی؟"

مونسہ نے جواب دیا: "میں نے بادشاہ سے درخواست کی تھی، بادشاہ نے آدمی بھیج دیے، جو یہ کام کر کے چلے گئے!"

فتحی شاہ نے پوچھا: "لیکن اس کا فائدہ یا اس کا مطلب! غرض و غایت؟ میں سمجھا نہیں!"

مونسہ نے جواب دیا: "اس طرح چوری چھپے آنے والوں کا راستہ بند ہو گیا ہے، تم خود تو کبھی حفاظت کا خیال نہیں کرتے۔ میں نے سوچا یہ مسئلہ خاص میری ذات سے تعلق رکھتا ہے اس لیے حل بھی مجھی کو کرنا چاہیئے!"

کچھ دنوں کے لئے بظاہر احمد نگر کی سیاست پر جمود طاری ہو گیا لیکن اندر ہی اندر سازشیں پھیلتی رہیں، امرا نے بادشاہ کو دیوانہ تسلیم کر لیا تھا اور ان کی ہمدردیاں شہزادے کے حق میں تھیں، ان کا شہزادے سے رابطہ قائم تھا اور وہ درپردہ شہزادے کو یہ یقین دلا رہے تھے کہ اسے بہت جلد احمد نگر کے تاج و تخت کا قبضہ دلایا جائے گا۔

مونسہ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا فتحی شاہ بہت خوش ہوا لیکن مونسہ بدستور اداس ہی رہی، مونسہ کا وہم عروج پر تھا اور مکان کے گرد قائم کئے ہوئے جھاڑ جھنکار کے حصار میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا یہاں تک کہ اس سے گزر کے گھر میں داخلہ تک محال ہونے لگا۔

اسی دوران بادشاہ کو کھانے میں زہر دے کر ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ بچ گیا۔ قے اور دست اتنے آئے کہ بادشاہ کی صحت تباہ ہو گئی، ایک دن بادشاہ بیت الخلاء سے نکل کر عمارت بغداد میں بیٹھا تھا کہ ہلکا سا شور اٹھا، بادشاہ نے فتحی شاہ سے کہا۔ "ذرا باہر نکل کے معلوم تو کرو یہ شور کیسا ہے؟"

فتح شاہ باہر نکل گیا اور اس کے جاتے ہی چالیس پچاس سپاہی ننگی تلواریں لئے بادشاہ کے حجرے میں داخل ہو گئے ان میں سب سے آگے شہزادہ تھا، بادشاہ گھبرا گیا۔ شہزادہ غصے میں آگے بڑھا اور تلوار کی نوک باپ کے پیٹ کی طرف بڑھائی، بادشاہ گھبرا کے لیٹ گیا اور ہتھیلیوں سے تلوار سے پیٹ بچانے کی کوشش کی۔

شہزادے نے تلوار کی نوک پیٹ پر رکھ دی اور دانت پیستا ہوا بولا: "جی چاہتا ہے کہ تلوار اتنی زور سے دبا دوں کہ یہ دوسری طرف نکل جائے!"

بیمار اور کمزور بادشاہ نے پھٹی پھٹی نظروں سے شہزادے کو دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھر کے کہا: "مردود اور عاق شدہ فرزند! ہم چند روزہ مہمان ہیں تو ہمیں قتل کر کے کیوں عذاب خداوندی مول لینا چاہتا ہے، اگر جی میں آئے تو رحم کر، ورنہ جو سمجھ میں آئے کر گزر، ہم تجھ سے التجا نہیں کریں گے!"

شہزادے نے اپنے اوباش ساتھیوں کو حکم دیا: "بادشاہ کو عمارت بغداد سے نیچے حمام میں پہنچایا جائے!"

پستہ قامت مصاحب آگے بڑھا اور نہایت بے ادبی سے بادشاہ کا گریبان پکڑ لیا پھر اسی طرح کھینچتا گھسیٹتا نیچے حمام میں لے گیا۔ شہزادے نے بادشاہ کو حمام میں دھکیل کر اس کے دروازے بند کر دیئے اور اوباشوں کو حکم دیا کہ حمام کے تمام سوراخ تک بند کر دیئے جائیں اور بھٹیوں میں آگ جلادی جائے۔ یہ دفعتہً کسی بات کا خیال آگیا، کہا: "حمام میں پانی کی ایک بوند بھی نہیں ہونی چاہیئے۔" حمام کے نگراں نے جواب دیا: "بہتر ہے وہاں پانی کی ایک بوند بھی نہیں ہے!"

بند حمام کی بھٹیوں میں آگ جلادی گئی شہزادہ حمام کے دروازے سے کان لگائے چیختے چلاتے باپ کی آوازیں سنتا رہا، سفاکی اس کے چہرے پر شام کی سیاہی کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ باپ کی آہ وزاری اور فریاد پر وہ ہونٹوں کو بھینچ کر بولا: "او جہنم کے کندے! کیا تو نے یہی سزا ایک دن مجھے دینے کی کوشش نہیں کی تھی؟"

یہ رجب کی ۱۰ تاریخ تھی اور ۹۹۶ھ صبح کے وقت شہزادہ باپ کو جلتا بھنتا حمام میں چھوڑ کے تاج و تخت سنبھالنے چلا گیا۔ فتحی شاہ اب باپ کے بجائے بیٹے کا مصاحب ہو چکا تھا۔ شہزادے نے فتحی کو شکر گزار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا: "فتحی! میں تمہارا احسان زندگی بھر نہ بھولوں گا!"

فتحی شاہ نے جواب دیا: "اگر میری جان بھی آپ پر قربان ہو سکتی تو میں دریغ نہ کرتا!"

شہزادے نے قدرے سکوت کے بعد پوچھا: "اور وہ مولسری کیسی ہے؟"

فتحی شاہ نے کہا: "مجھے اپنا وعدہ یاد ہے، ایک ننھا سا بچہ اس کی گود میں ہے حضور جب چاہیں بلالیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں، رہا بچے کا مسئلہ تو وہ بھی حضور کی ایماء پر ہی میرے حوالے کیا جا سکتا ہے!"

شہزادے نے پوچھا: "اس سلسلے میں خود مونسہ کا کیا خیال ہے؟"

فتحی نے جواب دیا: "وہ تو یہی کہتی ہے کہ وہ اپنا بچہ مجھے نہیں دے گی!"

شہزادے نے کہا: "یہ تو اچھا ہی ہے، اس طرح بچے کی پرورش شاہی محل میں ہوگی جو بچے کے مستقبل کے لئے بڑی اچھی بات ہوگی!"

فتحی شاہ چپ ہو رہا۔ شہزادے نے کہا: "تم مونسہ کو میری طرف سے بتادینا کہ میں پرسوں بعد دوپہر اسے لینے آرہا ہوں!"

فتحی شاہ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن آواز گلے میں پھنس گئی۔ اسے اس وقت مونسہ سے اپنی محبت کا صحیح اندازہ ہوا۔

شہزادے نے پوچھا: "تم چپ کیوں ہو گئے؟"

فتحی نے جواب دیا: "معلوم نہیں کیوں، آواز حلق میں پھنس کے رہ گئی!"

شہزادہ ہنسنے لگا۔

فتحی شاہ نے گھر جاکے بدقت تمام مونسہ کو شہزادے کے ارادے سے مطلع کیا۔ مونسہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش بیٹھی رہی۔

فتحی شاہ نے پوچھا: "مونسہ! تم نے کوئی جواب نہیں دیا!"

مونسہ نے کہا: "میں کیا جواب دوں، تم نے جو فیصلہ کر دیا ہے، کیا میں اس سے انکار کردوں؟"

فتحی شاہ نے کہا: "نہیں میں تو یہ نہیں کہہ رہا لیکن مجھے افسوس بہت ہو رہا ہے!" یہ کہتے کہتے اس نے مونسہ کی زلفیں ہاتھ میں لے کر سونگھنے کی کوشش کی لیکن مونسہ کھسک کر دور جا بیٹھی۔ فتحی نے پوچھا: "مونسہ! کیا تم ناراض ہو گئیں؟"

مونسہ نے جواب دیا: "نہیں تو!"

فتحی نے گرب سے پوچھا: "پھر تم مجھ سے دور کیوں بھاگ رہی ہو؟"

مونسہ نے جل کر جواب دیا: "جس آغوش کو تم خود ہی دوسرے کے حوالے کئے دے رہے ہو، اب اس سے دور ہی رہنا بہتر ہے!"

فتحی شاہ نے کہا: "شہزادہ پرسوں آئے گا، اس وقت تک ہم دونوں خوب اچھی طرح لپٹ لپٹ کے رو کیوں نہ لیں؟"

مونسہ نے دل جلے انداز میں کہا: "رونا دھونا تم رو، میں کیوں رونے لگی، دو دن بعد میں ملکہ ہو جاؤں گی، احمد نگر کی ملکہ کہلاؤں گی اور تم میرے دربار کے ایک ادنا مصاحب رہ جاؤ گے، رونا تو تمھیں چاہیئے!"

اور فتحی شاہ واقعی رو دیا۔ وہ ایک کونے میں جاکے دیر تک روتا رہا۔

آخری رات فتحی شاہ سو نہیں سکا لیکن مونسہ سوتی رہی اس کے چہرے کا اطمینان فتحی

کے لئے حسد کا سبب بن گیا، رات کئی بار بچہ رو دیا لیکن مولسر کی آنکھ نہیں کھلی مجبوراً فتحی کو اٹھنا پڑا۔ اور بچے کو گود میں لے کر دیر تک ٹہلتا رہا۔ جب وہ آخری بار بچے کو چپ کرا کے لٹا رہا تھا تو اسے محسوس ہوا کہ مولسر جاگ رہی ہے کیونکہ اس نے فتحی شاہ کو پاس آتے دیکھ کر اپنی ادھ کھلی آنکھیں بند کی تھیں۔

فتحی شاہ نے اُسے آواز دی: "مولسر!"

مولسر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فتحی شاہ بھی چپ ہو رہا۔ صبح دونوں چپ چاپ ایک دوسرے سے الگ تھلگ، اجنبی اجنبی سے رہے، فتحی شاہ نے گھر سے نکلتے ہوئے رُندھی ہوئی آواز میں کہا: "مولسر! میں دوپہر بعد شہزادے کے ساتھ آؤں گا۔ تم اس وقت تک ذرا اچھے کپڑے پہن لینا!"

مولسر نے کوئی جواب نہ دیا۔ فتحی شاہ نے زور دے کے پوچھا: "مولسر! کیا تم نے میری بات سن لی؟"

مولسر نے کھوئی کھوئی اچاٹ نظروں سے فتحی کو دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

فتحی شاہ کے چلے جانے کے بعد اس نے ایک دربان کو چھٹی دیدی۔ وہ چلا گیا دوسرے دربان سے کہا: "تم مکان کے اندر آنے کا راستہ بھی بند کر دو!"

اس نے حکم کی تعمیل کر دی۔ دربان جھاڑ جھنکار کے اس پار ہی کھڑا رہ گیا۔ مولسر نے نے اس کی طرف ہُن (سونے کے سکے) کی ایک تھیلی پھینکی اور کہا: "دیکھو وہ لوگ جیسے ہی تمھیں نظر آئیں، تم پکار کے مجھے مطلع کر دینا اور خود کہیں ٹل جانا!"

دربان ان عجیب و غریب احکام کو توجہ اور حیرت سے سنتا رہا۔

مولسر نے اس دن وہی کپڑے پہن لئے جو شادی والے دن پہنے تھے، ساتھ میں اپنے بچے کو بھی اچھے اچھے کپڑے پہنا دیئے اور دونوں کا انتظار کرنے لگی۔

دوپہر کے بعد جھاڑ جھنکاڑ کے قریب آ کے دربان نے پکار لگائی: "جن کا انتظار تھا، آرہے ہیں!"

مولسر جیسے تیار بیٹھی تھی، دربان کو حکم دیا: "اب تم بھاگ جاؤ!"

دربان فوراً بھاگ گیا۔ مولسر نے جلدی جلدی بھاگ کے جھاڑ جھنکاڑ میں آگ لگا دی اور خود بچے کو لے کے چھت پر چڑھ گئی اور وہاں فتحی شاہ اور شہزادے کا انتظار کرنے لگی۔ خشک لکڑیوں نے آگ کو بہت جلد دور تک پھیلا دیا۔

شہزادہ فتحی شاہ، پست قامت مصاحب اور بعض دوسرے اوباشوں کے ساتھ مکان کے سامنے پہنچا تو اپنے اور مولسر کے درمیان آگ کا بھنور حائل دیکھا، ذرا سی دیر کے لئے سبھی کی عقلیں چکرا گئیں۔ اچانک ان کی نظریں چھت پر کھڑی ہوئی مولسر پر پڑ گئیں۔

فتحی شاہ نے چیخ کر پوچھا "مولسر! یہ کیا ہے؟"

مولسر نے ہنس کے جواب دیا: "آگ کا سمندر!"

"مذاق مت کرو۔ مجھے بتاتی کیوں نہیں کہ یہ سب کیا ہے؟" فتحی شاہ چیخ رہا تھا!

مولسر نے تحقیر آمیز لہجے میں چلا کے جواب دیا۔ "پانی کے سمندر میں تم نے میری آبرو لٹوا دی تھی، اُس وقت میں تمھارے اختیار میں تھی لیکن اس سیاہ ترین سانحے کے بعد میں نے تمھارے سہارے کا خیال دل سے یک لخت نکال دیا۔ کیا میں نے تمھیں یہ نہیں بتا دیا تھا کہ اب میرے معاملات کا فیصلہ تم نہیں کرو گے، میں خود کروں گی!"

شہزادے نے خوشامدانہ کہا: "مولسر! اگر تم میرا نہیں تو اپنے شوہر ہی کا خیال کرو اور خود کو آگ سے بچانے کی کوشش کرو! اپنے بچے پر رحم کرو!"

مولسر نے غصّے اور صدمے سے بھرائی ہوئی آواز میں چیخ کر جواب دیا: "شہزادے! یہ شخص جو تیرے برابر کھڑا ہوا ہے، میرا شوہر نہیں ہے، یہ صرف مصاحب ہے، یہ پہلے تیرے باپ کا مصاحب تھا، اب تیرا مصاحب ہے۔ پہلے میں بھی اِسے شوہر سمجھتی تھی لیکن جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ شخص محض مصاحب ہے تو میں نے اس کے شوہر ہونے کی غلط فہمی دل سے نکال دی!" پھر اس نے اپنے بچے کو دونوں ہاتھوں میں سنبھال لیا۔ بولی: "اور یہ بچہ! معلوم نہیں کس کا بچہ ہے، تیرا یا تیرے مصاحب کا؟ ان بے غیرتوں کے بچے کو جنم دینے پر مجبور ہوگئی تھی، لیکن چونکہ اس میں میرا خون بھی شامل ہو چکا ہے اس لیے میں یہ کبھی بھی گوارا نہ کروں گی کہ اسے بے غیرتوں کے حوالے کیا جائے!"

پھر اس نے بچے کو ہوا میں اچھال کے آگ میں جھونک دیا: روتی ہوئی اس کھوئی شے کی صحیح جگہ آگ کا الاؤ ہے!" اس کے بعد خود بھی چھت کے کنارے کھڑی ہوگئی۔ سسکیاں لیتی ہوئی بولی: "تم لوگ کتنے بے وقوف ہو، تم نے چنگیز خان جیسے غیرت مند امیر کی بیٹی کو بے غیرت کیوں سمجھ لیا تھا! تم دونوں مجھ سے محبت کرنے کا دعوا کر رہے ہو، اگر تمھارا دعوا سچا ہے تو آؤ میرے پیچھے میرے ساتھ آؤ!"

یہ کہتی ہوئی وہ خود بھی آگ میں چھلانگ لگا گئی۔ آگ کے شعلے ماں بیٹے کو آناً فاناً ہضم کر گئے۔

فتحی شاہ گھوڑے سے اُتر کر سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔

شہزادے نے فتحی شاہ کو وہیں چھوڑا اور پستہ قامت مصاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "کیا یہ پاگل تھی؟ یہ غیرت کیا شے ہے؟ کیا یہ حکومت اور اقتدار سے بھی بڑی کوئی شے ہے، عجیب بے وقوف تھی یہ لڑکی! میں تو اسے احمد نگر کی ملکہ بنا کے رکھتا!"

شہزادہ اپنے مصاحبوں کو ساتھ لے کے واپس ہوا۔ پستہ قامت مصاحب نے فتحی شاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"اور حضورِ والا یہ فتحی شاہ؟ کیا یہ ساتھ نہیں جائے گا؟"

شہزادے نے رحم دلی کا مظاہرہ کیا کہا: "فی الحال اسے یہیں رہنے دو۔ اسے خاک نشیمن پر دو آنسو بہا لینے دو!"

کفن بردوش



فنیقی بنیادی طور پر صناع اور تاجر تھے۔ یہ شیشے اور دھات کے سامان، مٹی کے ظروف، اسلحہ، اونی اور سوتی کپڑے اور زیورات وغیرہ کی تیاری میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ ان کے شہروں میں کپڑے کے کارخانوں کی بہتات تھی، اپنے مال کی منڈیوں کی تلاش میں یہ دور دراز علاقوں کی سیاحت کرتے رہتے تھے۔ بحیرۂ روم کے جزائر اور ساحلی علاقوں کے علاوہ یہ ہندوستان اور جنوبی بحراوقیانوس کے افریقی ساحلوں تک تجارتی دھاوے مارا کرتے تھے۔ کامیاب صنعت کاری، تجارت اور جہازرانی کی وجہ سے یہ لوگ اپنے عہد کی دولت مند ترین قوم شمار کیے جانے لگے۔ دولت کی ہوس نے انہیں بہت زیادہ چالاک اور عیار بنادیا تھا۔ اس راہ میں، مطلب براری کی خاطر یہ جھوٹ اور مکروفریب سے بھی باز نہ آتے تھے۔ دولت کمانے میں ان کا کوئی جواب نہ تھا، اس سلسلے میں نت نئی ترکیبیں سوچتے اور اس پر عمل درآمد میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہ محسوس کرتے۔ بحرِ روم کے بیشتر جزائر انھی کے تسلط میں تھے اور جن جزائر پر انہیں جزوی تسلط حاصل تھا، اس پر پوری طرح قابض ہو جانے کی تدبیریں سوچا کرتے تھے۔ یہ چالاک اور ذہین قوم اس راز سے بھی واقف تھی کہ کامیاب تجارت اور جہازرانی کے لیئے ضروری ہے کہ اس کے پسِ پشت ایک طاقت ور فوجی نظام بھی موجود ہو جو تجارت اور جہازرانی کی پشت پناہی کرتا رہے، انہوں نے اس ضرورت کو بھی پورا کر دیا۔ اور ایک زبردست عسکری قوت وجود میں لے آئے۔

ان دنوں فنیقیوں کا جزیرۂ سسلی پر جزوی قبضہ تھا۔ سسلی کے مغربی کنارے کوہِ ارکس میں یہ لوگ ایک مدت سے آباد اور حکمراں تھے، کوہِ ارکس ان کا وطن نہیں تھا، یہ فنیقیوں کی نوآبادی تھی۔ ان کا اصل وطن تو قرطاجنہ تھا۔ جزیرۂ سسلی کے جنوب میں بحرِ روم کے اس پار، افریقہ کے ساحل پر قرطاجنہ آباد تھا۔ اور یہی قرطاجنہ ان کا مستقر اور مرکز تھا۔ یہیں ان کی صنعتیں قائم تھیں اور یہیں سے بحرِ روم کے جزائر، ہندوستان اور بحرِ

اوقیانوس کے ساحلی مقامات پر تجارتی سامان برائے فروخت بھیجا جاتا تھا۔ ساری دنیا کی دولت ڈھل ڈھل کر قرطاجنہ پہنچ رہی تھی۔ جس سے فنیقیوں کی خوشحالی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ یہ ۲۴۰ قبل مسیح کا واقعہ ہے۔

سسلی کے کوہ ارکس میں قرطاجنہ کی حکومت کی طرف سے ہمل کر برقہ حکمراں تھا۔ قرب وجوار کے علاقوں کے لئے جو سامانِ تجارت قرطاجنہ سے کوہِ ارکس کی نوآبادی میں بھیجا جاتا' اس کے لوٹ لیے جانے کا ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا کیونکہ سسلی کے مشرقی حصے سیرا کیوز اور مغربی کنارے پنارمس کی حکومتیں رومن ایمپائر کی مدد سے اپنی بحری قوت میں اضافے کر رہی تھیں' قرطاجنہ کے تجارتی جہاز سیرا کیوز اور پنارمس کے بیڑوں سے بچتے بچاتے کوہِ ارکس کی ہلالی خلیج میں داخل ہو کر سکون کا سانس لیتے۔ کوہ ارکس کے حکمراں ہمل کر برقہ نے اس مستقل دردِ سر کا یہ علاج دریافت کیا کہ کسی طرح پورے سسلی پر ہی قبضہ کیوں نہ کر لیا جاتے، قرطاجنہ کی بالادست قوت نے ہمل کر برقہ کو فوجی کارروائی کا اختیار بھی دے دیا لیکن ان کی بد قسمتی سے سسلی کی مشرقی سیرا کیوزی حکومت نے ہمل کر برقہ کی طرف سے منڈلانے والے خطرات کی بو قبل از وقت ہی محسوس کر لی اور طاقت ور جمہوریہ روما سے فوجی امداد کے طالب ہوتے، جمہوریہ روما نے ان کی درخواست منظور کر لی اور جب فنیقیوں نے جنگ کا بگل بجایا تو سیرا کیوز کی حمایت میں جمہوریہ روما کی فوجی مداخلت نے نہایت فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ فنیقیوں نے میدان اپنے ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر صلح کی درخواست کی، رومیوں نے شکست خوردہ فنیقیوں کے سامنے نہایت شرمناک اور جابرانہ شرائطِ صلح رکھ دیں۔ قرطاجنہ کی حکومت نے رومیوں کے پاس معاہدہ صلح کے لئے جن لوگوں کو بھیجا تھا' ان میں کوہِ ارکس کا ہمل کر برقہ بھی شامل تھا فنیقی وفد کو اس صلح نامے کے ذریعے یہ حکم دیا گیا کہ وہ جلد از جلد کوہِ ارکس کی نوآبادی چھوڑ کر اپنے وطن واپس چلے جائیں اور ہمل کر برقہ نے اپنی کمزوری کے پیشِ نظر رومیوں کا یہ حکم مان لیا۔

کوہِ ارکس کی ہلالی خلیج میں فنیقیوں کے خالی جہاز پہنچنے لگے اور اپنے ہم قوموں کو لے کر قرطاجنہ واپس جانے لگے۔ بحرِ روم میں منڈلاتے ہوئے سیرا کیوزی، پنارمسی اور جمہوریہ روما کے طاقت ور بحری بیڑے کوہِ ارکس کے مہاجرین کی رخصتی کا نظارہ ہنس ہنس کر اور کبھی کبھی ذلت آمیز قہقہے لگا کر کرتے رہے، انہیں اس بات کی خوشی تھی کہ سسلی اِن عیار اور چالاک تاجروں کے وجود

سے پاک ہوا جارہا ہے۔

اس کھسیانی ہوئی شکست خوردہ قوم کا ایک جہاز بنارس کی ایک قدرے غیر آباد بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا، اس چھدری آبادی کے لوگ ساحل پر اس لیے جمع ہونے لگے کہ ان بھگوڑے دولت مندوں کا ایک نظر وہ بھی دیدار کرلیں، فنیقی تاجر ہنس ہنس کے اور ہاتھ ہلا ہلا کے ان سے باتیں کرنے لگے۔ مقامی آبادی کے لوگ ان کے حوصلے اور قوتِ برداشت سے بہت متاثر ہوتے ان کے کچھ لوگ فنیقیوں کے جہاز پر پہنچ گئے اور جہاز میں مختلف قسم کے سامانوں کا ذخیرہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ خوش نما، دل کش اور آرائش و زیبائش کو چار چاند لگا دینے والے سامان کی زیارت نے ان مقامی زائرین کے دلوں میں جذبۂ طمع بیدار کردیا۔ فنیقیوں نے غیر معمولی کشادہ دلی اور سخاوت کا مظاہرہ کیا، کسی نے شیشے کا مرتبان مانگا تو بے چون و چرا وہ مرتبان کوئی قیمت لیے بغیر اس شخص کے حوالے کردیا گیا۔ کسی نے اونی چادر پسند کی تو یہ بھی بلا قیمت اسے دے دی گئی، کچھ لوگ مٹی کی دل کش اور منقش صراحیاں لے گئے۔ اس داد و دہش کا بڑا شہرہ ہوا اور آبادی کا بیشتر حصہ عورتوں اور بچوں سمیت ڈھل کر جہاز پر پہنچ گیا یہ سب حرص و طمع کے مارے لوگ یہ امید لیے جہاز میں داخل ہوتے تھے کہ اپنی قسمت اور اپنے اپنے حصے کی چیزیں کوئی قیمت ادا کیے بغیر لے کر ہنسی خوشی واپس آجائیں گے لیکن وہاں ان کی بدقسمتی کوئی اور ہی تماشا دکھانے پر تلی ہوئی تھی۔

چالاک اور عیار فنیقیوں نے جب یہ دیکھا کہ آبادی کا بہت بڑا حصہ ان کے جہاز میں داخل ہو چکا ہے تو انھوں نے جہاز کا لنگر اٹھا دیا۔ مقامی لوگ تھوڑی دیر تک تو کچھ سمجھ ہی نہ سکے لیکن چند ساعتوں کے بعد ان کے کان کھڑے ہوتے۔ ساحل پر کھڑے ہوتے عزیزوں اور دوستوں نے لنگر اٹھاتے اور ساحل سے دور ہوتے ہوتے فنیقی جہاز کو دیکھ کر چلانا شروع کیا اس شور و غل سے فنیقی ڈرے کہ کہیں کسی حریف کا جہاز ان کا پیچھا نہ کرے، انھوں نے چند مقامی آدمیوں کو جہاز کے عرشے پر کھڑا کر کے ملائمت اور اخلاق سے درخواست کی کہ وہ اپنے عزیزوں اور ساتھیوں کو چلا کر مطلع کردیں کہ ہم ان کے ہم وطن اور ہم قوم افراد کو سمندر کی ہوا کھلا کے اور تحفے تحائف دے کر بہت جلد ساحل پر اتار دیں گے۔ بھولے بھالے سادہ لوح لوگوں نے فنیقیوں کے

حکم یہ خواہش کی حرف بہ حرف تعمیل کر دی۔

کئی گھنٹے بعد ان پر یہ تلخ حقیقت منکشف ہوئی کہ فینیقیوں کا جہاز کہیں رکے بغیر تیزی سے قرطاجنہ کی طرف بڑھا چلا جا رہا ہے۔ انہوں نے بد حواس ہو کر شور غل اور واویلا مچایا تو جہاز کے ملاح نے انہیں ڈانٹ دیا اور دھمکی دی کہ اگر انہوں نے اپنی زبان بند نہ رکھی، اور بدستور شور غل کرتے رہے تو وہ مجبوراً انہیں بحرِ روم کے حوالے کر دے گا۔ فینیقیوں کی خوش اخلاقی ان کے دلوں اور چہروں سے رخصت ہو چکی تھی اور ان کے چہروں سے ایک عجیب سی بے رُخی اور سنگ دلی عیاں تھی۔

نو گرفتاروں نے ایک جگہ جمع ہو کر اس نئی اور ناگہانی افتاد پر صلاح مشورے شروع کر دیے۔ انہوں نے ایک سب سے زیادہ عمر رسیدہ شخص کو اپنا نمائندہ بنا کے جہاز کے ملاح کے پاس بھیجا۔ لمبی اور طوطے جیسی ناک والا یہ ستر بہتر سالہ بوڑھا اپنے کاندھے پر کالی چادر ڈالے سر جھکاتے ملاح کے روبرو پہنچا، جہاز کے جملہ فینیقی کسی ناگہانی خطرے کے پیشِ نظر اپنی تلواریں اور برچھے لیے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے، ملاح نے لوہے کی لاٹھی پکڑ رکھی تھی، اپنے سامنے ستر بہتر سالہ بوڑھے کو دیکھ کر ملاح نے ناگواری سے سوال کیا۔ "کیا بات ہے؟ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

بوڑھے نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ "میرے ہم قوم پوچھ رہے ہیں کہ انہیں کہاں لے جایا جا رہا ہے؟"

"قرطاجنہ!" ملاح نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین پر، جہاں تانت دیوی کا مندر ہے اور جہاں مقدس بیرسا کی چوٹی پر مِل کرت دیوتا ہم سب کا انتظار کر رہا ہے!"

بوڑھے نے ذرا سکوت اختیار کیا، وہ کسی ذہنی اُلجھن میں مبتلا دکھائی دے رہا تھا، ہچکچاہٹ سے سوال کیا۔ "ہمیں ہمارے وطن کب واپس پہنچایا جائے گا؟"

ملاح ہنسنے لگا۔ بولا۔ "کیا تمہیں ابھی تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ آبادی اور شہر کا دیوتا مِل کرت تم سے سخت ناراض ہے۔ تم لوگوں نے جمہوریہ روما سے مِل کر ہمیں گھر سے بے گھر کیا، ہمارا کاروبار تباہ کر دیا، ہمیں کوہِ ارکس سے بے دخل کر دیا، ہم نے اپنے قیمتی مکان اور سامان وہیں چھوڑ دیے اور ہمیں ایک ذلیل

معاہدۂ صلح کے طفیل جتنے نقصانات اٹھانے پڑے ہیں، کیا ان کی تلافی ہو سکتی ہے، کیا وہ نقصانات پورے کئے جا سکتے ہیں، ہرگز نہیں، ہمیں بدرجہ مجبوری یہ ناگوار قدم اٹھانا پڑا ہے، اس سے ہمارے نقصانات کی کسی حد تک تلافی ہو جائے گی!"

بوڑھا وحشت سے تیز تیز سانسیں لینے لگا اور اس کے ناک کی لو سرخ ہو گئی، تقریباً روہانسی آواز میں بولا۔ "میرا وطن، میرا گھر، میرا خاندان، کیا اب میں ان میں سے کسی ایک سے بھی نہ مل سکوں گا؟"

ملاح نے جواب دیا۔ "شاید نہیں کیونکہ ہمیں خود بھی یہ نہیں معلوم کہ تمہارے آقا، تمہارے مالکان دنیا کے کس خطے میں بلکے جاتے ہیں اور تمہیں اپنی بقیہ زندگیاں کہاں اور کس کی غلامی میں گزارنا ہیں!"

بوڑھے پر لرزہ سا طاری ہونے لگا، خوف، مایوسی اور مذلت کا لرزہ، لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ "دیوتاؤں نے ہمارے آئندہ دنوں کے لئے جو ذلتیں اور رسوائیاں مقرر کر دی ہیں، ان سے کوئی کس طرح اور کہاں بھاگ سکتا ہے؟ پھر بھی کیا یہ شرافت کا تقاضا نہیں ہے کہ تم ہمیں ان فیصلوں سے مطلع کر دو جن کا تم نے ہمیں مستحق قرار دیا ہے!"

ملاح نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "قرطاجنہ کی مجلسِ اقتدار ہی کوئی فیصلہ کر سکتی ہے لیکن اتنی سی بات تو ہم بھی جانتے ہیں کہ تم سب کو ایک نہ ایک غلاموں کی طرح کسی نہ کسی بازار میں بک جانا پڑے گا کیونکہ ہم اسی طرح اپنے نقصانات کی کمی کسی حد تک پوری کر سکتے ہیں!"

بوڑھے کی آنکھوں کے سامنے تتلیاں سی اڑنے لگیں، انتہائے یاس اور احساسِ ذلت سے دل ڈوبنے لگا اور جہاز، اہالیانِ جہاز اور جہاز کا ساز و سامان گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ وہ پوری قوت سے چیخا۔ "ہائے میرا وطن، ہائے میرا کنبہ۔ ہائے میرے آبا و اجداد کے قبرستان، کیا میں پردیس میں مروں گا؟ اف اف آہ!"

اس دلدوز آواز میں بھی ملاح کے لئے تفریح اور لذت کا عنصر موجود تھا، وہ ہنسنے لگا۔ وہ اس مخبوط الحواس اور یاس زدہ بوڑھے سے شاید کچھ کہتا بھی لیکن بوڑھا بے ہوش ہو کر گر گیا اور ملاح حیرت سے اس بزدل اور کم ہمت بوڑھے پر افسوس کرنے لگا۔

*

قرطاجنہ کے بازار میں جبری غلاموں کو بیچ کر جہازیوں نے جو کچھ کمایا اس کے حصے بخرے میں بڑی الجھنیں پیش آئیں کیونکہ یہ لوگ اپنے حصے میں ایک دوسرے سے زیادہ کے خواہش مند تھے۔ اگر قرطاجنہ کے چند بڑے لوگ بر وقت مداخلت نہ کرتے تو شاید خون خرابا ہو جاتا۔ انہوں نے آپس میں لڑنے جھگڑنے والوں کو یہ کہہ کر ڈانٹا کہ "تمہاری یہی نااتفاقیاں ہی تو تھیں جنہوں نے ہمیں کوہِ ارکس چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔"

جہاز کے ملاح نے کہا۔ "میں اپنے حصے کی رقم میں زیادہ کا مطالبہ اس لیے کر رہا ہوں کہ ان غلاموں کی اسیری اور تجارت کا منصوبہ سب سے پہلے میرے ذہن میں آیا تھا اور شروع سے آخر تک اس معاملے کا نگراں اور عمل کار میں ہی رہا ہوں۔"

شہر کے محافظ نے ملاح سے اتفاق کیا اور اسے غلاموں کی کل قیمت میں سے "چوتھائی" کا مستحق قرار دے دیا۔ بوڑھا اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بازار میں سڑک کے کنارے کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔ اس کے سامنے اور آس پاس اس کی قوم کے نوجوان لڑکے لڑکیاں، جوان اور بوڑھے مرقع عبرت بنے بک رہے تھے۔ بوڑھوں کی قیمتیں بہت کم لگ رہی تھیں کیونکہ ان کے بارے میں عام تاثر یہ تھا کہ یہ لوگ اول تو کام کے لائق ہی نہیں رہ جاتے اور جو کام کے لائق رہتے بھی ہیں تو ان میں پائی جانے والی قنوطیت اور مایوسی انہیں اس لائق نہیں رکھتی کہ وہ اپنے فرائض دل جمعی، لگن اور مستعدی سے انجام دے سکیں۔ قیمتیں لگانے والے اس کے قریب آتے اور جھریوں زدہ چہرہ دیکھ کر آگے بڑھ جاتے، ان کا خیال تھا کہ یہ بوڑھے لوگ کوئی بڑے نازک اور اہم کام کے لائق نہیں رہ گئے۔ بوڑھے نے اپنے سامنے سے گزرنے والے کئی امیروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "لوگو! مجھے خرید لو، میں تمہیں اس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہیں عقل و دانش کی باتیں بتاؤں گا!"

ایک ادھیڑ عمر گٹھے جسم کے مالک نے بوڑھے کی درخواست پر غور کیا اور اس کا مول تول کرنے لگا۔ بات طے پا گئی، سودا ہو گیا اور بڑے میاں اس ادھیڑ عمر شخص کی غلامی میں چلے گئے۔ بعد میں خریدنے والے کو بڑی پریشانیاں اٹھانا پڑیں کیونکہ بڑے میاں کا بیشتر وقت وطن کی طرف منہ کر کے رونے اور بین کرنے میں گزر جاتا تھا۔ ادھر سے فرصت پاتے تو چپکے چپکے نیتیوں کو کوستے رہتے جنہوں نے اس کی قوم کے بہت سارے لوگوں کو

دھوکے سے اپنا غلام بنا ڈالا تھا۔

بیرسا کی چوٹی پر بل کرت دیوتا کا شاندار بت رکھا تھا۔ اسی مندر کے دوسرے حصے میں تانت دیوی براجمان تھی۔ شام سے ذرا پہلے وہاں ایک زبردست اجتماع ہوا۔ اپنے ادھیڑ عمر مالک کے ساتھ بوڑھے کو بھی وہاں جانا پڑا۔ مندر کے آس پاس بڑے بڑے درختوں کی قطاریں تھیں، انہی کے جھنڈ میں بل کرت دیوتا اور تانت دیوی کا مندر تھا۔ بوڑھے کے ذمے یہ خدمت کی گئی کہ وہ معزز حاضرین کو پانی پلاتا رہے، ان معززین میں ہملکر برقہ بھی اپنے بیٹے ہینی بال کے ساتھ شامل تھا۔ ہینی بال اس وقت آٹھ سال کا رہا ہو گا۔ ہملکر برقہ نے کوہ ارکس سے بے دخل ہو جانے کی صورت میں جو بے عزتی اور ذلت اٹھائی تھی، دل پر اس کا زخم تازہ تھا اور یہ اس وقت تک مندمل نہیں ہو سکتا تھا جب تک وہ خود بھی جمہوریہ روما کو ذلیل اور شرمسار نہ کر لے گا۔ بنارس کی نواحی بندرگاہ سے لائے جانے والے غلاموں کو یہاں بطورِ خاص رکھا گیا تھا اور ان سے کمتر درجے کی خدمات لے کر یہ قرطاجنی تاجر اپنے نفس کو تسکین دینا چاہتے تھے، یہاں اس بوڑھے کو بہت سے ہم وطنوں، دوستوں اور عزیزوں کے چہرے نظر آئے ان میں چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے جو اپنے قرطاجنی آقاؤں کی جوتیاں سنبھالے مندر کی سیڑھیوں کے نیچے کھڑے تھے۔ مندر کی سیڑھیوں پر دونوں طرف پجاری عورتیں معززینِ شہر کا پُرلطف اور دل کش مسکراہٹوں سے استقبال کر رہی تھیں اور سروں کے اوپر وہ کبوتریاں منڈلا رہی تھیں، جنہیں تانت دیوی کے نام پر چھوڑا گیا تھا۔

اس بوڑھے کو جب بھی موقع ملا، اس نے اپنے ہم وطنوں کو سرگوشی میں یہ یاد دلا دیا کہ انہیں یہاں مستقل نہیں رہنا ہے، ایک نہ ایک دن واپس ضرور جانا ہے کیونکہ یہ بنارسیوں کا وطن نہیں ہے، ان کا وطن تو یہاں سے دور بحرِ روم کے اس پار سسلی کے مغربی کنارے پر ہے، اس نے اپنے ہم وطنوں کو بتایا کہ وطن کی خوشگوار اور مرطوب ہوائیں ان کی یاد میں آوارہ و سرگرداں ہوں گی اور وطن کے لوگ ان کی یاد میں آہیں بھر رہے ہوں گے، اس نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ رات کے پچھلے پہر نیم غنودگی میں اس نے اپنے دور افتادہ ہم وطنوں کو روتے اور سسکیاں بھرتے سنا ہے۔ اس نے اپنے ہم وطنوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ قرطاجنہ کی ذلیل سرزمین میں وہ مر کر دفن ہونا بھی

پسند نہ کرے گا کیونکہ یہاں اس کے عزیزوں اور بزرگوں کی قبریں نہیں ہیں" اسی عالم میں اس نے ایک بچے کو مندر کی نچلی سیڑھی پر سسکیاں بھرتے دیکھا" یہ بے چین ہو کر بچے کے پاس پہنچا اور اس کا سر اوپر اٹھا کے پوچھا۔ "بچے! تم رو کیوں رہے ہو؟"

بچے نے سرخ سرخ سوجی آنکھوں سے بوڑھے کی طرف دیکھا اور نفرت سے جواب دیا۔ "کیا تم اپنی غلامی پر قانع ہو گئے ہو؟"

بوڑھے نے گھبرا کر جواب دیا۔ "نہیں تو۔ غلامی پر کوئی حساس اور غیرت مند انسان آخر کس طرح قانع ہو سکتا ہے!"

"پھر تم مجھ سے رونے کا سبب کیوں دریافت کر رہے ہو"۔ بچے نے بوڑھے کو شرمسار کر دیا۔

بوڑھا کچھ دیر تک اس غیرت مند بچے کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ "میرے بچے ابھی تھوڑی دیر پہلے تک میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ اپنے غلام ہم وطنوں میں، میں سب سے زیادہ حساس اور غیرت مند شخص ہوں لیکن تجھ سے مل کر اور تیری باتیں سن کر میرا یہ پندار ٹوٹ گیا۔" پھر خوشی اور فخر کے جذبے سے بولا۔ "ہم میں جب تک تیرے جیسے سمجھ دار اور غیرت مند بچے موجود ہیں میری قوم ذلیل نہیں ہو سکتی!"

بچے نے کہا۔ "میں اپنے بزرگوں کی عقل مندی اور حوصلے کی امید میں غلامی کے دن گزار رہا ہوں، اب دیکھنا یہ ہے کہ تم لوگ کب اور کس طرح ہمیں یہاں سے نکال لے جانے میں کامیاب ہوتے ہو!"

بوڑھے نے شرمساری سے کہا۔ "ہم یہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش تو ضرور کریں گے لیکن اگر موت کی دہلیز پر کھڑی ہوئی ہماری عمریں ہمیں یہ موقع نہ دیں تو تم ہم پر لعن طعن بھی نہ کرنا کیونکہ زندگی کو لمبا کرنا ہم فانی انسانوں کے اختیار میں نہیں ہے، یہ دیوتاؤں کا کام ہے جب ہم مر کر دیوتاؤں کی سرزمین میں چلے جائیں تو اس وقت یہ تمہاری ذمے داری ہو گی کہ تم اس ظلم و جبر کی سرزمین میں ہمیشہ کے لیئے نہ رہ پڑو، تمہیں یہاں کی رنگینیاں اور دلکشیاں ہرگز ہرگز غلامی پر قانع نہ ہو جانے دیں اور تمہیں زندگی کی ہر آتی جاتی سانس میں یہ یاد رکھنا ہو گا کہ تم قرطاجنہ کے باشندے نہیں ہو اور تمہارا اس سرزمین پر عارضی قیام ہے، تمہیں ایک نہ ایک دن یہاں سے چلا جانا ہے!"

بچے نے پھر سر جھکا لیا۔ رقت زدہ لہجے میں بولا "میں اپنے باپ، ماں اور بہن بھائیوں کو کس طرح بھلا سکتا ہوں، یہ میری زمین نہیں ہے، یہ میرا وطن نہیں ہے، میں اس جگہ سے کس طرح محبت کر سکتا ہوں!"

تھوڑی دیر بعد ان غلاموں کو شراب کی صراحیوں اور بھیڑوں کے ساتھ بل کرت دیوتا کے روبرو پہنچنے کا حکم دیا گیا۔ ان میں بوڑھا بھی شامل تھا۔ بوڑھے کے دونوں کاندھوں پر شراب کی صراحیاں رکھ دی گئیں اور وہ انہیں لے کر بل کرت دیوتا کے روبرو پہنچ گیا۔ مندر کے صحن میں دھوپ بھری ہوئی تھی اور سورج کی تمازت سر چٹخاتے دے رہی تھی، اس تمازت میں لوگوں کا ازدحام اور زیادہ شدت پیدا کر رہا تھا۔ اسی مجمع میں اس نے ہمل کر برقہ اور اس کے آٹھ نو سالہ بیٹے ہینی بال کو کھڑے دیکھا، ہمل کر برقہ کبھی سسلی میں، اس کے پڑوس کے کوہ ارکس پر حکومت کر چکا تھا۔ اس وقت وہ بہت اداس تھا، غمگین اور فکر مند چہرے پر کچھ کھو دینے کے شدید احساس نے دکھ کی تیرگی سی پھیلا دی تھی۔ ہمل کر برقہ کے ایک طرف اس کے کاندھے سے کاندھا ملاتے بوڑھے کا ادھیڑ عمر آقا کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے بوڑھے کو قریب بلایا، پھر یہ لوگ، لوگوں کے ہجوم اور دھوپ کی تمازت سے بچنے کی خاطر مندر کے اس حجرے میں چلے گئے جہاں بل کرت دیوتا کا بت رکھا تھا۔ صراحی بردوش بوڑھا ان کے ساتھ، دو قدم پیچھے چل رہا تھا۔ برقہ خاندان کے بعض دوسرے معززین بھی ہمل کر برقہ کے ہمراہ تھے۔ ان کے پیچھے چند غلام قربانی کی بھیڑوں کی رسیاں پکڑے حکم کے منتظر کھڑے تھے۔ ہمل کر برقہ کے حکم پر ایک بھیڑ کے چاروں پیر ایک رسی سے باندھ دیے گئے اور اس بندھی ہوئی بے بس بھیڑ کو بل کرت دیوتا کے قدموں میں ڈال دیا گیا۔ مجبور بھیڑ نے سر، پیٹ اور پیروں سے فرش کو گھسلنا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن پیروں کے بندھے ہونے کی وجہ سے وہ اٹھ نہیں سکی۔ ہمل کر برقہ دو قدم آگے بڑھا اور قربانی کے گنڈاسے کی ایک ضرب سے بھیڑ کا سر الگ کر دیا۔ خون کی دھار اڑ کر بل کرت دیوتا کے قدموں کو رنگین کرنے لگی۔ اس کے بعد ہمل کر برقہ نے بوڑھے کے کاندھے سے صراحیاں لے لیں اور یکے بعد دیگرے دونوں صراحیوں کی شراب دیوتا کے جسم پر انڈیل دی۔ ان رسوم کی ادائیگی کے دوران ننھا ہینی بال باپ کے قریب ہی موجود رہا۔ دیوتا کو بھیڑ کی قربانی دینے اور شراب میں نہلا

چکنے کے بعد ہمل کربرقہ نے مندر میں موجود لوگوں کو حکم دیا کہ وہ سب، کچھ اور پیچھے ہٹ جائیں حکم کی فوراً ہی تعمیل کر دی گئی۔ ہمل کربرقہ نے ننھے ہینی بال کا ہاتھ پکڑا اور قربان گاہ سے متصل لے گیا وہ دونوں دیوتا کے قدموں میں دو زانو بیٹھ گئے۔

ہمل کربرقہ نے اپنا ایک ہاتھ دیوتا کے قدموں میں اور دوسرا مذبوحہ بھیڑ کی مردہ پشت پر رکھ دیا اور قسم کھائی۔ "مقدس بل کمرت! آبادیوں اور شہروں کے دیوتا! ہمیں نئی زمین اور نئے شہر عطا فرما اور روم کو تباہ و برباد کر دینے کی قوت دے!" یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ پھر اس نے اپنے بیٹے ہینی بال کا ہاتھ قربانی کی بھیڑ پر رکھ کر حکم دیا۔ "ہینی بال! قسم کھا کہ اگر میں رومیوں کو تباہ و برباد نہ کر سکا تو میرا عہد تو پورا کر دکھائے گا!"

ہینی بال نے ایک نظر باپ پر ڈالی، جذبات سے بھر بھراتے باپ کے چہرے کی کیفیت خود اس کے چہرے پر طاری ہو گئی، اس نے گردن جھکا لی اور قسم کھائی۔ "رومیوں کی تباہی اور بربادی میری زندگی کا نصب العین اور اہل قرطاجنہ کی سرخ روئی میرا مقصد ہو گا اگر میں اپنے عہد سے پھروں تو اے بل کمرت دیوتا، تمہیں اختیار ہو گا کہ مجھے تباہ و برباد کر دو!"

ہمل کربرقہ نے اسی جگہ اپنے بیٹے کو اس فیصلے سے آگاہ کیا کہ وہ نئی زمینوں کی تلاش میں عنقریب روانہ ہو جائے گا کیونکہ وہ اریکس کو کھو دینے کے بعد کسی اور نو آبادی کی دریافت اور اقتدار ضروری ہو گیا ہے، اس نے بیٹے سے دریافت کیا۔ "ہینی بال کیا تم اس سفر میں بھی میرے ساتھ رہنا پسند کرو گے؟"

ہینی بال نے تائید میں گردن ہلائی۔ پنارسی بوڑھا اس عہد و پیمان کو غصے سے برداشت کر رہا تھا۔

اس عہد و پیمان کے کچھ دنوں بعد بوڑھے پنارسی کی نگرانی میں ایک خوفناک بغاوت نے جنم لیا، یہ بغاوت آناً فاناً پھیلتی چلی گئی، یہاں تک کہ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہو گئے جو غیر افریقی ہونے کے باوجود قرطاجنہ کی فوج میں ملازم تھے اور انہیں ماہ بہ ماہ تنخواہیں نہیں مل رہی تھیں، اور وہ غریب کاشت کار اور دست کار بھی بغاوت میں شامل ہو گئے جو قرطاجنہ کی حکومت کو بھاری محصول ادا کرتے کرتے تنگ آچکے تھے، یہ آگ اتنی تیزی سے پھیلی

اور اس نے اتنا بڑا علاقہ گھیر لیا کہ قرطاجنہ اور اس کے حاکموں اور تاجروں کا وجود ہی خطرے میں پڑ گیا۔ بغاوت زدہ علاقہ ہملکر برقہ کی تحویل میں دے دیا گیا۔ ہملکر برقہ نے افریقہ کے لومڑیوں کو فوج میں لے لیا۔ اور مقامی اور غیر مقامی وفادار سپاہ کو لے کر باغیوں کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگا۔ ہاتھیوں کی قطاریں فوج کے آگے آگے تھیں، ہاتھیوں پر چمڑے کی جھولیں پڑی ہوئی تھیں، اِن دیو پیکر جانوروں اور لومڑیوں کے بے جگر شہسواروں نے باغیوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ باغی مجبوراً اپنی قوت کو مجتمع کر کے کھلے میدان میں آ گئے۔ ہملکر برقہ چاہتا بھی یہی تھا۔ اس نے باغیوں پر ہاتھیوں کی قطاریں چڑھا دیں اور جو ہاتھیوں کی روندن سے بچ گئے انہیں ہملکر برقہ کی سپاہ نے تلواروں کی دھار اور برچھیوں کی نوک پر رکھ لیا اور ایک بڑی تعداد زندہ گرفتار کر لی گئی۔ قرطاجنہ سے مختلف اندرونی علاقوں میں جانے والی سڑکوں پر سولیاں گاڑی گئیں اور ان میں باغیوں کو لٹکا دیا گیا' وہ پنارسی بوڑھا جو اس بغاوت کا اصل بانی تھا۔ ہملکر برقہ کے ہاتھ نہیں آیا تھا اور اس کے نوجوان شکاری کتوں کی طرح اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ بوڑھا بچتا چھپتا قرطاجنہ کی بندرگاہ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد اس کی دوسری کوشش یہ ہوتی کہ کوئی غیر افریقی جہاز ساحل پر آ جائے تو وہ کسی طرح اس میں سوار ہو جائے اور خوشامد در آمد یا کسی بھی ممکنہ طریقے سے وہ جہاز کے ملاح کو ساتھ لے جانے پر آمادہ کر لے۔

پندرہ سولہ دن اِدھر اُدھر روپوش رہنے کے بعد وہ ایک پتھریلے مکان کی حدود میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دن بیرسا کی چوٹی پر مادرِ زمین کے بت تانت کا کوئی میلہ ہو رہا تھا اور آبادی کے بیشتر لوگ وہیں گئے ہوئے تھے، بوڑھا جس پتھریلے مکان میں داخل ہوا تھا۔ اس کے عقبی حصے میں ایک اجاڑ مگر گنجان باغ تھا اور مختلف قسم کے بڑے بڑے درختوں نے اندھیرا کر رکھا تھا۔ انہی میں وہ خاردار جھاڑیاں بھی تھیں جو ایک وسیع رقبے میں پھیلی ہوئی تھیں اور جنہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا' وہ مکان کی پتھریلی دیواروں کی آڑ لیتا ہوا باغ میں داخل ہو گیا اور اسے اس جگہ کا سرسری جائزہ لے کر صحیح فیصلے تک پہنچنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ اس کا فیصلہ یہ تھا کہ اسے کسی بھی طرح خطرناک خاردار جھاڑیوں میں پناہ لینا ہے، خواہ اس

کوشش میں اس کا جسم چھلنی ہی کیوں نہ ہو جائے، موت تو ہر طرح اس کے تعاقب میں تھی۔ اگر پکڑا جاتا تو قتل کیا جانا یقینی تھا اور اگر خاردار جھاڑیوں میں کوئی زہریلا کیڑا اسے کاٹ لیتا، تب بھی موت یقینی تھی لیکن اگر خوش قسمتی سے جھاڑی کے کسی کیڑے نے اسے نہیں کاٹا تو نوکیلے کانٹے اسے زخمی کر کے لہو لہان ہی کر سکتے تھے اور وہ کچھ اذیت جھیل کر زندہ تو رہ سکتا تھا۔ رہا کھانے پینے کا مسئلہ تو اس پر اطمینان سے غور کیا جا سکتا تھا۔ اس فیصلے کے بعد وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا خاردار جھاڑیوں کی طرف بڑھا لیکن عین اس وقت جب وہ باغ میں داخل ہو چکا تھا، اس نے اپنے پیچھے کسی کے بھاگ کر آنے کی آہٹ محسوس کی، وہ ٹھٹھک کر رک گیا اور پلٹ کر دیکھا، ایک گیارہ بارہ سالہ لڑکا اس کی طرف دوڑا چلا آرہا تھا۔ بنارسی بوڑھا گھبرا گیا، اس نے تشویش سے زمین کا جائزہ لیا، وہاں ادھر ادھر مختلف حجم اور وزن کے پتھر بکھرے ہوئے تھے، اس نے فوراً ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ یہ لڑکا جیسے ہی اس کے قریب آئے گا، وہ اسے کسی پتھر کی بھرپور ضرب سے ہلاک کر دے گا کیونکہ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو یہ لڑکا اسے گرفتار کرا دے گا لیکن یہ لڑکا جیسے جیسے قریب ہوتا گیا۔ بنارسی بوڑھے کا جوش اور غصہ ٹھنڈا پڑتا گیا کیونکہ یہ لڑکا وہی بنارسی خدمت گار تھا جو اسے کچھ عرصے پہلے بیرسا کی چوٹی پر بل کرنت دیوتا کی سیڑھیوں پر ملا تھا۔

بوڑھے نے لڑکے سے کہا۔ "فنیقی کتے میری تلاش میں ہیں، مجھے ان خاردار جھاڑیوں میں چھپ جانے دو!"

لڑکے نے کہا۔ "آؤ میں تمہیں ایک ایسی جگہ چھپا دوں کہ تم آرام سے روپوش رہو اور موقع ملتے ہی یہاں سے نکل جاؤ!"

بوڑھے کی جان میں جان آئی اور ذرا سے تامل کے بعد لڑکے کی بات مان لی۔

لڑکے نے اسے خام مال کے اس گودام میں چھپا دیا جہاں گھر والے شاذ و نادر ہی جایا کرتے تھے اور اس گودام سے مال نکالنے اور رکھنے کا کام اسی لڑکے کے ذمے تھا۔ لڑکے نے بوڑھے کو یہاں چھپا دیا اور اسے یقین دلایا کہ اسے کھانا پینا یہیں ملتا رہے گا لیکن اگر کسی وقت ناغہ ہو جائے تو بوڑھا اسے معاف کر دے کیونکہ ایسا کسی خطرے ہی کی گھڑی میں ممکن ہوگا۔

ایک دن جب یہ لڑکا گودام میں داخل ہوا تو بوڑھے نے اس سے چند غیر متوقع سوالات کیے، سب سے پہلے تو اس نے لڑکے سے نام پوچھا "میں نے تمہارا نام تو پوچھا ہی نہیں!"

لڑکے نے جواب دیا۔ "فلبی، یوں پورا نام فلباس ہے!"

بوڑھے نے دوسرا سوال کیا۔ "اس گھر میں اور کون رہتا ہے؟"

"گھر کا مالک، اس کی بیوی، ایک لڑکی زیغو۔ ایک لڑکا بھی تھا جو پچھلی بغاوت میں مارا گیا!"

بوڑھے نے ذرا پریشانی سے سوال کیا۔ "لڑکی کی عمر کیا ہے؟"

"یہی کوئی دس گیارہ سال!" لڑکے نے جواب دیا۔ "کیوں؟"

بوڑھے نے فکر مندی سے پوچھا۔ "تمہیں وہ لڑکی اچھی لگتی ہے؟"

"ہاں اچھی کیوں نہیں لگتی؟" لڑکا ان سوالات سے پریشان تھا۔ "کیوں؟ کوئی خاص بات؟"

"کیا وہ لڑکی بھی تمہیں پسند کرتی ہے؟"

"ممکن ہے پسند کرتی ہو لیکن یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے نفرت نہیں کرتی!"

بوڑھے کے کان کھڑے ہوتے، پوچھا۔ "تم دونوں آپس میں بے تکلف بھی ہو گئے؟"

"ہاں خاصے بے تکلف ہیں اور اسی لڑکی کے طفیل میری اس گھر میں خادموں یا غلاموں جیسی حیثیت نہیں رہی، اب میں اس گھر کا ایک فرد سمجھا جاتا ہوں!"

بوڑھے نے خوف زدہ انداز میں پوچھا۔ "تم نے اس لڑکی سے میرا ذکر تو نہیں کیا؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "زیغو بری لڑکی نہیں ہے، وہ میری باتیں کسی اور کو نہیں بتاتی!"

بوڑھے نے تلخی سے کہا۔ "میرے سوال کا جواب دو، تم نے اس لڑکی سے میرا ذکر تو نہیں کیا؟"

لڑکے نے کسی قدر ہچکچا کر جواب دیا۔ "نہیں!"

لیکن جھوٹ اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ اس نے رازداری کا وعدہ لے کر زیغو کو سب کچھ بتا دیا تھا۔

بوڑھے نے غصّے اور خفگی سے کہا۔ "لڑکے تم نے یہ بہت برا کیا۔ تم نے مجھے میرے دشمنوں کے حوالے کر دیا۔ میں نے تم پر اعتماد کر کے زندگی کا بد ترین فریب کھایا ہے!"

لڑکا کھانے پینے کا جو سامان بوڑھے کے لیئے لے گیا تھا۔ بوڑھے نے اسے نفرت سے واپس کر دیا۔

لڑکے نے جھک کر بوڑھے کے پیر پکڑ لیے، روتا ہوا بولا۔ "میں اپنی غلطی پر شرمسار ہوں، مجھے معاف کر دو!"

بوڑھے کی آنکھیں بھیگ گئیں، بولا۔ "فلبی! تم میرے بچے ہو میرے وطن کے بیٹے، میں تم سے کس طرح نفرت کر سکتا ہوں، تم نے لڑکپن کی سادگی میں بہت بڑی غلطی کی ہے اور اس غلطی پر میں تم سے نفرت نہیں، تم پر افسوس کر سکتا ہوں!"

فلبی نے بڑی کوشش کی کہ وہ کچھ کھا پی لے لیکن پنارسی بوڑھا اپنی ضد اور انکار پر آخر تک قائم رہا۔

بوڑھے کا خدشہ بالکل صحیح نکلا، اسے ہملکر برقہ کے آدمیوں نے خام مال کے گودام سے برآمد کر لیا۔ فلبی خاموش تماشائی بنا اس کی گرفتاری کا منظر دیکھتا رہا۔ زیغو اس کے پاس کھڑی تھی۔ جب ہملکر برقہ کے آدمی پنارسی بوڑھے کو ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے گودام سے باہر لاتے تو اس کے کولہے سے خون کا فوارا چھوٹ رہا تھا۔ ہملکر برقہ گودام کے باہر کھڑا اس نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے قریب داہنی طرف ہینی بال کھڑا تھا۔

سپاہیوں نے بوڑھے کو بے دردی سے ہملکر برقہ کے سامنے ایک جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔

ہملکر برقہ نے پوچھا۔ "یہ اس کے کولہے سے خون کیسا بہہ رہا ہے؟"

ایک سپاہی نے جواب دیا۔ "جب ہم لوگ گودام میں داخل ہوتے تھے تو یہ خطرے کا صحیح اندازہ لگا کے خام مال کے نیچے چھپ گیا تھا، ہم اسے خام مال میں نیزے چبھو چبھو کر تلاش کر رہے تھے، اس تلاش میں ہمارا بھرپور نیزا اس کے کولہے میں اتر گیا اور جب ہم نے نیزا کھینچ کر باہر نکالا تو اس کی انی خون میں تر تھی!"

تکلیف سے نڈھال بوڑھے نے حاضرین کو دیکھا، پھر اس نے فلبی پر

نظریں گاڑ دیں اور کرب سے چلایا۔ "مجھے اس کا غم نہیں ہے کہ میں گرفتار کر لیا گیا اور کچھ دیر بعد اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا جاؤں گا۔ افسوس ہے تو صرف اس بات کا کہ میں ہمیشہ کے لئے اجنبیوں کی زمین میں دفن ہو جاؤں گا۔"

فلبی نے زیغو کو شکایت آمیز نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے پوچھا "کیا اس کی مخبری تم نے کی تھی؟"

زیغو نے معصومیت سے جواب دیا۔ "ہاں، کیونکہ تم اسے یہاں کب تک چھپائے رکھتے، ایک نہ ایک دن تو یہ پکڑا ہی جاتا۔ میں نے سوچا یہ خبر تمہارے حوالے سے میں خود ہی کیوں نہ دے دوں کیونکہ اس طرح تم ہمارے وفادار کہلاؤ گے؟"

فلبی نے خاموشی اختیار کر لی۔ بوڑھا بدستور بڑبڑا رہا تھا۔ "معصومیت کی غلطی قابلِ معافی ہے لیکن جو لوگ جوان ہو کر بھی اپنے آباؤ اجداد کی زمین کو بھلا دیں ان پر میں دیوتاؤں کی لعنت بھیجتا ہوں!"

ہمل کر برقہ نے نہایت سنجیدگی سے بوڑھے کا مقدمہ فیصل کر دیا۔ تماش بینوں کے ہجوم میں ہمل کر برقہ نے دو گھڑ سواروں کو حکم دیا کہ وہ اپنے گھوڑوں کی دو بالمقابل ٹانگوں میں بوڑھے کی ایک ایک ٹانگ باندھ دیں، ہمل کر برقہ کے حکم کی فوری تعمیل ہوئی۔ اس کے بعد دونوں سوار اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور ہمل کر برقہ کے دوسرے حکم پر دونوں گھڑ سوار یکساں رفتار سے متوازی بھاگنے لگے، بوڑھے کا پتھروں اور کنکروں سے رگڑ کھاتا ہوا جسم لہولہان ہونے لگا تقریباً ایک فرلانگ کے بعد دونوں گھوڑوں نے اچانک دو مخالف سمتوں میں بھاگنا شروع کر دیا اور ایک جھٹکے سے، بوڑھا دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ تماشائی فرطِ جوش میں خوشی سے نعرے لگانے لگے۔

فلبی اداس اور چپ چپ گھر واپس ہوا۔

زیغو نے پوچھا۔ "کیا تمہیں اس واقعے سے دکھ پہنچا؟"

فلبی نے جواب دیا۔ "اس سے میں خوش بھی نہیں ہوا!"

اس وقت زیغو کے باپ نے فلبی کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔ "فلبی! تمہارا بہت بہت شکریہ۔ اگر تمہاری مدد شاملِ حال نہ ہوتی تو یہ بوڑھا کبھی بھی نہ پکڑا جا سکتا!"

فلبی نے کوئی جواب نہیں دیا اس کے کان میں بوڑھے کی آواز اب

بھی گونج رہی تھی: "معصومیت کی غلطی قابلِ معافی ہے لیکن جو لوگ جوان ہو کر بھی اپنے آبا و اجداد کی زمین بھلا دیں، ان پر میں دیوتاؤں کی لعنت بھیجتا ہوں!"

زیفو کے باپ نے فلبی کو تسلی دی اور اسے یقین دلایا کہ اگر وہ اہلِ قرطاجنہ کا اسی طرح وفادار رہا تو اسے بہت جلد یہی حقوق حاصل ہو جائیں گے جو ہمیں حاصل ہیں۔

زیفو اس کی خاموشی سے پریشان تھی، جب اس کا باپ چلا گیا تو اس نے غصے سے کہا۔ "اب تمہارا یہی وطن ہے اور تم اسی زمین کے باشندے ہو، تمہیں اس غدار بوڑھے کے انجام پر غمگین نہیں ہونا چاہیئے!"

فلبی اپنے غصے اور صدمے کا برملا اظہار نہیں کر سکا۔ بمشکل جواب دیا۔ "زیفو! تم نے جو کچھ کیا، اگر یہ سب میرے علم میں لا کر کرتیں تو زیادہ اچھا ہوتا!"

اس واقعے کے کئی ماہ بعد ہمل کربرقہ اپنے خاندان اور جاں نثار ساتھیوں کے ساتھ اس جہاز میں چلا گیا جو ایک نامعلوم دنیا کی تلاش میں جا رہا تھا۔ اس ہم زمین کی جستجو میں جو کوہ ارکس کا بدل ثابت ہو سکے۔ تجارتی بندرگاہ کے ایک حجرے میں سیر و سفر کے دیوتا کے روبرو قربانی پیش کی گئی اور عود و عنبر کی خوشبو میں چغہ پوش عمائدِ شہر نے خیر و سلامت سے منزلِ مقصود تک پہنچنے کی دعائیں مانگیں، اس کے بعد بچا اس بلیے جپو حرکت میں آ گئے اور ہمل کربرقہ کے جہاز نے پانی میں حرکت شروع کر دی، ساحل پر کوہِ پرسا کی مقدس چوٹی انہیں الوداع کہہ رہی تھی، جہاز نے احتراماً کوہِ پرسا کے سامنے ایک چکر لگایا اور پھر اس سمت میں روانہ ہو گیا۔ جہاں دو ساحلوں کے درمیان سورج ہر روز غروب ہوا کرتا ہے، جبرالٹر اور میوقہ کے درمیان۔

ساحل پر کھڑے ہوئے عمائدِ شہر اور دوسرے شہریوں کی نظریں جہاز کے مستولوں اور چپوؤں پر جمی ہوئی تھیں جو لمحہ بہ لمحہ مختصر ہوتے جا رہے تھے اور یہ مختصر ہوتے ہوتے دھبے کی شکل اختیار کر گئے، پھر یہ دھبے بھی سمندر کی وسعتوں میں گم ہو گئے اس وقت فلبی ایک ایسے جہاز کا تصور لیئے کھڑا تھا جو اسے پنارمس کی آبادیوں میں لے جاتے گا۔ اس کے آبا و اجداد کی سرزمین میں، سامنے شمال کی ہواؤں میں اسے وطن کی بو محسوس ہو رہی تھی۔

اسی دن زیغو کے والدین نے اپنا یہ فیصلہ سنا دیا کہ اگر ہمل کربرقہ ان کے لئے کوئی نئی دنیا حاصل کر سکا تو یہ لوگ بھی وہیں چلے جائیں گے۔

* * *

جیسے جیسے دن گزرتے گئے فلبی قرطاجنہ والوں کا اعتماد حاصل کرتا گیا لیکن دوسری طرف فلبی کے دل میں ہم وطن بوڑھے کی گرفتاری اور موت کے نقوش گہرے ہوتے چلے گئے، وہ اس سانحے کو بھول جانا چاہتا تھا مگر بوڑھے کی روح نے گویا اس کے دل پر قبضہ کر لیا تھا اور کسی طرح حافظے سے نکلنے پر تیار ہی نہ ہوتی تھی۔ زیغو اسے اچھی لگتی تھی لیکن اس اچھائی اور دل کشی میں بوڑھے کی موت شیشے میں بال پڑ جانے کی طرح شامل ہو گئی تھی، وہ اپنے اس دکھ کا زیغو پر اظہار بھی نہ کر سکتا تھا لیکن زیغو یہ تبدیلی تو محسوس کر ہی سکتی تھی کہ فلبی میں کچھ تبدیلی آگئی ہے مثلاً یہ تبدیلی کہ وہ اس سے باتوں اور معاملات میں گرم جوشی اور محبت کا مظاہرہ کرتے کرتے اچانک سرد مہری اختیار کر لیتا ہے۔ زیغو کا ننھا ذہن اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

ہمل کربرقہ نے اسپین کے جنوب مشرق میں ایک نئی دنیا حاصل کر لی تھی اور اس کا نام "نیا قرطاجنہ" رکھ دیا تھا۔ قرطاجنہ کے حکام نے ہمل کربرقہ کو فرمان حکمرانی کی ایک کندہ تختی پہلے ہی سے دے رکھی تھی جس پر لفظ "شوفت" (محافظ) کھدا ہوا تھا اور جس کا یہ مطلب تھا کہ ہمل کربرقہ کو عمائدِ قرطاجنہ نے کسی بھی علاقے کی حفاظت کا فرض سونپ رکھا ہے، ہمل کربرقہ نے اس تختی سے وہی کام لیا جو کسی حکومت کے عہدے دار پروانۂ تقرری سے لیا کرتے ہیں، ہمل کربرقہ نے ایک پانچ رکنی وفد بھیج کر قرطاجنہ کے حکمرانوں کو یہ خوش خبری سنا دی، کوہِ بیرسا کی بلندی پر مجلسِ قرطاجنہ کا وہ محل تھا جہاں حکومت کی ذمے دار مجلس اہم ترین فیصلے صادر فرمایا کرتی تھی، اس ایوان میں پردوں کے پیچھے ارکانِ مجلس سر جوڑ کے بیٹھتے اور گھنٹوں بحث مباحثے کرتے رہتے پھر جب کسی نتیجے پر پہنچ جاتے تو پردے سے نمودار ہو کر اپنے فیصلوں کا اعلان کر دیتے۔

ہمل کربرقہ کی کامیابی کی خوشی میں ایک شاندار جشن کا اہتمام ہوا۔ بل کرت دیوتا کی قربان گاہ پر بھیڑیں ذبح کی گئیں اور تانت دیوی کے نام پر بے شمار کبوتریاں چھوڑی گئیں، شہر کی نشیبی آبادی کے لوگ بھی اوپر پہنچ

گئے اور ان سب نے مل کر شاندار جشن منایا۔ نومدیہ کے زندہ دل اور بہادر سپاہیوں نے آگ کا الاؤ جلایا اور اس کے گرد بیٹھ کر شرابیں پینے لگے، قرطاجنہ کے شہری بھی بیرسا کے مختلف مندروں میں قربانیاں اور نذرانے پیش کر رہے تھے۔ انہیں میں زیفو کا خاندان بھی شامل تھا۔ زیفو کے باپ نے شراب کے کئی مرتبان ایک گاڑی میں لادے اور بیرسا کی چوٹی پر پہنچ کر دیوی دیوتاؤں کو شراب میں نہلانے لگا۔ اور اس نے یہ منت مانی کہ اگر دیوی دیوتاؤں نے اسے مجلسِ قرطاجنہ سے کسی علاقے کے شوفت کی تختی دلوا دی تو وہ ان کے قدموں میں پچاس بھیڑیں قربان کرے گا" اور انہیں بیس سیر شراب سے غسل دلاتے گا۔ تانیت دیوی سے یہ عہد کیا کہ اگر وہ اپنا دلی مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ تانیت دیوی کے نام پر پچاس کبوتریاں آزاد کرے گا۔

نہیں رات کے اندھیرے میں مل کرت کی سیڑھیوں پر زیفو اور قلبی بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ زیفو نے محسوس کیا تھا کہ وہ آج کے ہنگامے میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا ہے، اور یہ احساس زیفو کے لیئے بہت اذیت ناک تھا۔ ان دونوں سے تقریباً پانچ سو قدم دور نومدیہ شہسوار الاؤ کے گرد بیٹھے ناؤ نوش میں مشغول تھے، الاؤ کی روشنی میں ان دونوں کے چہرے دمک رہے تھے۔

زیفو نے خاموش اور فکر مند قلبی سے پوچھا۔ "کیا تم آج بھی خوش نہیں ہو؟"

قلبی نے بے خیالی میں جواب دیا۔ "معلوم نہیں کیوں، کبھی کبھی میرے دل کی حرکت بہت تیز ہو جاتی ہے، اور جب مجھ پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو میں بہت اداس ہو جاتا ہوں!"

زیفو نے پوچھا۔ "اس اداسی کا سبب؟"

"میں خود نہیں جانتا!"

"یہ کیونکر ممکن ہے!" اس وقت وہ خود بھی اداس تھی۔ "میں ایک بات آج تمہیں ضرور بتا دینا چاہتی ہوں، تم میرے گھر میں زرخرید غلام کی حیثیت سے داخل ہوتے تھے لیکن آہستہ آہستہ تمہارے دل نشیں انداز اور بے لوث خدمت گزاری سے تمہارے لیے میرے گھر میں بڑی عزت پیدا ہو گئی اور

اب یہ حال ہے کہ تم میرے گھر کے ایک فرد سمجھے جاتے ہو!"

فلبی نے جواب دیا۔ "بہت بہت شکریہ لیکن میں نے تمہارے خاندان میں اپنی شمولیت کی درخواست تو نہیں دی تھی۔ اگر تمہارے گھر کے لوگ مجھے اپنے خاندان میں شامل کر لینا چاہتے ہیں تو میں انہیں خوش آمدید کہنے کو تیار ہوں!"

"پہلے تم بہت خوش رہتے تھے لیکن اب اداس اور چپ چپ رہنے لگے ہو، آخر اس کا سبب؟"

"کہہ تو دیا کہ سبب تو میں خود بھی نہیں جانتا!"

زیفو نے کہا۔ "کیا تمہیں یہ بات معلوم ہے کہ قرطاجنہ کے بعض بڑے تاجر اپنے لڑکوں کے لئے مجھے پسند کرنے لگے ہیں، میرے باپ نے انہیں یہ جواب دیا ہے کہ زیفو ابھی بچی ہے لیکن تم خود سوچو کہ میرے باپ کا یہ جواب ایسا تو نہیں ہے جو ہمیشہ دیا جا سکتا ہو، وہ کچھ دنوں سے تمہاری پُر اسرار تبدیلی پر بھی غور کر رہے ہیں چنانچہ کل رات میں نے خود اپنے کانوں سے سنا، وہ میری ماں سے کہہ رہے تھے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ فلبی ہمیں دھوکا دے جائے۔ کیونکہ اس کی پُر اسرار خاموشی سے ڈر لگنے لگا ہے!"

فلبی نے جواب دیا۔ "ابھی ہمیں یہ باتیں نہیں سوچنی چاہئیں، کیا خود تمہیں یہ باتیں اچھی لگتی ہیں اور ان کا اصل مفہوم تمہاری سمجھ میں آتا ہے؟"

زیفو نے کہا۔ "یہ باتیں تو مجھے بہت اچھی لگتی ہیں، رہا ان کے مفہوم سمجھنے کا مسئلہ تو کبھی نہ کبھی تو ان کا اصل مفہوم سمجھنے ہی لگوں گی!"

فلبی نے کہا۔ "جب ان کا مفہوم سمجھنے لگو تو اس سلسلے میں باتیں بھی کر لینا، فی الحال تو اس موضوع کو یوں ہی سپاٹ رہنے دو!"

"واہ یہ کس طرح ممکن ہے!" زیفو تڑپ کر بولی۔ "تمہیں میری خاطر پہلے جیسا تو بننا ہی پڑے گا۔"

اسی وقت مندر کی سیڑھیوں سے ایک نوجوان اترتا ہوا ان دونوں کے قریب آ گیا۔ اس نے زیفو کو دیکھا اور ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ "لڑکی! تمہارا نام کیا ہے؟"

زیفو نے تنک کر جواب دیا۔ "میرے نام سے تمہیں کیا کام؟ کچھ بھی

ہو میرا نام، تمہیں کیا!"

نوجوان نے شرارت سے ایک آنکھ میچ لی اور آنکھ مار کے بولا۔ "تم ابھی چھوٹی سی ہو لڑکی، میرے باپ کو معلوم نہیں کیوں، تم بہت زیادہ پسند آگئی ہو لیکن اب میں اس سے یہ کہوں گا کہ ابھی کچھ دن انتظار کرو۔ ورنہ جلدی میں کام بگڑ جاتے گا!"

قلبی غصے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا، بولا۔ "نوجوان! تم جاؤ اور ہمیں پریشان نہ کرو، میں یوں ہی بہت پریشان ہوں!"

نوجوان نے شرارت سے کہا۔ "میرے چھوٹے سے دوست! اگر تم نے اس لڑکی کے حقوق کسی طرح بھی حاصل کر لیے ہیں تو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں، تم دونوں عیش کرو، میں چلتا ہوں!"

جب وہ چلا گیا تو زیفو نے قلبی کو آڑے ہاتھوں لیا، بولی۔ "یا تو تم خود کو پہلے جیسا بنا لو یا پھر اس کے لیے تیار ہو جاؤ کہ ہم دونوں کے درمیان جو فاصلہ اس وقت موجود ہے، وہ وقت کے ساتھ ساتھ بتدریج بڑھتا چلا جائے!"

قلبی نے آہستہ سے جواب دیا۔ "زیفو! میں اپنی غائب دماغی کی معافی چاہتا ہوں، تم مجھے معاف کر دو، آیندہ میں پہلے جیسا بننے کی کوشش کروں گا!"

پہاڑ کی خنک ہوا میں سمندر کی نمی سے سردی کی کیفیت پیدا ہو گئی اور یہ سردی دونوں ہی محسوس کر رہے تھے۔

قلبی نے پوچھا۔ "ہم گھر واپس کب چلیں گے؟"

زیفو نے جواب دیا۔ "میرے ماں باپ دیوتاؤں کو نذرانے پیش کرتے پھر رہے ہیں، وہ فارغ ہو کر آجائیں تو ہم دونوں بھی چلنے کی تیاری کریں!"

قلبی نے کہا۔ "تب پھر چلو، چل کے ہم دونوں کسی حجرے میں بیٹھیں جہاں یہ سرد ہوائیں نہ پہنچ سکتی ہوں!"

زیفو نے فوراً کہا۔ "میں تیار ہوں!"

یہ دونوں مندر کی سیڑھیوں کو عبور کر کے تانت دیوی کے مندر میں داخل ہو گئے، یہاں زیفو نے دیوی کے قدموں میں شراب انڈیلی اور

فلبی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگی۔ "او تانت دیوی! فلبی کو پہلے جیسا بنا دے!"

لیکن فلبی نے کوئی دعا بھی نہ مانگی۔ زیفو نے کہا۔ "تم دیوی سے کچھ مانگتے کیوں نہیں، یہ زمین کی دیوی تانت ہے اور لوگوں کا تجربہ ہے کہ اگر اس سے خلوص کے ساتھ کچھ مانگا جائے تو یہ اپنے پرستاروں کو مایوس نہیں کرتی!"

فلبی نے شرما حضوری دیوی سے دعا مانگی۔ "مجھے پہلے جیسا بنا دے"

زیفو نے حجرے کے باہر اپنے باپ کو ایک طرف جاتے ہوئے دیکھا تو وہ یہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی کہ میں اپنے باپ سے مل کر ابھی آتی ہوں، کہیں میرا باپ مجھے تلاش کرتا ہوا اس ہجوم میں بھٹک نہ جائے!"

اس کے جاتے ہی فلبی نے رو رو کر دعا مانگی۔ "تانت دیوی! تم زمین کی دیوی ہو تم مجھے میری زمینوں میں واپس کیوں نہیں بھیج دیتیں، میرے ماں باپ میرے غم میں رو رو کر نڈھال ہو گئے ہوں گے، میرے بھائی بہن آتی جاتی سانسوں میں میرا نام لے رہے ہوں گے، تانت دیوی! میں اس زمین کا آدمی نہیں ہوں، جیسا کہ تم کو معلوم ہے کہ میں پنار مسی ہوں، مجھے وہیں بھیج دو دیوی! یہ میری آخری اور سب سے بڑی دعا ہے، اسے قبول کر لو!"

تھوڑی دیر بعد زیفو پھر واپس آ گئی، اس وقت تک فلبی اپنے دل کا بوجھ اتار چکا تھا اور خود کو بہت ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے زیفو کا استقبال کیا، فلبی کو ایسا لگا، جیسے اس کی دعا قبول کی جا چکی ہے۔ زیفو اسے خوش دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ فلبی نے اسے تسلی دینے کی خاطر کہا۔ "زیفو! ابھی میں نے دیوی سے یہ دعا مانگی تھی کہ وہ مجھے پہلے جیسا بنا دے، اس دعا کے فوراً بعد میرے دل کا بوجھ اتر گیا، میرا خیال ہے اب میں پھر پہلے جیسا ہو گیا ہوں!"

زیفو نے فرطِ خوشی میں اس کا ہاتھ چوم لیا۔ "کاش دیوی ایسا ہی کر دے!"

واپسی میں وہ دونوں مست اور بے حال لونڈیوں کے الاؤ کے قریب گئے اور ان کی بلانوشی کا نظارہ کرتے رہے، اس کے بعد خالی مرتبانوں سمیت اپنے گھر روانہ ہو گئے۔

* * *

بوڑھے کی موت کو جتنا عرصہ گزرتا گیا۔ فلبی کے ذہن سے اس کی یاد اور تعلیمات محو ہوتی چلی گئیں، اسے زیغو اور اس کے والدین نے اتنا آرام پہنچایا اسے قرطاجنہ اور اہلِ قرطاجنہ سے محبت ہو گئی۔ زیغو کے باپ نے فلبی کو تجارت میں لگا دیا۔ وہ بہت جلد اس لائق ہو گیا کہ بڑے بڑے بحری تاجروں کے ہاتھ اپنا مال فروخت کرنے لگا لیکن اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ تجارتی سامان دوسرے ملکوں اور شہروں میں بیچنا زیادہ نفع بخش ہے اس نے زیغو کے باپ کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ قرطاجنہ سے نکل کر بحرِ روم کے ساحلی شہروں اور جزیروں میں قسمت آزمائی کرے۔ زیغو کے باپ نے اس کی تجویز سے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ اس پر عمل کیا اور وہ فلبی کو ساتھ لے کر ایک لمبے سفر پر روانہ ہو گیا، دونوں قرطاجنہ سے تقریباً چار سال دور رہے لیکن جب واپس آئے تو اپنے ساتھ بڑی دولت کما لائے، زیغو کا باپ فلبی سے بہت خوش تھا۔ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی یہ اعلان کر دیا کہ وہ فلبی کو عنقریب اپنی دامادی کا شرف بخش دے گا۔ دوسری طرف زیغو پر جوانی پھوٹ پڑی تھی اور اس نے کئی نوجوانوں کو دیوانہ بنا رکھا تھا لیکن خود زیغو فلبی کی دیوانی تھی اور اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی، وہ فلبی کی عدم موجودگی میں بار ہا ساحلی چٹانوں پر بیٹھ کر اس جہاز کا انتظار کر چکی تھی جو کسی بھی طرف سے نمودار ہو کر فلبی کو لانے والا تھا لیکن یہ تقدیر کی ستم ظریفی تھی کہ جب وہ قرطاجنہ کے ساحل پر اترا، اس وقت زیغو اپنے گھر میں تھی اور جب فلبی اس کے باپ کے ساتھ گھر میں اچانک داخل ہوا تھا تو وہ خوشی کے مارے پاگل سی ہو گئی تھی۔ پھر جب زیغو کے باپ نے فلبی کو داماد بنانے کا اعلان کر دیا تو اہلِ قرطاجنہ نے اس اعلان کو خوشی سے نہیں سنا کیونکہ فلبی بدقسمتی سے ہنارمسی تھا اور ہنارمسی رومی نسل سے تعلق رکھتے تھے وہ رومی جنہوں نے قرطاجنہ والوں کو کئی نو آبادیوں سے محروم کر دیا تھا!

اسی دوران ہسپانوی قرطاجنہ سے یہ خبر ملی کہ ہملکر برقہ کسی مقامی سازش میں قتل کر دیا گیا اور جمہوریہ روما نے ان کے جزیرے سارڈینا اور سالونیکا کو بھی خالی کرا لیا ہے۔ یہ بڑی تشویشناک خبریں تھیں، زیغو کے باپ کو کوہ بیرسا کے ایوان میں طلب کر لیا گیا، وہاں عمائدِ شہر جمع تھے اور ایوان کے دروازے سرخ پردوں میں چھپے ہوتے تھے۔

مجلس کے صدر نے زیغو کے باپ سے سوال کیا۔ "کیا یہ خبر درست ہے کہ تم اپنی بیٹی زیغو کی شادی رومی نژاد فلبی سے کر دینا چاہتے ہو؟ وہ فلبی جو رومی

ہونے کے ساتھ ہی تمہارا غلام بھی ہے!"

زیغو کے باپ نے جواب دیا۔" وہ رومی اور غلام ہونے کے ساتھ ہی ہمارا وفادار شہری ہے۔ میں اپنے فیصلے اور اس کے اعلان پر شرمندہ نہیں ہوں، قلبی ہر طرح اس اعزاز کا مستحق ہے کہ میں اسے اپنا داماد بنالوں!"

مجلس کے ایک ممبر نے تقریباً چیخ کر کہا۔" ایسا نہیں ہو سکتا، کبھی بھی ایسا نہیں ہو سکتا" اگر ایسا ہوا تو میں اس منحوس کام میں ہر طرح کی مداخلت کا ارادہ کر چکا ہوں!"

میر مجلس نے دھمکی دی۔" اور بیرسا کی مجلس یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ اگر ایک رومی کو کسی بھی طرح وہ عزت بخشی گئی جو اہلِ قرطاجنہ کا حق ہے تو وہ اس قومی مجرم کو صنعت اور تجارت کے حقوق سے محروم کر دے گی!"

زیغو کا باپ دل شکستہ اور پاگرفتہ حالت میں بیرسا سے نیچے آیا اور اپنے کمرے میں منہ چھپا کے بیٹھ رہا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ بیرسا کے ایوان کا فیصلہ زیغو اور قلبی کو کس طرح سنائے؟ اس فیصلے کی سن گن زیغو کو بھی مل چکی تھی، اس نے اپنے اداس باپ کو کمرے میں جاتے دیکھا تو سمجھ گئی کہ معاملہ کچھ زیادہ گمبھیر ہے، کچھ دیر تک تو اس نے یہ انتظار کیا شاید اس کا باپ اسے بلا کر بیرسا کے ایوان کا فیصلہ سنا دے لیکن جب ایسا نہیں ہوا تو اس نے خود بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت قلبی گھر میں موجود نہیں تھا۔ وہ دبے قدموں باپ کی خلوت گاہ میں داخل ہوئی تو وہاں ماں کو موجود پایا۔ دونوں کی نظریں تقریباً ایک ساتھ اٹھیں اور افسردہ زیغو کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔

ماں نے زیغو کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ لیٹے ہوئے باپ نے کانوں پر سے بالوں کی لٹیں ہٹائیں اور داڑھی کھجانے لگا۔ ماں نے زیغو کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مضبوط لہجے میں کہا۔" اگر مقدس بیرسا کے ایوان نے متفق ہو کر یک آواز فیصلہ کر دیا ہے کہ میری بیٹی زیغو کا پنارسی نوجوان کے ہاتھ میں نہ دیا جائے تو ہمیں بھی بے چون و چرا اس فیصلے کو قبول کر لینا چاہیئے کیونکہ یہ ہمارے بڑوں کا فیصلہ ہے!"

زیغو کے باپ نے کہا۔" میں اپنے بڑوں کے فیصلے کو رد کیونکر کر سکتا ہوں لیکن یہ بات بھی آسان نہیں ہے کہ میں اس شریف پنارسی نوجوان کو خود اپنی زبان سے یہ موت کا حکم سنا دوں!"

مالی نے کہا۔ "تم زیفو کو ہمارے بڑوں کا فیصلہ سنا دو، میں سمجھتی ہوں کہ یہ ناگوار فرض، جو خالصاً زیفو کی ذات سے تعلق رکھتا ہے، یہ خود انجام دے لے گی!"

باپ نے بیرسا کی مجلس کا فیصلہ زیفو کو سنا دیا اور تالیفِ قلب کے لئے بولا۔ "یہ ایک نہایت ناگوار اور ظالمانہ فیصلہ ہے جو بیرسا کے بڑے لوگ دو نوجوانوں کی ذاتی اور جذباتی زندگی کے خلاف سنا بیٹھے ہیں، ہم چاہیں تو ان کے اس فیصلے کو ٹھکرا دیں لیکن ہمارے خاندان میں آج تک ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ دوسرے یہ کہ اس فیصلے کے خلاف قدم اٹھانے کی جو ہمیں سب سے بڑی سزا بھگتنا پڑے گی وہ یہ ہے کہ ہمیں صنعتی اور تجارتی حقوق سے محروم کر دیا جائے گا!"

زیفو کے دل پر مسلسل گھونسے سے لگ رہے تھے۔ وہ کافی دیر خاموش بیٹھی رہی، اس کے ماں باپ زیفو کا جواب سننا چاہتے تھے، جب دیر تک خاموشی طاری رہی تو ماں نے کہا۔ "زیفو! تو کیا سوچ رہی ہے؟ کیا تجھے مقدس بیرسا کے بڑوں کا یہ فیصلہ قبول نہیں ہے؟"

زیفو نے نہایت دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "بیرسا کے بڑوں نے جو بھیانک فیصلہ کیا ہے، اس سے زیادہ بھیانک اور دردناک آپ دونوں کا یہ فیصلہ ہے کہ آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ اس فیصلے کو قلبی تک میں پہنچا دوں!"

باپ نے کہا۔ "زیفو! تم ہماری بات سمجھنے کی کوشش کرو، ہم نے یہ فرض محض اس لیے تمہیں سونپا ہے کہ یہ مسئلہ تمہاری ذات سے تعلق رکھتا ہے، ہم نے اپنی کاروباری زندگی میں یہی سیکھا ہے کہ جس کے ذمے جو کام ہے، اسے وہ خود انجام دے، یہ مسئلہ تمہارا ہے، ہمیں تم سے ہمدردی ہے لیکن اس ہمدردی پر ہم اپنے صنعتی اور تجارتی مفاد نہیں قربان کر سکتے!"

زیفو نے جواب دیا۔ "میں بیرسا کے بڑوں کا یہ فیصلہ قبول کرتی ہوں لیکن ایک فیصلہ میں نے بھی کیا ہے، اور میں اس میں کسی اور کی مداخلت ہرگز قبول نہ کروں گی!"

اس کے ماں باپ نے حیرت اور تجسس سے زیفو کو دیکھا اور اس کا فیصلہ سننے کی خواہش کی۔

زیفو نے تجسس کی فضا زیادہ دیر نہیں قائم رہنے دی۔ اس نے

آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "ہمارے بڑوں نے اس پناہ مسی نوجوان کی اس خدمت کو کیوں بھلا دیا۔ جو اس نے اپنے ہم قوم خطرناک بوڑھے کی گرفتاری کی شکل میں انجام دی تھی، تم لوگ اپنے پتھروں جیسے دل سے اس کی خدمات نکال دو، لیکن میں نہیں نکال سکتی۔ اس نے تجارتی اور صنعتی معاملات میں ہمیں اور ہماری قوم کو بڑے فائدے پہنچاتے ہیں، اور یہ باتیں ایسی نہیں ہیں جنہیں بآسانی نظرانداز کر دیا جائے فلبی کے ان احسانات اور خدمات کا میں عملاً یوں اعتراف کروں گی کہ زندگی بھر اسی کے نام پر کنواری بیٹھی رہوں اور یہی میرا وہ فیصلہ ہے جس میں، میں اپنے کسی بڑے کی مداخلت پسند نہیں کروں گی!"

زیغو کی ماں نے پریشان ہو کے کہا۔ "یہ کس طرح ممکن ہے؟"

باپ نے فدا سختی سے کہا۔ "ہمارے خاندان میں ایسا آج تک نہیں ہوا میں نے تمہیں پالا پوسا ہے، اور تمہاری پرورش اور تربیت پر میں بہت کچھ خرچ کر چکا ہوں، فلبی سے زیادہ تم پر میں نے احسانات کیے ہیں کیا ان احسانات کا عوض تم نہیں دو گی!"

زیغو نے اٹل اور بے مروتی کے انداز میں جواب دیا۔ "آپ لوگ اپنا قرض پہلے ہی وصول کر چکے ہیں!"

"وہ کس طرح اور کب؟" زیغو کا باپ تلملایا ہوا تھا۔

زیغو نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "میں نے مقدس بیرسا کے بڑوں کا وہ فیصلہ جو انہوں نے آپ کے خلاف نافذ کیا تھا خندہ پیشانی سے قبول کر کے آپ کا قرض اتار دیا ہے!"

باپ غصے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ شاید تشدد پر آجاتا لیکن مہربان ماں نے دونوں کے درمیان حائل ہو کر فریقین کو ٹھنڈا کرنا شروع کر دیا۔ شوہر سے کہا۔ "زیغو ہماری بیٹی ہے اور اس پر ہاتھ اٹھا کے یا کسی اور تشدد کے طریقے سے تم اس کے دل کو نہیں جیت سکتے ہمارے لیئے فی الحال یہی مناسب ہے کہ اس معاملے کو کچھ دنوں کے لیئے التوا میں ڈال دیں اور دو چار سال خاموش تماشائیوں کی طرح زیغو کا جائزہ لیتے رہیں، اور مجھے یہ یقین ہے کہ کوئی بھی نوجوان یکساں جذباتی حالت کو تادیر قائم نہیں رکھ سکتا!"

پھر اس نے سسکیاں لیتی ہوئی زیغو کو سینے سے لگا لیا اور سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی۔ "بیٹی! تیرا باپ مرد ہے اور مردوں میں اپنے فیصلے جبراً مسلط کرنے کی پرانی عادت چلی آرہی ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ تو نے کوئی غلط

فیصلہ کیا ہے اِن حالات میں عموماً نوجوان لڑکیاں اسی قسم کے جذباتی ارادے کر لیا کرتی ہیں جن پر وہ زندگی بھر نہیں چل پاتیں اور بعد میں جب ان وقتی جذبوں پر حالات اور تقاضوں کی شدتیں غالب آتی ہیں تو وہ وہی راہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں جو صحیح اور سچا راستہ ہوتا ہے!"

زیفو نے روتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں نے جو فیصلہ کیا ہے اسے زندگی کی آخری سانسوں تک نباہوں گی!"

"ٹھیک ہے؟" ماں نے کہا۔ "میں اس سلسلے میں تجھے پانچ سال دوں گی اس عرصے میں اگر تو اپنے فیصلے پر اسی شدومد سے قائم رہی تو میں پانچ سال بعد اور توسیع کر دوں گی لیکن اگر تیرے قدم ڈگمگانے لگے تو میں تیرے لئے تیرے شایانِ شان کسی خوب صورت اور دولت مند فنیقی نوجوان کو پسند کر لوں گی!"

باپ نے درمیان میں مداخلت کی' کہا۔ "لیکن اِن پانچ سالوں میں زیفو کو ایک بات کا بطورِ خاص خیال رکھنا پڑے گا!"

ماں نے چڑ کر کہا۔ "تم معاملے کو ضرور بگاڑ دو گے، میں کہتی ہوں تم خاموش رہو!"

"او کم عقل عورت!" زیفو کا باپ گرجا۔ "تو نے زیفو کو پانچ سال کی مدت دینے میں ایک خاص نکتہ نظر انداز کر دیا ہے، اور وہ ایسا نکتہ ہے کہ اگر اس کا خیال نہیں رکھا گیا تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ زیفو ایک زندگی تو کیا کئی زندگیاں اپنے اس عہد پر قائم رہ کر گزار سکتی ہے!"

زیفو نے اپنے بے رحم باپ کو رحم کی نظروں سے دیکھا۔

ماں نے پوچھا۔ "وہ کون سا نکتہ ہے، ذرا مجھے بھی تو بتاؤ!"

زیفو کے باپ نے کہا۔ "تم زیفو سے وعدہ لو کہ وہ ان پانچ سالوں میں فلبی سے دور بلکہ اس کی نظروں سے اوجھل رہے گی!"

زیفو چیخ اٹھی۔ "ایسا نہیں ہو سکتا، ایسا نہیں ہو سکتا!"

ماں ششدر سناٹے میں آگئی، آہستہ سے بولی۔ "اس کے بغیر توسیع عائد کردہ شرط کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی!"

زیفو چیختی رہی۔ "مجھ پر اتنا ظلم نہ کرو میں مر جاؤں گی میں یہ ظلم نہیں برداشت کروں گی!"

ماں، اپنے شوہر کو زیغو سے ذرا دور کمرے کے کونے میں لے گئی اور سرگوشی میں کہا۔ "میں سمجھتی ہوں اس نکتے کا زیغو کے سامنے اظہار مناسب بات نہ تھی۔ یہ کام تو تمہارے کرنے کا ہے اب فی الحال خاموش رہو اور وقت کا انتظار کرو، کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا!"

زیغو نے چیخ کر کہا۔ "ماں! تمہیں جو فیصلہ کرنا ہے میرے سامنے کرو، دشمنوں کی طرح پیٹھ میں چھرا گھونپنے سے کیا حاصل!"

ماں نے جواب دیا۔ "زیغو! میں تیری ماں ہوں مجھے اپنا دشمن نہ سمجھو!"

باپ نے کہا۔ "زیغو! جو ہونا تھا ہو چکا اب تم اپنا فرض انجام دو اور اپنے بڑوں کا فیصلہ قلبی کو جا کر سنا دو!"

زیغو کوئی جواب دیئے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔

* * *

زیغو نے اپنے بڑوں کا فیصلہ مکان سے ملحق، پیچھے باغ میں قلبی کو لے جا کر سنا دیا۔ قلبی پر اس فیصلے کا اتنا برا اثر نہیں ہوا، جس کی زیغو امید کر رہی تھی۔ اس نے افسوس سے پوچھا۔ "کیا تمہیں اس فیصلے سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی؟"

قلبی نے جواب دیا۔ "پہنچی کیوں نہیں لیکن میں اسے جھیل یوں گیا کہ میں اس کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا!"

زیغو نے حیرت سے پوچھا۔ "کیا مطلب؟ کیا تم ہمارے بڑوں کے اس فیصلے سے قبل از وقت ہی آگاہ ہو گئے تھے؟"

"ہاں!" قلبی نے جواب دیا۔ "تم لوگوں میں بچپن سے رہ رہا ہوں، تمہاری قوم کے مزاج اور طبیعت سے اتنا واقف تو ہو ہی گیا ہوں کہ بہت سی باتیں وقت سے پہلے جان جاتا ہوں!"

زیغو نے پوچھا۔ "اب کیا ہو گا؟"

"وہی جو تمہارے بڑے چاہتے ہیں!"

"لیکن میں نے تو ان سے یہ کہہ دیا ہے کہ میں بیرسا کے بڑوں کا فیصلہ اس شرط پر قبول کر دوں گی کہ وہ بھی میری ذاتی زندگی میں آئندہ کسی قسم کا

"نہیں!" اس کے بعد آہستہ سے گردن جھکا کے کہا۔ "کیونکہ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ زندگی بھر کنواری رہوں گی، اور کسی فنیقی نوجوان یا مرد کو اپنا شوہر نہ بناؤں گی!"

فلبی نے کوئی جواب نہیں دیا، زیفو کے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ تھوڑی دیر بعد قدموں میں پڑے ہوئے خشک پتوں پر کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی، زیفو نے سر اٹھا کے فلبی کی طرف دیکھا وہ آنسو بہا رہا تھا اور آنسوؤں کے قطرات خشک پتوں پر گر گر کے ہلکا سا شور کر رہے تھے۔

"تم رو رہے ہو؟ مرد ہو کر رو رہے ہو!" زیفو نے کرتے کے دامن سے اس کے آنسو خشک کرنے کی کوشش کی اور کہنے لگی۔ "رونے کا کام مجھ پر چھوڑ دو، میں رو لوں گی اگر تم ہمارے بڑوں کے اس فیصلے کے خلاف کوئی بڑا عملی قدم اٹھا سکتے ہو تو ہمت کرو میں تمہارا ساتھ دوں گی!"

فلبی نے جواب دیا۔ "یہاں سے پنارس بہت دور ہے اور درمیان میں سمندر حائل ہے اگر پنارس تک پہنچنے کا کوئی بری راستہ ہوتا تو میں تمہیں دنیا کے آخری سرے تک لیے چلا جاتا!"

زیفو نے کہا۔ "کوئی جلدی نہیں ہے پانچ سالوں کے دوران تم اس مسئلے پر آزادی سے سوچتے رہو اور جب کسی امید افزا نتیجے پر پہنچ جاؤ تو اس سے مجھے مطلع کر دو۔ میں اس منصوبے میں تمہارا ساتھ دوں گی!"

فلبی نے بے دلی اور مایوسی سے کہا۔ "میں کوشش کروں گا۔"

زیفو سے جدا ہو کر فلبی اس جگہ پہنچا جہاں پنارسی بوڑھا دو حصوں میں تقسیم ہو کر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کے جسم کے منتشر اعضا اس وقت بھی ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ گوشت مردار خور پرند چٹ کر گئے تھے تھوڑی سی بہت ہڈیاں اور سراب بھی موجود تھا۔ اس نے انہیں یک جا کیا اور پھر ایک گڑھا تلاش کر کے انہیں اس میں ڈال دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر گھر واپس آیا اور رات کی تاریکی میں ایک بار پھر وہیں پہنچ گیا۔ اس نے اپنے کاندھے پر پڑی ہوئی چادر میں ایک چراغ، ایک کوزہ، ایک قاب اور کھانے پینے کے چند دوسرے برتن چھپا رکھے تھے، فنیقیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ مردے بھی انہی کی طرح زندگی گزارتے ہیں اور انہیں بھی ان ضروری چیزوں کی ضرورت رہتی ہے

قلبی نے یہ چیزیں بوڑھے کے سر اور ہڈیوں کے پاس رکھ دیں اور مودب کھڑے ہو کر عرض کیا۔ "میرے معزز ہم وطن بزرگ! میں شرمندہ ہوں کہ تمہیں اتنے دنوں تک ان ضروری اشیاء کے بغیر دن گزارنے پڑے۔ تمہیں یقیناً پریشانی اٹھانی پڑی ہو گی لیکن تم میری بات کا یقین کرو کہ پہلے میں ان رسوم سے واقف نہ تھا۔ تم میری لغزشیں اور کوتاہیاں معاف کر دینا۔ آئندہ میں تمہارا خیال رکھوں گا!"

اس کے بعد اس نے تھوڑی دیر کے لیے سکوت اختیار کیا اور گڑھے کی طرف نظریں جمائے رہا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے بوڑھا اس گڑھے سے جھانک رہا ہے۔ قلبی کا دل بھر آیا وہ بھرائی آواز میں بولا۔ "میرے محترم ہم وطن بزرگ! تمہیں یہ جان کر یقیناً دکھ پہنچے گا کہ میں زیغو کو نہیں حاصل کر سکا کیونکہ مقدس بیرسا کے سرخ پردوں والے ایوان نے یہ فیصلہ سنا دیا ہے کہ میں پنارسی ہوں جو روم ہی کا ایک جزیرہ ہے، روم اور فنیقیہ والوں میں ازلی بیر چلا آرہا ہے پھر وہ اپنی لڑکی ایک رومی کو کیوں دے دیں!"

پنارسی بوڑھے نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا لیکن خوش عقیدہ قلبی یہی سمجھ رہا تھا کہ بوڑھا نہ صرف یہ کہ اس کی باتیں بغور سن رہا ہے بلکہ وہ اس کا کوئی حل بھی ضرور سوچ رہا ہو گا۔

قلبی نے مزید کہا۔ "میرے محترم بزرگ! میں تمہارے پاس اس لیے آیا ہوں کہ تم میرے اس جان لیوا مسئلے کو حل کرو! میں تمہیں ایک بار پھر یہ یقین دلاتا ہوں کہ میں ابھی تک اپنے وطن کو بھولا نہیں ہوں، مجھے اپنی زمین آج اتنی ہی عزیز اور پیاری ہے جتنی خود تمہیں تھی اور مجھے آج بھی اپنے خاندانی قبرستان کی یاد ستاتی رہتی ہے، تم نے میرے دل میں وطن کی عظمت اور محبت کا جو چراغ روشن کیا تھا وہ آج بھی روشن ہے اور مرتے دم تک اسی طرح روشن رہے گا!"

اس کے بعد اس نے اپنے آنسو خشک کیے اور گھر واپس چلا گیا۔

* * *

اسپین کے شہر قرطاجنہ میں ہملکر برقہ کا داماد بھی قتل کر دیا گیا اور وہاں کی قیادت ۲۵، ۲۶ سالہ نوجوان ہنی بال کو منتقل ہو گئی۔ ہنی بال حقیقت میں

جینی بعل تھا جس کا مطلب ہے بعل کے لطف و نوازش ۔ ہینی بال کی پرورش اور تربیت مخصوص انداز میں ہوئی تھی، وہ بچپنے سے رومیوں کے خلاف جذبوں کی پرورش کرتا رہا تھا چنانچہ نئے قرطاجنہ کا اقتدار سنبھالتے ہی اس نے اسپین کے ان علاقوں کی تسخیر کا منصوبہ بنا لیا جو یا تو روما کے زیرِ تسلط تھے یا اس کے حریفوں کے قبضے میں تھا ۔ ایک پرانے معاہدے کی رو سے شمال میں ابرو ندی کے اس پار جنوب میں نئے قرطاجنہ تک ہینی بال کا قبضہ تھا۔ اسی طرح شمال کا ساحلی شہر سگنیتم ہینی بال کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے تک رومیوں کے زیرِ اثر تھا لیکن پرجوش اور سرپھرے ہینی بال میں اب اتنا یارا نہ تھا کہ وہ تمام

جزائر اور ساحلی شہروں سے دستبردار ہو جاتے، وہ ایک مدت سے یہ محسوس کرتا چلا آ رہا تھا کہ رومی حکومت اپنا پنجہ اقتدار دور تک پھیلاتی چلی جا رہی ہے اور یہ بات کم از کم نوجوان ہینی بال ہرگز برداشت نہ کر سکتا تھا بلکہ وہ تو اس فکر میں تھا کہ رومیوں سے وہ تمام علاقے واپس چھین لے جو اس سے پہلے گنوائے جا چکے ہیں، یہ سوچ کر اس نے ساحلی شہر سگنیتم پر حملہ کر کے زیر کر لیا، سگنیتم نے روما سے مدد مانگی لیکن جب تک یہ مدد آتے سگنیتم ہینی بال کے قبضے میں جا چکا تھا، اور اس سے بڑی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ ہینی بال نے ابرو ندی کی حد بندی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ روم کے عمائدین شہر اس فیصلے سے بہت ناخوش تھے، انھوں نے ایک پانچ رکنی وفد قرطاجنہ روانہ کیا اور اسے یہ اختیار دیا کہ وہ بے جھجک شاہانہ رفتار سے بیرسا کی مقدس چوٹی پر جائے اور وہاں سرخ پردوں والے دروازوں کے پیچھے بیٹھی ہوئی مجلس کو یہ بتلائے کہ اگر ہینی بال اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو روما کو مجبوراً کوئی سخت قدم اٹھانا پڑے گا۔

روم کا یہ پانچ رکنی وفد جب قرطاجنہ میں داخل ہوا تو شہر والوں نے اس کا استقبال متضاد جذبوں سے کیا۔ فریعون کے باپ کو ایک عجیب موقع ہاتھ آ گیا اس نے قلبی سے کہا۔ "تمہیں ہمارے ساتھ بیرسا کے ایوان میں چلنا ہے"

قلبی کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس نے وہاں جانے سے انکار کر دیا، کہا۔ "بیرسا کے ایوان کی وہ مجلس، جو میرے خلاف ایک دردناک اور سوہانِ روح فیصلہ سنا چکی ہے، اس لائق ہی نہیں کہ اس کے سامنے جایا

جلتے!"

لیکن زیفو نے کہا۔ "فلبی! چلے جانے میں کوئی ہرج نہیں، ہو سکتا ہے وہاں کوئی ایسی صورت پیش آجائے جس سے ہمارے بڑے اپنا فیصلہ بدل دیں مجھے ایسا لگ رہا ہے، جیسے دیوتا ہم پر مہربان ہو رہے ہیں اور وہ بہت جلد ہمارے دکھوں کو ختم کر دیں گے!"

فلبی نے بے بسی سے کہا۔ "زیفو تم کہتی ہو تو میں تمہارے بڑوں کی مجلس میں چلا جاؤں گا ورنہ وہاں جانے کو میرا جی نہیں چاہتا!"

زیفو کا باپ فلبی کو اس ایوان میں لے گیا جہاں قرطاجنہ کی مجلس کے بڑے لوگ، روم کے پانچ رکنی وفد سے مصروف گفتگو تھے۔

وفد کے صدر نے قرطاجنی مجلس کے سامنے وہ الزامات دہرائے جو رومی حکومت نے ہینی بال پر عائد کیے تھے۔ انہوں نے غصے میں مٹھیاں بھینچ بھینچ کر قرطاجنہ کے بڑوں کو بتایا کہ "ہینی بال ڈاکو کا کردار ادا کر رہا ہے اور اس نے ان سرحدوں کو توڑ دیا ہے جن کا احترام واجب تھا اور اس نے بعض ایسے قلعوں پر قبضہ کر لیا ہے، جو کمزور تھے اور انہیں رومیوں کی حلیفی کا شرف حاصل تھا!"

بیرسا کی مجلس نے رومی وفد کے الزامات بے دلی سے سنے اور پوچھا "ہمیں یہ بتایا جائے کہ رومی حکومت ہم سے کیا چاہتی ہے؟"

وفد کے صدر نے سوچے سمجھے منصوبے کے ماتحت جواب دیا۔ "ہملکر برقہ کے بیٹے ہینی بال اور اس کے آدمیوں کو روما کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے!"

بیرسا کی مجلس نے جواب دیا۔ "نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا!"

رومی وفد کے صدر نے سوال کیا۔ "کیا ہینی بال کے اقدامات میں قرطاجنہ کے بڑوں کی خواہش یا حکم شامل ہے؟ اور یہ کہ کیا بیرسا کے بڑے لوگ ہینی بال کے اقدامات کو ناجائز نہیں سمجھتے!"

بیرسا کی مجلس کا صدر اپنی جگہ کھڑا ہو گیا اور کہا۔ "ہینی بال نے جو کچھ کیا وہ ناجائز کس طرح ہے، اس نے جن قلعوں پر قبضہ کیا ہے وہ پہلے ہمارے حلیف تھے لیکن جب انہوں نے حلف توڑنے میں پہل کی تو ہینی بال کو اس بات کا پورا حق حاصل ہو گیا کہ ان کی گوشمالی کر دی جائے!"

روما کے وفد کا صدر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چغے کو سینے پر کس لیا اور کہا۔ "بیرسا کے معزز سردارو! میں تمہاری باتوں سے تھک چکا ہوں، میں اپنے چغے کی تہہ میں جنگ اور صلح کو لپیٹ کر لایا ہوں، قرطاجنہ کی قسمت کے مالکو! مجھے جواب دو کہ تم کیا پسند کرتے ہو؟"

قرطاجنی مجلس کا قائد اب بھی کھڑا تھا، اس نے کہا۔ "کیا میں اپنے ساتھیوں کو ایک طرف لے جا کے مشورے کر سکتا ہوں؟"

روما کا صدر وفد مان گیا لیکن جب قرطاجنی مجلس کا قائد اپنی جگہ پر دوبارہ واپس آیا تو اس نے خلافِ توقع جواب دیا۔ "روما کے معزز نمائندو! اپنے چغے کی تہہ میں جو کچھ بھی لپیٹ کر لائے ہو اسے تم اپنی مرضی سے نکال لو!"

رومی وفد کے صدر نے غیر جذباتی آواز میں کہا۔ "تو پھر جنگ ہے!"

بیرسا کے بڑوں نے بیک آواز جوش و جزدش سے جواب دیا۔ "ہمیں منظور ہے، منظور ہے!"

رومی وفد کے صدر نے قرطاجنی مجلس کو نہایت افسوس سے مخاطب کیا۔ "افسوس کہ تم نے وہ پسند کیا ہے جو بالآخر قرطاجنہ کی تباہی پر ختم ہوگا۔ ہم روما والوں نے جنگ کے دیوتا جانوس کے مندر کو ایک عرصے سے مقفل کر رکھا تھا۔ لیکن اب وہ ہمارے واپس جاتے ہی کھول دیا جائے گا!"

رومی وفد واپس چلا گیا۔ زیغو کا باپ اسی موقع کا منتظر تھا، وہ مجلس کے قائد کی طرف بڑھا اور عرض گیا۔

"کیا بیرسا کے بڑوں کا یہ فیصلہ حملکر برقہ کے بیٹے ہینی بال تک پہنچایا جائے گا؟"

مجلس کے قائد نے جواب دیا۔ "ہاں، اسی وقت، ابھی کیونکہ ہمارے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے!"

زیغو کے باپ نے کہا۔ "تب پھر اس کام کو میرا بیٹا فلبی انجام دے گا اسے دیوتاؤں کی طرف سے ہمت، عقل، استقلال اور دیانت کا جوہر عطا ہوا ہے!"

قلبی نے بے دلی سے جواب دیا۔ "لیکن خود کو میں، اس کا اہل نہیں سمجھتا!"

زیفو کے باپ نے کہا۔ "یہ تمہارا انکسار ہے!"

مجلس کے قائد نے کہا۔ "تم اِس نوجوان کو خواہ مخواہ مجبور کرتے ہو، اس کام کے لیئے ہمارے پاس اور بھی لوگ ہیں!"

زیفو کا باپ بیرسا کے قائد کے پاس پہنچ گیا اور سرگوشی میں کہا۔ "میں اس نوجوان کو اپنی بیٹی زیفو کی نظروں سے اوجھل کر دینا چاہتا ہوں اور یہ اسی طرح ممکن ہے کہ اسے ہینی بال کے پاس بھیج دیا جائے!"

اس کے بعد مجلس نے اپنا یہ فیصلہ بھی سُنا دیا کہ قلبی اس وفد کے ساتھ جائے گا جو ہینی بال کو روما والوں کے فیصلے سے آگاہ کرنے کے لیئے جانے والا ہے۔ قلبی تو کیا کسی میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ قرطاجنہ کے بڑوں کے فیصلے سے روگردانی کر سکتا۔

قلبی وہاں تو کچھ بھی نہ بولا لیکن گھر تک کے شدید غم اور غصّے کا اظہار کیا۔ اس نے کہا۔ "میں خوب جانتا ہوں کہ مجھے قرطاجنہ سے دُور کیوں بھیجا جا رہا ہے لیکن اب میرے لیئے یہ بالکل ناقابلِ برداشت ہے کہ میں بیرسا کے بڑوں کے ہر اذیت ناک اور سوہانِ روح فیصلے کے آگے سر جھکاتا چلا جاؤں۔ اِن سوہانِ روح فیصلوں کا میں انتقام لوں گا، بھیانک اور اذیت ناک انتقام!"

زیفو کے باپ نے نرمی سے کہا۔ "روما والوں نے ہمارے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا ہے، اب بہترین موقع ہے کہ تم قرطاجنہ کو عملاً اپنی وفاداری کا یقین دِلا دو، مقدس بیرسا کے بڑوں کا فیصلہ ایسا نہیں ہے جو بدلا نہ جا سکے، ہو سکتا ہے کل وہ تم سے خوش ہو کر ہمیں اجازت دے دیں کہ زیفو کو تمہارے حوالے کر دیا جائے!"

قلبی نے جواب دیا۔ "اب مجھے کسی بات کا یقین نہیں رہا!"

اس کے بعد جانے سے پہلے وہ زیفو سے ملا اور کہا۔ "زیفو میں قرطاجنی وفد کے ساتھ ہینی بال کے پاس جا رہا ہوں!"

"جاؤ!" زیفو نے اس طرح جواب دیا گویا وہ کچھ اور سوچ رہی ہو، پھر پوچھا "واپسی کب تک ہو گی؟"

اس نے جواب دیا۔ "کچھ پتہ نہیں، مجھے یہ بھی یقین نہیں کہ ہیبی بال تک پہنچتے پہنچتے میں زندہ بھی رہوں گا یا نہیں کیونکہ تم سب کی قومی عصبیت ان حالات میں مجھے زندہ نہیں دیکھنا چاہتی!"

"ایسی باتیں مت کرو!" زیفو نے ناگواری سے کہا۔ "آخر تم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میں بھی اسی قوم سے تعلق رکھتی ہوں اور میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں جتنی ایک وہ پرستار اپنے دیوتا سے کرتا ہے جو بالآخر دیوتا کی قربان گاہ پر اپنی جان قربان کر دیتا ہے!"

قلبی نے جواب دیا۔ "کیا پتہ؟"

زیفو تلملا گئی، اٹھ کر کھڑی ہو گئی، شدید جذبات میں تنفس تیز ہو گیا اور جسم تھرتھرانے لگا۔ بولی۔ "تم میری محبت پر یقین نہیں رکھتے؟ یہ سب کچھ ڈھونگ ہے؟ میں نے اپنی یہ حالت جو بنا رکھی ہے اس میں جھوٹ اور ریاکاری کارفرما ہے؟ میں نے عمر بھر کنواری رہنے کا عہد جو کیا ہے تو کیا میں اس سے پھر جانے کا ارادہ کر چکی ہوں!" یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

قلبی پتھر کی طرح ساکت کھڑا رہا۔

زیفو نے اچانک اس کو شانوں سے پکڑ لیا اور بد دعا دیتی ہوئی بولی "اگر میں جھوٹی ہوں تو مجھے صحت و تندرستی کا دیوتا ایشمون اپنی نعمتوں سے محروم کر دے اور میں اپاہج اور معذور ہو جاؤں، یہ میری بدقسمتی ہی تو ہے کہ میں جس کی وجہ سے ان حالوں پہنچی، وہی مجھ پر اعتبار نہیں کر رہا، کیا تم کسی ایسے نوجوان کا نام بتا سکتے ہو جس نے اتنی قربت حاصل کی ہو اور میں نے اس کے سامنے لطف و محبت کے دو جملے بھی ادا کیے ہوں!"

قلبی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ زیفو کہتی رہی۔ "بہرحال تم اب واپس آؤ یا نہ آؤ، مجھے کوئی پروا نہیں، میں نے جو عہد کیا ہے، مرتے دم تک اس پر قائم رہوں گی!" اس کے بعد وہ رونے لگی، اس نے قلبی کے شانے چھوڑ دیے اور گھٹنوں میں سر دے کے سسکیاں بھرنے لگی۔ "اے مقدس بیرسا کے دیوتا! کیا تم نے محبت اور سچائی کو اس دنیا سے اٹھا لیا ہے؟ آخر یہ کیسی دنیا ہے، جہاں محبت کی کوئی قدر نہیں، اس محبت اور خلوص سے محروم دنیا میں، میں خود کو اکیلی اور تنہا محسوس کر رہی ہوں، دیوتاؤ! مجھ پر رحم کرو اور مجھے اپنے

پاس بلالو !"

بے حس فلبی کھڑا دیکھتا رہا۔ اس کی باتیں سنتا رہا اور آخر اسے اسی حالت میں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد زیفو اٹھی اور کھوئی کھوئی

بیر سا کی چوٹی پر تانیت دیوی کے مندر میں چلی گئی، تانیت دیوی جو ہندوؤں میں دھرتی ماتا کہلاتی ہے، وہ تانیت دیوی کے قدموں میں لپٹ گئی اور آنسو بہا کے درخواست کی۔ "دیوی! مجھے اپنی آغوش میں چھپا لو، میں غموں سے تنگ آگئی ہوں، تیرے بیٹوں نے میرے دل کو طعن و تشنیع اور دل آزار برتاؤ سے چھلنی کر دیا ہے !"

فلبی قرطاجنی وفد کے ساتھ ہینی بال کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے زیفو کے رویے میں پہلی بار یہ تبدیلی محسوس کی کہ وہ ساحل سمندر پر اسے الوداع کہنے نہیں آئی، زیفو کی محبت پر شک کر کے فلبی نے اس کا دل دکھایا تھا، زیفو نے اس کے خلاف خاموش احتجاج کیا تھا۔ ورنہ اس کا دل اپنے اس رویے پر خون کے آنسو رو دیا تھا۔

* * *

قرطاجنی وفد کو ہینی بال کے پاس فوراً ہی پہنچا دیا گیا۔ اس وقت وہ بل کرت دیوتا کی سیڑھیوں پر کھڑا تھا، دراز قامت، کاندھے پر سیاہ شال پڑی ہوئی تھی، بھورمی اور گندمی پیشانی کے نیچے پر عزم آنکھوں میں ایک خاص چمک پائی جاتی تھی۔ بال گھونگھریالے اور داڑھی چھوٹی تھی، کاندھے ذرا جھکے ہوئے تھے۔ قرطاجنہ کے بڑوں کا فیصلہ اس کے حوالے کر دیا گیا۔ اس نے مندر کی سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے اس فیصلے کو پڑھا اور وفد کو جواب دیا "میں اس فیصلے کو خوش آمدید کہتا ہوں، اب وقت آگیا ہے کہ اہل قرطاجنہ روما کی سیاسی اور فوجی برتری کو خاک میں ملا دیں !"

اس نے وفد کو چند دنوں کے لیے اپنے پاس روک لیا۔ فلبی نے ہینی بال میں کچھ ایسی غیر معمولی صلاحیتیں دیکھیں کہ وہ ان سے متاثر ہوتے بغیر نہ رہ سکا۔ ہینی بال روما پر ایک غیر معمولی اور فیصلہ کن ضرب لگانے کا بہت پہلے تہیہ کر چکا تھا۔ چنانچہ اس کی فوج میں اسپین، فرانس، افریقہ جیسے دور دراز علاقوں کے سپاہی ایک ہی صف میں کھڑے تھے اور ان میں اتحاد تھا، ہینی

بال نے ان کے دلوں کو اپنی مٹھی میں لے رکھا تھا۔ ان میں غلام بھی تھے اور آزاد بھی اور ان دونوں میں امتیاز نہیں برتا گیا تھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ یہاں اسے زیغو کی یاد بہت کم آتی تھی، چنانچہ جب ہینی بال نے قرطاجنی وفد سے یہ سوال کیا کہ "وفد کا کون رکن واپس جانا چاہتا ہے اور کون یہاں رکنا چاہتا ہے :"

تو فلبی کا نام رکنے والوں میں شامل ہو چکا تھا۔

ہینی بال کو جب یہ معلوم ہوا کہ فلبی پنارمس سے تعلق رکھتا ہے تو اس نے فلبی سے وفاداری کا سخت عہد لیا، اس نے فلبی کو مل کرت دیوتا کے سامنے کھڑا کرکے حکم دیا کہ " اپنے سیدھے ہاتھ میں شگاف لگا کے خون بہاؤ اور قسم کھاؤ کہ تم سازش یا غداری کے مرتکب نہیں ہوگے !"

یہ عہد فلبی ہی سے نہیں، بعض اور لوگوں سے بھی لیا جا رہا تھا۔ فلبی نے شانے سے ذرا نیچے ہاتھ کی مچھلی میں شگاف دیا اور خون کے چند چھینٹے مل کرت دیوتا کے قدموں میں چھڑک دیے اور ہینی بال کے حلفیہ کلمات ادا کر دیے۔

صبح طلوعِ آفتاب کے بعد ہینی بال اپنی سپاہ کا جائزہ لینے نکلا، جب وہ فلبی کے قریب پہنچا تو اس نے اہلِ قرطاجنہ کے وہ مظالم جو اس کی روح پر ڈھائے گئے تھے ہینی بال کے گوش گزار کیے اور کہا۔ " برقہ خاندان کے عظیم سردار ! میں زخم خوردہ انسان اپنی وفاداریوں کے عوض یہ چاہوں گا کہ میرے دل پر قرطاجنہ کے بڑوں نے جو گھاؤ لگائے ہیں، ان کا حسنِ سلوک سے اندمال کر دیا جائے !"

ہینی بال نے کوئی خاص اثر لیے بغیر جواب دیا۔ " اپنی وفاداریوں کا تم کس حد سے معاوضہ طلب کر رہے ہو، یہ گستاخی ہے تم نے اپنی جان ہمارے عزائم کے ہاتھ بیچ دی ہے اب یہ ہماری مرضی پر موقوف ہے کہ اس کا کیا اور کس طرح اپنی مرضی سے معاوضہ دیں اور اس کی صحیح قیمت اس وقت متعین ہوگی جب تم واقعی اپنی وفاداریاں ثابت کر چکے ہوگے ورنہ ابھی تو تم ایک عام اور معمولی انسان ہو، عشق زدہ، ایک نوجوان حسینہ کی زلف گرہ گیر کے اسیر، اور میری نظر میں عشق کرنا کوئی قابلِ تحسین یا لائقِ عزت کارنامہ نہیں ہے۔ سبھی نوجوان کرتے ہیں !"

فلبی، اس پتھر دل نوجوان سے خوف زدہ ہو گیا۔ ہینی بال کہتا تھا "سپاہیوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ملک گیری اور کشور کشائی کے علاوہ کسی کام میں دلچسپی لیں، اسی سے وہ خود کو اور اپنی قوم کو سر بلند رکھ سکتے ہیں، تجارت، صنعت، سیاست، مذہب سبھی اس کے تابع ہیں، طاقت، تلوار اور ہتھیار، عزت اور کامیابی کی کنجی ہیں، عورت کا عشق تو ایک سطحی اور اسفل جذبہ ہے، اس ابال کی طرح جو ہانڈی میں تھوڑی دیر کے لئے آتا ہے، اس بلبلے کی طرح جو سطح آب پر ذرا سی دیر کے لئے نمودار ہو کر غائب ہو جاتا ہے!"

اس کے بعد اس نے اپنی سپاہ کو مخاطب کیا اور اس کو بتایا کہ "دیکھو ہم عنقریب روما میں داخل ہو جائیں گے، ایک فاتح اور کشور کشا کی حیثیت سے، وہاں گداز جسم اور تیکھے نقوش والی غزال صفت عورتیں تمہارے دلوں پر چھاپے ماریں گی، خبردار جو تم نے ان عورتوں کے ہاتھوں مفتوح ہونا پسند کیا، اگر تم نے ایسا کیا تو لوگ تم پر ہنسیں گے اور کہیں گے کہ تم کتنے بے وقوف انسان ہو کہ روما کے مردوں کو تو فتح کر لیا لیکن ان کی عورتوں کے ہاتھوں مفتوح ہو گئے، یہ وہ ذلیل ترین داغِ رسوائی ہے جو کسی مرد کی درخشاں پیشانی پر لگ سکتا ہے!"

ہینی بال کی تقریر اور خیالات نے فلبی کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی وہ نیفو سے عشق کرتا تھا۔ شدید عشق لیکن ہینی بال کی تقریر کے بعد اسے یہ محسوس ہوا جیسے وہ اب تک عشق نہیں گناہ کرتا رہا ہے، کوئی جرم کرتا رہا ہے۔

ہینی بال نے اپنی تقریر کی صداقت کو عملاً یوں ثابت کیا کہ اس نے اپنی چہیتی بیوی املکہ اور چھوٹے سے بچے کو افریقی قرطاجنہ روانہ کر دیا، جس جہاز پر اس کا خاندان قرطاجنہ کے لئے روانہ ہوا تھا۔ ہینی بال اس کا نظارہ یک ساحلی دیدبان سے کرتا رہا۔

* * *

فلبی کے لئے یہ دنیا عجیب تھی، طاقت ور اور عظیم شخصیت کس طرح کمزور شخصیتوں کو مغلوب کر لیتی ہے، اس کی بہترین مثال ہینی بال اور اس کے آس پاس کے ماحول میں موجود تھی، یہاں ذہین لوگ بھی موجود رہتے اور کوڑھ

مغز بہادر بھی، یہاں فرماں برداروں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی اور سرکشوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی، اور ان سب پر ہینی بال کی شخصیت حاوی تھی، نئے قرطاجنہ کی سڑکیں بھری رہتیں، چاروں طرف سے فوجی آتے چلے جا رہے تھے۔

افریقہ کے نومدی اپنی مخصوص وضع میں دور ہی سے پہچانے جاتے، یہ بغیر لگام کے گھوڑوں پر سوار، ہاتھی کی کھال کی ڈھالیں اپنی پشت پر ڈالے، سانگ (چھوٹی برچھی) اور چھروں سے لیس گردنیں پر جھی کیے یوں گزر جاتے گویا دنیا کی شجاعت اور بے جگری ان پر ختم ہو گئی ہے، یہ نومدی بے لگام گھڑسواری میں جنگ کے دوران اپنے حریف پر سبقت لے جاتے کیونکہ ان کے حریف کا ایک ہاتھ تو گھوڑے کی لگام پکڑے ہوتا اور دوسرے ہاتھ سے وہ مقابلہ کرتے لیکن یہ سرفروش نومدی دونوں ہاتھوں سے جنگ کرتے اس لیے کہ یہ بے لگام گھوڑوں پر سوار ہونے کی وجہ سے دونوں ہاتھ خالی رکھتے تھے۔ ان کی سانگ (چھوٹی برچھی) کی مار بہت مشہور تھی یہ اپنے حریف کو سانگ کھینچ کر مارتے تھے جو اس کی زرہ توڑ کر جسم میں داخل ہو جاتی تھی، اس سانگ کے علاوہ فلاخنوں میں سیسے کی گولیاں رکھ کر بھی چلاتے تھے اور یہ گولیاں بھی اکثر زرہ توڑ کر جسم میں پیوست ہو جاتی تھیں۔

اسپین کے ری بیری بھی اپنے جھنڈوں سے پہچانے جاتے تھے، کرنوں والا سورج اور ہلال ان کے جھنڈوں کے امتیازی نشان تھے، اسی طرح قلط بیری تھے جو چرمی کنٹوپوں میں منہ چھپائے اور بڑے بڑے برچھے سنبھالے ایک انداز سرکشی سے آگے بڑھ جاتے، ان کے کنٹوپ میں لوہے کی کڑیاں لگی ہوتیں جو میدان جنگ میں بڑا بچاؤ کرتی تھیں، ان میں قلطی بھی شامل تھے جو اپنی خمیدہ تلواروں اور فولادی لٹھ کی وجہ سے دور ہی سے پہچانے جاتے تھے، ان میں عالی خاندان لوگ بھی شامل تھے یہ گل بوٹوں کی سرخ قبائیں پہنے اپنے گھوڑے اچکاتے ادھر ادھر بھاگتے نظر آتے۔ یہ سب پچاس ہزار تھے، ان میں چالیس ہاتھی تھے۔ ہینی بال اپنے لشکر کے ساتھ ابرو ندی کی طرف بڑھا یہ وہی ندی ہے جس کی بابت رومائی حکومت بڑی فکرمند بنی تھی اور اس نے افریقی قرطاجنہ کے بڑوں سے یہ معاہدہ کر رکھا تھا کہ ابرو ندی کے شمالی ساحل سے رومادالوں کے اقتدار کی حد شروع ہو جاتی ہے اور ہینی بال کی حدود اس کے جنوبی کنارے

تک تھیں اور یہ معاہدہ ہوا تھا کہ ہینی بال کی افواج روما کی مرضی کے بغیر ان حدود کی خلاف ورزی نہیں کریں گی۔ ہینی بال اپنا نیم زنگی لشکر لے کر ابرو ندی کی طرف بڑھا اور ابرو ندی کے اس پار اتر گیا۔ اس نے ہنستے ہوئے زیر لب کہا۔ "خوب! معاہدہ تو یہ تھا کہ ہم افریقی اپنے ہتھیاروں کے ساتھ ابرو ندی نہیں پار کریں گے لیکن آج میں اپنے پچاس ہزار لوہ چالیس ہاتھیوں کے ساتھ دوسرے کنارے پر اتر چکا ہوں، روما والو! آؤ دیکھو، یہ میں نے کیا کر دیا!"

ہینی بال کے سپاہی ابھی تک اس کے عزائم سے پوری طرح باخبر نہ تھے، انہیں تو بس اتنا معلوم تھا کہ ہینی بال روما پر حملہ کرنے جا رہا ہے لیکن یہ حملہ روما پر کس سمت سے کیا جائے گا۔ ابھی تک کسی کو بھی نہیں معلوم تھا۔ ابرو ندی کے اس پار وہ الرجبت کی پہاڑیوں میں داخل ہو گیا۔ یہاں کے بہادر لوگ اس کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے لیکن ہینی بال عظیم رومن امپائر کی بربادی کا ارادہ لے کر چلا تھا۔ الرجبت کے پہاڑی بہادر اس کے ایک ہی ریلے میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے اور شکست اٹھانے کے بعد بہتوں نے اس کی فوج میں نوکری کر لی۔

ابرو ندی سے پائی ریں کے دروں کا فاصلہ ایک سو اسی میل تھا اور یہ فاصلہ چھ دن میں طے کیا جا سکتا تھا لیکن ہینی بال اپنے لشکر کے ساتھ جن دنوں یہ فاصلہ طے کر رہا تھا۔ موسم بہت خراب تھا اور قدم قدم پر موسم کی مزاحمت نے چھ دن کا سفر تین مہینوں میں پورا کرایا تھا۔ اگر اس کے سپاہیوں کو یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ آہستہ آہستہ ایلپس کے اس کوہستانی سلسلے کی طرف بڑھ رہا ہے جس کے دوسری طرف جنوب میں روما سینہ تانے کھڑا ہے۔ تو شاید وہ آگے بڑھنے میں تامل سے کام لیتے۔

اس سفر کی سب سے عجیب کیفیت یہ تھی کہ ہینی بال یہ دشوار گزار سفر برفباری سے پہلے پہلے ختم کر لینا چاہتا تھا۔ پائی ریں میں قلطیوں نے راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن انہیں بھی پسپا ہونا پڑا۔ یہ قلطیوں کی آبادی تھی۔ ہینی بال راہ مشکلات پر قابو پاتا ہوا ایلپس کے کوہستان میں داخل ہو گیا۔ وہ جن علاقوں سے بھی گزرا دولت اور عورت کی بہتات دیکھی لیکن ہینی بال نے اپنی فوج کو خراب نہیں ہونے دیا اور یہی کہتا رہا۔ "بہادرو! ان معمولی لوگوں پر اپنی قوت ضائع کرنے سے فائدہ، روما کی تسخیر کے بعد یہ لوگ خود بخود اطاعت قبول کر لیں گے، اس وقت تم لوگ آزاد اور خود مختار ہو گے اور جی بھر کے عیش کر لینا لیکن ابھی میں اس کی اجازت نہیں دوں گا!"

پائی ریں کے دشوار گزار دروں کے ساتھ ہی ایلپس کا سلسلہ راستہ روک کے کھڑا ہو گیا اور فوجیوں کے حوصلے پست ہونے لگے۔ اس نے مذبذب اور کم ہمت سپاہیوں کے

چہرے پر خوف کا ہلکا سا سایہ محسوس کیا۔

اس نے اپنی پوری فوج کو مخاطب کیا اور کہا۔ "میں نے اپنے بہت سے سپاہیوں کے چہرے پر فکر اور تردد کی سیاہی محسوس کی ہیں، کیا تم لوگوں نے یہ طے کر لیا ہے روما والوں کے سامنے رو سیاہ پہنچو، ممکن ہے تمہیں اپنی عزت کا پاس نہ ہو لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا اور میں اپنی فوج کے سیاہ چہرے والوں سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں!"

ایک اسپینی نے سوال کیا۔ "پہلے ہمیں یہ بتاؤ کہ تم ہمیں لیے کہاں جا رہے ہو؟"

ہینی بال زور سے ہنسنے لگا، بولا۔ "سمجھا، سمجھا، تو یہ بات ہے۔" پھر سنجیدگی سے سوال کیا۔ "کیا میں نے تمہیں اپنے عزائم سے مطلع نہیں کر دیا تھا، میں روما والوں کو ایک ایسا سبق دینے جا رہا ہوں جسے وہ ہمیشہ یاد رکھیں گے!"

"ہمیں یہ تو معلوم ہے!" ایک اسپینی سردار نے کہا۔ "لیکن اب ہم زیادہ دور نہیں جا سکتے۔"

ہینی بال نے کہا۔ "تم بزدل ہو، جنگ سے ڈرتے ہو۔"

اسپینی سردار نے جواب دیا۔ "نہیں ایسی کوئی بات نہیں، ہم لڑائی سے بالکل نہیں ڈرتے مگر ہم نامعلوم پہاڑوں میں جانا بھی پسند نہیں کرتے کیونکہ ہم اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ ان نامعلوم پہاڑوں میں اجنبی دیوی دیوتا مسلط ہیں۔ ہمیں اپنا وطن عزیز ہے، اپنے وطن کے میدان پیارے ہیں، ہم آگے نہیں جانا چاہتے!"

فلبی کو اپنا بوڑھا یاد آ گیا، وہ بھی اسی طرح وطن کی رٹ لگائے رہتا تھا۔ اسی دوران اسے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ ہینی بال اپنا لشکر ہاتھیوں سمیت ایلپس کے اس پار لے جانا چاہتا ہے، اس کے سامنے حدِ نظر تک سفید پوش پہاڑوں کا پیچ در پیچ اور کوہاں در کوہان سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔

ہینی بال نے اسپینی سرداروں سے سوال کیا۔ "تم کیا چاہتے ہو؟"

اسپینی سرداروں نے بیک آواز جواب دیا۔ "اپنے وطن واپس جانا چاہتے ہیں!"

"بہتر ہے!" ہینی بال نے اسپینی سرداروں کا فیصلہ خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔ اس نے باوقار انداز میں مزید کہا۔ "جو لوگ واپس جانا چاہتے ہیں میں انہیں واپس جانے کی اجازت دیتا ہوں لیکن جو لوگ میرا ساتھ دینا چاہتے ہیں انہیں آفرین کہتا ہوں اور انہیں یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مرنا جینا انہی کے ساتھ ہو گا!"

ہینی بال کی طرف سے اجازت ملتے ہی سات ہزار اسپینی، فوج سے الگ ہو گئے فلپی کے جی میں آئی کہ وہ بھی انھی کے ساتھ ہو لے لیکن یہ اسپینی تھے اور اسپین اس کا وطن نہیں تھا۔

واپس جانے والوں نے دوسرے فوجیوں میں بد دلی اور مایوسی پھیلا دی تھی، جب یہ لوگ دریائے رہون کے اس پار پہنچے اور ایلپس کے بلند ترین سلسلوں پر نظر ڈالی تو بہت زیادہ گھبرا گئے۔ ہینی بال ان پر گہری نظریں رکھے ہوئے تھا اور وہ انہیں نفسیاتی طریقوں سے قابو میں رکھنے کا قطعی فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے ان پریشان حال بد حواسوں کو اپنے روبرو طلب کیا اور کہا۔ "میں دیکھ رہا ہوں کہ بعضوں کے چہرے کی سیاہیاں گہری ہوتی جا رہی ہیں، آخر اس کا کوئی خاص مطلب ہے؟"

کسی سپاہی نے بدقت تمام عرض کیا۔ "میں نے نہایت غور سے آسمان اور پہاڑی سلسلوں کو دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہی وہ بلند و بالا پہاڑ ہیں جن کی چوٹیاں نظر نہیں آتیں اور جن کی بابت عقل مندوں نے کہا ہے کہ یہ نیلے آسمان تک بلند ہیں!"

کسی دوسرے سپاہی نے کہا۔ "یقیناً اِن بلند و بالا پہاڑوں نے ہمارا راستہ روک لیا ہے اور دوسری آفت یہ ہے کہ یہاں پھسلن بہت زیادہ ہے۔ مرطوب جنگل، ہوا کی وجہ سے کپڑے سکھانا یا بدن گرم رکھنا ناممکن ہے، لوگ کہتے ہیں کہ اس کی بلندیاں دیوتاؤں کے دیس تک چلی گئی ہیں!"

ہینی بال نے بے رخی سے جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے، تمہارا خیال درست ہو لیکن میں یہ جاننے کے بعد کہ ان پہاڑوں کی بلندیاں دیوتاؤں کے دیس تک چلی گئی ہیں، انہیں پار کرنے کا شرف حاصل کیے بغیر واپس نہ جاؤں گا!"

اس کے بعد وہ ایک مقامی سردار کو پکڑ لایا اور ان شاکی اور نکٹھ دلوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ جوش میں بولا۔ "معزز دوستو! میں تمہارے روبرو کھڑا ہوں اور اپنے ساتھ ایک ایسے سردار کو بھی لایا ہوں جو ان پہاڑیوں کو کئی بار عبور کر چکا ہے ذرا اس کی بات تو سنو، دیکھو یہ کیا کہتا ہے؟"

یہ مسلح سوار صفوں میں سے نکلا اور ہینی بال کی طرف بڑھنے لگا پھر اس کے قریب پہنچ کر کھڑا ہو گیا، ایک نظر مجمع پر ڈالی اور کہنے لگا۔ "میرے خوف زدہ اور ہراساں ساتھیو! میں دیوتاؤں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اسے میں کئی بار عبور کر چکا ہوں یہاں کوئی دیوتا نہیں، ہاں راستے البتہ ہیں اور ان راستوں پر کوئی بھی چل سکتا ہے!"

اس کے بعد ہینی بال مخاطب ہوا "میں کہتا ہوں، تم لوگ خیالی اندیشوں میں مت پڑو اور حقیقت سمجھنے کی کوشش کرو، یہ ایلپس جسے تم یقیناً عبور کر لو گے بس یہ ذرا اونچا پہاڑ ہے لیکن تم یقین کرو کہ یہ پہاڑ آسمان نہیں چھوتے، جب تم ان پر سے گزر رہے ہو گے تو یہ دلچسپ منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھو گے کہ ان میں آباد قلطی خاندان کھیتی باڑی کر رہے ہوں گے!"

ادھر ہینی بال ایلپس کو عبور کرنے کی کوشش میں تھا دوسری طرف روما والے اس کی آمد سے خبردار ہو چکے تھے اور ان کا وہ لشکر جو پانچ رکنی وفد کے اعلانِ جنگ کے بعد قرطاجنہ جانے والا تھا روک لیا گیا تھا کیونکہ ہینی بال بلائے آسمانی کی طرح ان کے سروں پر منڈلانے ہی والا تھا۔

* * *

ہینی بال ایلپس میں داخل ہو گیا، یہاں جگہ جگہ ندیوں کا جال سا بچھا ہوا تھا اس عظیم لشکر میں قلبی کی حیثیت ایک بھنگے جیسی تھی اور اسے صاف نظر آرہا تھا کہ اب وہ نہ تو وطن واپس جا سکے گا نہ قرطاجنہ یا اسپین اور اسے یہ یقین بھی نہ تھا کہ وہ روما کی کسی جنگ میں شرکت کر سکے گا لیکن اسے یہ یقین ضرور تھا کہ وہ ایلپس کو عبور کرتا ہوا کہیں بھی کسی کھڈ میں غائب ہو جائے گا۔

ہینی بال نے بہت سارے آدمیوں کو برف توڑنے اور کھڈوں کو قابلِ عبور بنانے کے لیے بڑے بڑے شہتیروں سے پاٹنے کے کام پر مامور کیا، یہ ایک کھڈ پاٹتے تو دوسرا سامنے آجاتا، اسی طرح چٹانیں بھی حائل ہو رہی تھیں، ایک کے بعد ایک۔ یہ انہیں نہایت مشکلوں سے عبور کرتا بڑھا چلا جا رہا تھا۔ اس کا ہر قدم ایلپس کی رکاوٹیں روک رہی تھیں، ہاتھی نہایت احتیاط سے آگے بڑھتے اور جب ایک بار اپنا توازن کھو بیٹھتے تو دوبارہ وہ کہیں نظر نہ آتے، کسی کھڈ میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جاتے۔ گرتے ہوئے ہاتھی کی چنگھاڑ سے پہاڑی چٹانیں گونج اٹھتیں اور سپاہ کے دلوں میں زلزلہ سا آجاتا۔ باربردار گاڑیاں بھی حرکت میں تھیں، یہ لوگ ایلپس کی بلندی پر جا رہے تھے۔ سپاہ اِدھر اُدھر منتشر ہو چکی تھی اور مختلف سمتوں سے اوپر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی عالم میں انہیں طوفانِ بادوباراں کا مقابلہ کرنا پڑا اور کتنے ہی لشکری راستے کی صعوبتوں کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے ایلپس کی گہرائیوں میں ہمیشہ کے لئے روپوش ہو گئے۔

اس پُر صعوبت سفر کے نویں دن ہینی بال پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا اور وہاں اپنے ان

ساتھیوں کا انتظار کرنے لگا جو دوسرے راستوں سے اوپر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے، یہاں وہ دو دن مقیم رہا، اس عرصے میں دوسرے لوگ بھی وہاں پہنچ گئے۔ برف اور طوفانِ باد و باراں نے ہاتھیوں کو بیمار ڈال دیا اور ان میں سے اکثر اوپر پہنچتے پہنچتے مر گئے۔ سپاہیوں میں سخت بددلی پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں انہیں کھانے پینے کی دشواریاں بھی پیش آئیں، جس پہاڑ کی سطح پر وہ پہنچ چکے تھے، اس کے دونوں طرف ایلپس کے سفید حصار کھڑے حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ سپاہیوں میں اب مزید چلنے کا یارا نہ رہا تھا۔ ان کے بدن اکڑ چکے تھے اور بھوک نے انہیں نڈھال کر دیا تھا زندگی کی طرف سے مایوسی نے سپاہ میں سرکشی اور سستی پیدا کر دی تھی، ہینی بال کے لئے یہ وقت بہت برا تھا اس نے اپنے نیم مردہ ساتھیوں کو ہاتھ کے اشارے سے حکم دیا کہ تھوڑی دیر اس کے ساتھ چلنے کی زحمت گوارا کریں۔ اس بار اس نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ وہ اپنے ساتھ انہی لوگوں کو لے کر آگے بڑھے جو سردار ہوں کیونکہ سرداروں میں حوصلہ اور برداشت زیادہ پایا جاتا ہے۔

یہ صبح کا وقت تھا، اس نے پہاڑ کی بلندی سے مشرق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ادھر دیکھو مشرق میں وہاں تمہیں کچھ دکھائی دے رہا ہے؟"

سرداروں نے دور نیچے کی طرف دیکھا وہاں دھندلے جنگل اور کھیت دکھائی دے رہے تھے۔

ہینی بال نے کہا "یہ روما کے کھیت ہیں!" اس کے بعد اس نے اپنا سیاہ چغہ سینے پر سے ہٹا دیا۔ اس کے ہٹتے ہی تلوار کا مرصع قبضہ صاف نظر آنے لگا۔ اس نے اک شانِ بے نیازی سے کہا۔ "یہ روما کے میدان ہیں، اور یہ پہاڑ جہاں ہم اس وقت کھڑے ہیں روما کی فصیلیں ہیں، ہم اپنے دشمن کی فصیلوں پر قابض ہو چکے ہیں، اب نیچے آبادیوں میں حسین عورتیں اور دولت تمہاری منتظر ہیں اور انہیں ہم اسی وقت حاصل کر سکتے ہیں جب ان فصیلوں سے نیچے اتر جائیں گے!"

سرداروں کے مردہ چہروں پر رونق آ گئی۔ عورت، دولت اور شہرت ایلپس کے نیچے دنیا کی ساری نعمتیں ان کی منتظر تھیں۔

ہینی بال نے ان سرداروں کو حکم دیا۔ "جاؤ اور اپنے اپنے سپاہیوں کو بھی خوش خبری سنا دو کیونکہ اس خوش خبری کے بغیر ان کے مردہ چہروں پر رونق نہیں آئے گی!"

ہینی بال کا یہ پیغام ایک ایک سپاہی تک پہنچ گیا، یہاں تک کہ بار بردار اور بھیڑے دار تک اس خوش خبری سے آشنا ہو چکے تھے۔ راستے کی صعوبتیں اٹھائے، بھوک پیاس سے نڈھال اور اپنے وطن سے کئی سو میل دور ہر سپاہی خوشی سے ایک دوسرے کو یہ بتا رہا تھا کہ "دوستو! مہم کا زمانہ گیا۔ اس وقت ہم روما کی فصیل پر قابض نیچے اترنے کے منتظر ہیں ہمارے نیچے روما کے

شہر ہیں جہاں گوشت، شراب، عورت، دولت، شہرت اور آگ کے الاؤ ہیں، وہاں سونے چاندی کا ڈھیر لگا ہوا ہے اور وہاں کی مہذب عورتیں! کہتے ہیں انہیں ساقی گری آتی ہے!"
طوفانِ باد و باراں راستے کی صعوبتیں اور بھوک پیاس کی سختیاں جھیلی ہوئی فوج تازہ دم ہو گئی اس میں زندگی کی حرارت دوڑ گئی۔

* * *

دو دن قیام کرنے کے بعد تیسرے دن پہاڑوں سے نیچے اترنے کے لیئے فوج حرکت میں آ گئی۔ اتار چڑھائی سے زیادہ دشوار ثابت ہوا، پہاڑی راستے جگہ جگہ جمی ہوئی برف کے نیچے چھپ گئے تھے۔ برف کی تہوں میں جمی ہوئی پہاڑوں میں مویشیوں کے لیئے چارہ ملنا ناممکن تھا اس لیے بھوکے جانور اتنے کمزور ہو چکے تھے کہ ہر قدم پر لڑکھڑا کر گر جاتے، کہیں کہیں جب برف کی پتلی تہہ ان مویشیوں کا بوجھ نہ سہار سکتی اور ٹوٹ جاتی تو جانوروں کے پیر ٹوٹی ہوئی برف میں دھنس جاتے اور جانور اس میں پھنس کر اچھا خاصا تماشا بن جاتے اور ہینی بال کے لشکری ان دلچسپ مناظر سے خوش ہونے کے بجائے خوف زدہ اور پریشان ہو جاتے۔ ہینی بال کے فوجی سرداروں کو یہ تشویش تھی کہ اگر پہاڑوں کے نیچے اترتے ہی ان پر روما والوں نے حملہ کر دیا تو ان کا مقابلہ کس طرح کیا جائے گا لیکن ہینی بال کا چہرہ فکر و تشویش کے تاثرات سے بالکل عاری تھا۔

لشکریوں کی بڑی تعداد برف کے تودے توڑ توڑ کر راستے بنانے میں مصروف تھی، چلتے چلتے یکایک یہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں برف کی تہہ میں چھپا ہوا راستہ ایک دم ختم ہو جاتا تھا اور سامنے ایک بہت بڑی چٹان ان کا راستہ روکے کھڑی تھی، چٹان کے نیچے وادی میں سرسبز و شاداب جنگل یوں کھڑا تھا جیسے بھوکوں کے سامنے ناقابلِ دسترس حد میں لذیذ اور خوش ذائقہ کھانوں کے خوان، پورا لشکر اس چٹان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ہینی بال کے حکم سے چٹانیں توڑنے والے کدالیں لے کر آگے بڑھے بمشکل الاؤ جلایا گیا اور چٹان کی درازوں میں سرکے کے مرتبان انڈیل دیے گئے، آگ اور سرکے کے امتزاج نے چٹان کو کسی حد تک نرم کر دیا، اس کے بعد ان پر کدالوں کی بارش ہونے لگی، کدالوں کی پے در پے شدید ضربات نے چٹان کو توڑ دیا اور اتنا راستہ نکل آیا کہ یہ لشکر وادی میں نظر آنے والے جنگل میں داخل ہو گیا۔ کہتے ہیں اوپر سے نیچے اترنے میں ہینی بال کے پندرہ دن ضائع ہوتے تھے اور ہزاروں آدمیوں اور جانوروں نے اپنی زندگی سے ہاتھ دھو لیا تھا۔

نیچے اطالیہ کی پہلی بستی کے لوگ ہینی بال کی سپاہ کو پہاڑ کی چوٹی سے اترتے دیکھ رہے

تھے، ان کے لیئے ہینی بال کی سپاہ کی جد وجہد بڑی پُر لطف اور مزے دار تھی اور اس جد وجہد کو وہ اس شوق سے دیکھ رہے تھے جیسے تھیٹر کو تماشائی دیکھتے ہیں لیکن جیسے جیسے یہ لوگ پیچھے اترے مقامی لوگوں کو ہوش آتا گیا، انہوں نے ہینی بال کے دو آدمیوں کو نڈھال اور بے حال دیکھا تھا۔ اسی طرح ان کے مویشیوں کو لنگڑا لنگڑا کر چلتے دیکھا تھا۔ ان کے پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ ہاتھیوں کی پشت پر بوسیدہ کپڑے پڑے تھے۔ مقامی لوگ تیزی سے اپنے گھروں میں داخل ہوئے اور ہتھیاروں سے لیس ہو کر ہینی بال کے مقابلے پر آگئے۔ انہیں قرطاجنی سپہ سالار کے ارادوں میں پہلی بار کوئی کھوٹ محسوس ہوئی تھی ان کا خیال تھا کہ اگر اس تھکے ماندے پریشان حال لشکر پر ایک دم ہلا بول دیا جائے گا۔ تو بڑی جلدی قابو میں آجائیں گے، انہوں نے ان تازہ واردان پر ایک دم ہلا بول دیا۔ تھکی ماندی قرطاجنی سپاہ جان پر کھیل کر یہاں تک پہنچی تھی اسے کھانا درکار تھا۔ آگ چاہیئے تھی اور سر چھپانے کے لیئے ٹھکانوں کی تلاش تھی۔ انہوں نے ہلا بولنے والوں کو بلائے بے درماں کی طرح گھیر لیا اور بہتوں کو قتل اور گرفتار کر لیا، کچھ گھروں سے فرار ہو گئے اور جب جنگ کا مطلع صاف ہوا تو مقامی لوگوں کی پوری بستی ویران اور سنسان پڑی تھی، ہینی بال نے ان خالی مکانوں میں اپنی سپاہ کو گھس جانے کا حکم دیا اور کہا۔ "ہم کچھ دن یہیں ستائیں گے اور ساز و سامان درست کریں گے" ہمارے مویشی نڈھال ہیں، ان کی توانائی بحال کریں گے۔ اس کے بعد آگے کا ارادہ کریں گے، یہاں اسے اپنے ان دستوں کا ابھی انتظار کرنا تھا جو اب تک نہیں پہنچے تھے اور انہوں نے راہ میں اس کی رفاقت اور ملازمت اختیار کی تھی لیکن کافی انتظار کرنے کے بعد بھی جب یہ لوگ وہاں نہیں پہنچے تو ہینی بال کے ساتھ ہی دوسرے فوجی افسروں کو بھی یہ یقین ہو گیا کہ ان حلیفوں نے انہیں دھوکا دیا ہے اور اب وہ شاید کبھی بھی نہ آئیں گے۔

ہینی بال کے عمر رسیدہ اور تجربہ کار سپہ سالار پرٹ اور مہربال اس فکر میں پھنسے ہوئے تھے کہ اگر ان کے حلیف واقعی نہ آئے تو ان چھبیس ہزار سپاہیوں سے روما کس طرح فتح کیا جائے گا۔ پچاس ہزار میں سے اب صرف چھبیس ہزار سپاہی بچے تھے۔ ان دونوں سپہ سالاروں نے یہ بھی سوچا کہ اگر مقابلہ ان چھبیس ہزار سپاہ سے ہی کرنا پڑ جائے تو پھر اس جنگ کو سردست ملتوی کر دینا چاہیئے اور اسپین واپس چلا جانا چاہیئے، پرٹ اور مہربال سپاہیوں کے درمیان بیٹھے مستقبل کے لائحہ عمل پر غور کر رہے تھے، ان کے ہم خیالوں میں فلبی بھی شامل تھا۔ اس نے کہا۔ "اہل قرطاجنہ نے جن طاقت ور رومیوں سے ڈر کر کوہ ارکس خالی کر دیا تھا اور پھر سارڈینا اور کورسیکا سے بھی بے دخل ہو گئے تھے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ کیا ہم اپنے اس طاقت ور دشمن کو اپنی تھکی ماندی چھبیس ہزار فوج سے شکست دے دیں گے ؟"

عمر رسیدہ سپہ سالار مہربال نے بھی فلبی کی اس رائے سے کسی حد تک اتفاق کیا۔ بولا۔۔۔

پبنارسی نوجوان! تم ٹھیک کہتے ہو لیکن میرا جنگی میدانوں کا وسیع تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اب حالات ذرا بدل گئے ہیں اور ہم معقول تعدادی فوج سے روماوالوں کو شکست دے سکتے ہیں لیکن اتنی کم تعداد اور تھکی ہوئی فوج سے یہ کارنامہ نہیں انجام دیا جا سکتا!"

ھینی بال کے بڑے بڑے کان اپنی سپاہ کے ایک ایک آدمی کی باتیں ہی نہیں ان کے دل کی دھڑکنیں تک سن رہے تھے۔ وہ مہر بال کی چوپال میں ہونے والی باتیں نہایت توجہ سے سنتا رہا۔ پھر اچانک اندر داخل ہو گیا اور فلبی کو جھڑکتا ہوا بولا۔"او پبنارسی نوجوان! کہیں تو ہماری سپاہ میں سازش اور افتراق کے بیج تو نہیں بو رہا، تجھے یہاں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہییں، ہم روما پر دیوتاؤں کا قہر بن کے ٹوٹے ہیں اور تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا کہ روما والوں سے وہ سارا حساب کیا جائے گا جو اب تک اہل قرطاجنہ ان سے لے نہیں سکے ہیں، کوہ ارکس، سارڈینا اور کورسیکا خالی کر دینے کی ذلت کا حساب، میں اہل روما کو ان کی اپنی زمین میں غلام بنانے آیا ہوں!"

پھر وہ بوڑھے مہر بال سے مخاطب ہوا۔"تم میرے باپ کے زمانے سے سپہ سالاری کرتے چلے آ رہے ہو، اگر میری جگہ اس فوج کے تم سپہ سالار ہوتے تو ان حالات میں کون سا قدم اٹھاتے؟"

جرأت مند مہر بال نے جواب دیا۔"ھینی بال! تم ابھی نوجوان ہو اور تمہیں وہ تجربہ حاصل نہیں جو میرا برف کے گالوں میں چھپا ہوا دماغ رکھتا ہے، تم جو کچھ کر رہے ہو اس میں نوجوانی کا جوش اور غیر مآل اندیشی کار فرما ہیں۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو یقیناً روما میں داخلے کے لئے یہ تباہ کن راستہ نہ اختیار کرتا اور اگر غلطی سے یہ راہ اختیار بھی کر لیتا تو یہاں سے۔ جہاں اس وقت ہم سب ٹھہرے ہوئے ہیں چپ چاپ واپس چلا جاتا کیونکہ طاقت ور اور چاق و چوبند دشمن کے ہاتھوں خواہ مخواہ قتل ہو جانے سے یہ بہتر ہے کہ اپنی سپاہ کو بخیر و عافیت یہاں سے واپس لے جائیں!"

* * *

ھینی بال نہایت توجہ سے مہر بال کی باتیں سنتا رہا، پھر زور سے ہنس دیا۔ بولا۔"جسے تم میری جوانی کا جوش اور غیر مآل اندیشی کہہ رہے ہو اس میں میرا تدبر کار فرما ہے، روما والے ان تمام راہوں کا شاندار اور ناقابل تسخیر دفاع کر سکتے ہیں، جدھر سے ان کا کوئی بھی دشمن وارد ہو سکتا ہے لیکن یہ راستہ جسے ہم بروقت عبور کر کے روما میں داخل ہو گئے ہیں، یوں ہی خالی پڑا تھا۔ اور روما والے یہ یقین کئے بیٹھے ہیں کہ ان ناقابل گزر راستوں سے۔ برف باری کے زمانے میں کم از کم کوئی انسان تو نہیں گزر سکتا نہ کہ دشمن کی سپاہ، میں ان کی اسی غفلت سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں ذرا سوچو تو کہ جب اہل روما کے عمائدین اور سپاہ کو یہ معلوم ہو گا کہ میں کوہ ایلپس کی چوٹیوں سے اپنی فوج لے کر ان پر

ٹوٹ پڑا ہوں تو ان پر اس جرأت کا بڑا نفسیاتی اثر پڑے گا آدھی جنگ تو اس نفسیاتی اثر ہی سے جیت لی جائے گی!"

مہربال نے سرکشی سے جواب دیا۔ "یہ خیالی باتیں ہیں، میں ان پر اس وقت تک یقین نہیں کر سکتا جب تک اس کے نتائج خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں!" پھر ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ "اور جب تو قع نتائج دیکھنا شاید ہماری قسمت میں نہیں لکھا گیا!"

ہینی بال نے سختی سے کہا۔ "بہرحال اور کوئی بات یقینی ہو یا نہ ہو لیکن ایک بات ضرور یقینی ہے اور وہ یہ کہ ہم یہاں سے واپس نہیں جائیں گے!"

اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ جو لوگ اس سے جنگ کرتے ہوتے پکڑے گئے ہیں انہیں ایک میدان میں کھڑا کیا جائے جب یہ زنجیروں اور رسیوں میں جکڑے ہوتے قیدی میدان میں کھڑے کیے گئے تو اس نے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ وہ بھی یہیں جمع ہو جائے کیونکہ ایک دلچسپ کھیل دکھایا جائے گا۔

قرطاجنی سپاہ بھی وہیں پہنچ گئی۔

ہینی بال ان قیدیوں کی قطاروں کے سامنے سے گزرتا چلا گیا پھر واپس آ کے ان کی صف کے درمیان کھڑا ہو گیا اور باآواز بلند اعلان کیا "تم میں جو بھی آزادی کا خواہاں ہو اپنی صف سے باہر آجائے!"

سبھی آزادی کے خواہاں تھے۔ ہینی بال مسکرایا کہنے لگا: "آزادی یوں ہی نہیں مل جایا کرتی اس کی حصولیابی کا ایک واحد طریقہ ہے اور وہ یہ کہ طاقت سے حاصل کی جائے۔ ہتھیاروں کی مدد اور شجاعت کے اظہار سے!"

ہینی بال کہنا کیا چاہتا ہے۔ سبھی یہ جاننے کے لیے بے چین تھے۔ ہینی بال نے قیدیوں کی صف سے دو آدمی نکال لیے، بولا۔

"کیا تم اس پر تیار ہو کہ دونوں اپنی مرضی اور پسند کے ہتھیاروں سے ایک دوسرے کا مقابلہ کرو۔ آزادی صرف اس کا حصہ ہو گی جو اپنے مقابل کو شکست دے کر قتل کر دے گا۔ آزادی اور ہتھیار اسی فاتح کا حق ہوں گے!"

دونوں قیدی بخوشی مقابلے پر آمادہ ہو گئے۔ انہیں قید و بند سے آزاد کیا گیا اور انہیں ان کی پسند کے ہتھیار دے دیے گئے۔ پھر ہینی بال کے ایک اشارے پر دونوں آزادی کی خوفناک جنگ لڑنے لگے۔ ان دونوں کو یہ احساس بھی تھا کہ اپنوں اور غیروں کی نظریں ان پر جمی ہوئی ہیں، دونوں نے بے مثال شجاعت اور بے جگری سے مقابلہ کیا اور ایک طویل مقابلے کے بعد ایک قیدی ہلک زخم کھا کے گر گیا اور دوسرا فاتح خوشی سے دیوانہ سا ہو گیا ہینی بال کی سپاہ اور قیدیوں نے مرنے

والے بھی ایک خاص ادا دیکھی وہ اس شاندار مقابلے میں شرمندگی سے بچنے کے لئے تمکنت اور خودداری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

ہینی بال نے اپنی سپاہ کو مخاطب کیا۔ "اس دلچسپ تمثیل میں تمہاری قسمتوں کا فیصلہ موجود ہے، اہل روما کے مقابلے میں فتح کی شادمانی اور انعام و اکرام کا خود کو مستحق ثابت کر دیا پھر اس کی طرح بہادرانہ موت مر جاؤ، تیسرا کوئی راستہ نہیں!"

* * *

ہینی بال کے شمالی روما میں مقابلے شروع ہو گئے۔ ہینی بال کی سپاہ نے اس کی تمثیل کو گرہ میں باندھ لیا تھا۔ انہوں نے ہر محاذ اور ہر معرکے میں بے مثل شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ اہل روما پر ہینی بال ہوا بن کر نازل ہوا تھا۔ ہینی بال کا اندازِ فکر بالکل درست نکلا۔ سردیوں میں ایلپس کے دشوار گزار سلسلوں کو عبور کر کے روما پر حملہ آور ہونا ایک بڑا اور ناقابلِ فہم کارنامہ تھا، اہل روما کے ہوش اڑ گئے۔ ہینی بال نے اپنی فوج کی کمی کو یوں پورا کیا کہ مفتوحہ علاقوں کے نوجوانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کر لیا۔ ہینی بال شمال سے جنوب کی طرف بڑھا اور بحیرۂ اڈریاٹک کے ساحلی شہر کنائے تک پہنچ گیا اور یہی وہ شہر تھا جس کا اہل روما نے بھرپور دفاع کیا تھا۔

شروع شروع میں قلبی کا یہ خیال تھا کہ روما کے لوگ ہینی بال کو شکست دے دیں گے لیکن نتائج برعکس نکل رہے تھے، وہ خود جنگ و جدل کا خوگر نہ تھا۔ اس نے میدانِ جنگ کی ہولناکیاں جو دیکھیں تو دل دہل گیا، یہ ایلپس کی دشوار گزار راہوں سے زیادہ پرخطر راہ تھی، اس کی وطنی عصبیت یہاں بھی جاگ اٹھی۔ اس کے لئے یہ منظر انتہائی اذیت ناک ہوتا تھا کہ قرطاجنہ کے لوگ رومیوں کو اپنے ہتھیاروں سے ہلاک کر کے گھوڑوں سے روند ڈالیں، اسے ان نوجوانوں پر بھی غصہ آ رہا تھا جو دولت کی طمع میں ہینی بال کی فوج میں شامل ہو گئے تھے اور خود اپنے ہی ہم وطنوں کو ہلاک کر رہے تھے۔

کنائے میں ہینی بال رک گیا کیونکہ یہاں رومیوں نے ان غیر ملکیوں کو خاک و خون میں ملا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

بحیرۂ اڈریاٹک سے تین میل دور ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر ہینی بال نے اپنی سپاہ کا جائزہ لیا۔ افریقہ کے بے لگام سوار لومڑی مہربال کی قیادت میں تھے اور انہوں نے اپنے ہاتھوں میں سانگے پکڑ رکھے تھے۔

ہینی بال کے سامنے اس کی فوج کے مقابل میلوں میں پھیلے ہوئے رومی تھے، جو اپنے بہترین ساز و سامان، تعداد اور باضابطگی اور ترتیب سے ہینی بال کی سپاہ کو متاثر کر رہے تھے، ہینی

بال اپنی سپاہ کی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ان کا دل بڑھانے کے لئے ہنسی مذاق شروع کر دیا۔ اس نے اس جنگ میں جو تدبیر اختیار کی تھی اس کی کامیابی پر وہ کامل یقین رکھتا تھا۔ اس نے اپنے حملے سے رومی سپاہ کا جائزہ لیا اور اپنے لشکر کی ترتیب اس طرح قائم کی کہ اس کا قلب بالکل کمزور رہ گیا۔

اعلانِ جنگ ہوا اور دونوں فوجیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں نومدیوں کی سانگیں سورج کی روشنی میں چمکیں اور رومی سپاہ کے سینوں میں پیوست ہونے لگیں۔ رومی نہایت آسانی سے ہینی بال کے کمزور قلب میں داخل ہو گئے۔ ہینی بال کا قلب خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹتا چلا گیا، ہینی بال نہایت اطمینان سے یہ تماشا دیکھتا رہا۔ اس کے دائیں بائیں بازوؤں نے اردو کے ہندسے آٹھ (۸) کی شکل میں ایک طرف سے سکڑنا اور دوسری طرف سے پھیلنا شروع کر دیا۔ ہینی بال کا کمزور قلب (۸) کے نقطۂ اتصال سے نکل کر رومی افواج کی پشت پر آ گیا اور اس کی واپسی کا راستہ بند کر دیا۔ ہینی بال نے سوچی سمجھی تدبیر کے مطابق اپنے دائیں بائیں بازوؤں کو اشاروں میں حکم دیا کہ درمیان میں گھر جانے والے رومیوں کو زنبور کی طرح اپنے قابو میں لے کر پیس دیں۔ اس پر حرف بہ حرف عمل ہوا اور آناً فاناً تقریباً ستر ہزار رومی موت کے گھاٹ اتر گئے جبکہ اس جنگ میں اسی ہزار رومیوں نے حصہ لیا تھا۔ ہینی بال کا یہ ایک عجیب فوجی پھندا تھا اور کسی تباہی خیز جنگ کی اس سے بہتر مثال ملنا مشکل ہے۔ جو رومی زندہ بچ گئے تھے وہ ادھر ادھر پناہ کی تلاش میں چھپتے پھر رہے تھے اور ہینی بال کی سپاہ انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل یا گرفتار کرتی پھر رہی تھی، ہینی بال نے اپنے گھوڑے پر پامال میدان جنگ میں گشت لگایا اور اپنے فوجیوں کے نعرہ ہائے تحسین کا مسکراہٹوں اور ہاتھ کے اشاروں میں جواب دیتا ہوا اپنے خیمے میں داخل ہوا۔

فاتح سپاہیوں کی ہینی بال کی طرف سے ایک شاندار دعوت کی گئی۔ قلبی کا دل رومیوں کی شکست پر خون کے آنسو رو رہا تھا۔ جب ہینی بال کے حکم سے رومی جنرل کی لاش میدان جنگ سے ڈھونڈ کر لائی گئی تو قلبی نے اس کے سرہانے کھڑے ہو کر آنسو بہائے اس جنگ میں وہ برائے نام شریک ہوا تھا۔ ہینی بال نے مقتول رومی جنرل کی لاش پر کھڑے ہو کر کہا۔ "میں نے بچپن میں مل کرت کے روبرو اپنے باپ ہمل کر برقہ کی ہدایت پر یہ قسم کھائی تھی کہ میں رومیوں کا دوست نہیں بنوں گا آج کنانے کے معرکے میں، میں نے اپنا عہد پورا کر دیا ہے۔" پھر قلبی سے کہا۔ "اس رومی جنرل کے سرہانے کھڑا تو کیا کر رہا تھا؟"

قلبی نے جواب دیا۔ "روما کی عظمت پر بین کر رہا تھا۔ اگر میرا یہ عمل تمہاری نظر میں مجرمانہ ہے تو میں ہر اس سزا کے لئے تیار ہوں جو تمہاری طرف سے دی جائے گی!"

ہینی بال نے پُر وقار لہجے میں کہا۔ "تجھے رومیوں سے محبت ہے ؟ حالانکہ تو نے قرطاجنہ کا نمک کھایا ہے اور تجھے ہم سب کا شکر گزار اور احسان مند ہونا چاہیئے !"

فلبی نے اپنی داستان حیات مختصر سنا کے جواب دیا۔ "میں ایک سچا انسان ہوں اور اپنے دلی جذبات چھپانے پر قدرت نہیں رکھتا۔ ہینی بال ! تم اپنے دیوتاؤں کی قسم کھا کے مجھے یہ بتاؤ کہ اگر میری جگہ تم ہوتے تو اہلِ قرطاجنہ سے کیا سلوک کرتے اور ان کی بابت تم کیا سوچتے ؟"

ہینی بال بات کو ٹال گیا۔ بولا۔ "اہلِ روما نے بھی ہم پر کچھ کم ظلم نہیں کیئے !"

فلبی نے کہا۔ "ہملکر برقہ کے بیٹے ! اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تم اس عہد کے بہت بڑے انسان ہو اور دیوتاؤں نے تمہیں بہت سے اوصاف سے نوازا ہے اس بڑائی کا یہ تقاضہ ہے کہ میرے معاملے میں انصاف سے کام لو اور سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ ہی کہو کیا تمہاری قوم نے مجھ پر ظلم نہیں کیے ؟ کیا میرے ساکے بڑوں نے میرے معاملے میں ناانصافی سے کام نہیں لیا ؟"

ہینی بال ہنس دیا۔ "میری فوج میں بہت سی قومیں جمع ہو گئی ہیں اور میں ان سب سے محبت کرتا ہوں لیکن میں اپنی قومی عصبیت کو اپنی ذات سے جدا نہیں کر سکتا اور میں اہلِ قرطاجنہ کو ان سب پر فوقیت دیتا ہوں، قرطاجنی ان سب پر فوقیت رکھتے ہیں، میں اس عہد کا بہت بڑا انسان، قرطاجنی ہوں !"

فلبی تھوڑی دیر خاموش رہا۔ ہینی بال نے طنزاً پوچھا۔ "کیا تو قرطاجنہ جانا چاہتا ہے ؟"

فلبی محاربات روما سے اکتایا ہوا تھا، بولا۔ "اگر میں ہاں کہوں تو کیا مجھے قرطاجنہ واپس بھیج دیا جائے گا ؟"

"بالکل !" ہینی بال نے جواب دیا۔ "کنائے کی فتح کی خوشخبری اور رومی امرا کی مہریں لے کر میرا چھوٹا بھائی ماگو کل قرطاجنہ روانہ ہو جائے گا اگر تو جانا چاہے تو میں تجھے بھی بھیج دوں گا !" پھر اس کی ہنسی اڑاتا ہوا بولا۔ "کیونکہ میں نے خوب اچھی طرح یہ سمجھ لیا ہے کہ تو ہنگھوڑے کا آدمی ہے جہاں پہلے تیری ماں تجھے پہلو میں لٹاتے لوریاں سنایا کرتی تھی اور اب جب کہ تو جوان ہو چکا ہے تو تجھے ماں کی جگہ ایک خوبرو عورت کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی ہے اور یہ عورت بھی تقریباً وہی فرض انجام دے گی۔ یعنی تیرے پہلو میں لیٹ کر عشق و محبت کی لوریاں دیا کرے گی !"

فلبی کو ہینی بال کے طنز پر غصہ بھی آیا اور شرمندگی بھی ہوئی، لیکن ہینی بال جو

چپ نہیں ہوا تھا۔ وہ اب بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ "میں قرطاجنہ کے بڑوں کو ایک خط لکھوں گا اور اس میں تیری سفارش کردوں گا کہ جس لڑکی سے تو محبت کرتا ہے وہ تیرے حوالے کردی جائے بیرسا کے بڑے لوگ کم از کم میری یہ حقیر سی درخواست رد نہیں کریں گے؟"

ہینی بال کی تلخ اور طنزیہ گفتگو اسے خاصا پریشان کرتی رہی' وہ اس مسئلے پر دیر تک سوچتا رہا اور عجیب و غریب منصوبے بناتا رہا!

دوسرے دن ایک بحری جہاز ہینی بال کے سب سے چھوٹے بھائی' ماگو کی نگرانی میں قرطاجنہ روانہ ہوگیا۔

☼ ☼ ☼

بیرسا کی مقدس چوٹی پر سرخ پردوں والے ایوان میں قرطاجنی مجلس کے ارکان سر جوڑ کے بیٹھے ماگو نے ہینی بال کی فتح مندیوں کی داستان سنائی اور ثبوت میں ارکانِ مجلس کے سامنے وہ ٹوکرا الٹ دیا جس میں رومی امراء کی چھ ہزار طلائی انگوٹھیاں رکھی تھیں' مجلس کے حاسد ارکان نے اس خوش خبری کو جوش و خروش سے نہیں سنا۔ انہوں نے ماگو سے کہا۔ "تمہارے بقول اگر ہینی بال نے اتنی ہی کامیابیاں حاصل کرلی ہیں تو وہاں اب کیا کر رہا ہے اور ہم سے کیا چاہتا ہے؟"

ماگو نے دل شکستہ لہجے میں کہا۔ "میرے بھائی کو چار ہزار نومدی سوار چالیس ہاتھی اور کئی من چاندی درکار ہے تاکہ وہ اپنا ادھورا کام تکمیل کو پہنچا سکے۔"

مجلس نے بے دلی سے یہ درخواست منظور کرلی۔

اس کے بعد ماگو نے مجلس کے سامنے ہینی بال کا وہ سفارشی خط پیش کرنا چاہا جس کا فلبی سے تعلق تھا۔ لیکن فلبی نے کچھ سوچ کر ماگو سے وہ خط لے لیا اور کہا۔ "ماگو! ابھی اس سفارش کا وقت نہیں ہے' قرطاجنی ایک بڑی جنگ میں الجھے ہوتے ہیں تم ہینی بال کی مطلوبہ امداد لے کر واپس جاؤ اور فی الحال مجھے میرے حال پر چھوڑ دو!"

فلبی کی واپسی کو زیفو کے ماں باپ نے خوش دلی سے نہیں قبول کیا لیکن زیفو بہت خوش تھی گو اس خوشی کا اس نے اظہار نہیں کیا۔ ان میں سے فلبی کے علاوہ کسی کو بھی اس سفارشی خط کا علم نہیں تھا جو ہینی بال نے بیرسا کی مجلس کے نام لکھا تھا۔

فلبی اس جگہ پہنچا جہاں پنارسی بوڑھے کی ہڈیاں دفن تھیں' وہ کچھ دیر اس ویران مدفن پر کھڑا دیا سا کچھ دیکھتا رہا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے بوڑھے کی روح اسے یاد دلا رہی ہے کہ "آباؤ اجداد کی زمین کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے' خبردار جو تونے ان فنیقیوں کی زمین کو اپنا وطن بنایا!" اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ پنارسی اس پر لعن طعن کر رہا ہے کہ "وہ ہینی بال کی فوج میں

شامل اہلِ روما کا خون بہانے میں ان کا معاون یا خاموش تماشائی رہ چکا ہے!"

قلبی برداشت نہ کر سکا اس نے بوڑھے کی ہڈیوں سے کہا۔" اے میرے ہم وطن پنارسی بزرگ! کچھ تم نے سنا قرطاجنہ کے ہمل کر برقہ کا بیٹا ہینی بال ایک بہت بڑا فاتح بن کر ابھر رہا ہے اس نے روما کو اتنا ذلیل کر دیا ہے کہ کسی اور عہد میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ لیکن اپنے اس بڑے آدمی کا قرطاجنہ کے بڑوں کی مجلس نے اس طرح احترام کیا ہے کہ وہ اس کے کارناموں کو حسد اور شک و شبہے سے سنتی ہے!"

پھر وہاں سے واپس ہوتے ہوئے اس نے بوڑھے کی ہڈیوں کو آخری بار سلام کیا اور کہا۔" میرے بزرگ! مجھے ہمت بخشو کہ میں اپنے فیصلے پر عمل کر سکوں اور زندگی بھر اس پر قائم رہوں!"

یہاں سے وہ زیفو کے پاس پہنچا، یہ دونوں ابھی تک ایک دوسرے سے دور دور اور کٹے کٹے سے رہے تھے۔ اس نے نہایت افسوس سے زیفو کو مخاطب کیا، بولا۔" زیفو! میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے وطن پنارس واپس چلا جاؤں!"

زیفو کی زبان سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔" کیا تم نے میرے باپ سے اس کی اجازت لے لی ہے؟"

"نہیں!" قلبی نے جواب دیا۔" کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ میرے اس ارادے میں مزاحم نہیں ہوں گے!"

زیفو جو کچھ کہہ رہی تھی اس میں اس کے سوا کوئی خواہش نہ تھی کہ وہ کسی بھی بہانے اسے روک لے وہ خود یہ درخواست نہیں کرنا چاہتی تھی، اس نے کہا۔" نہیں میرے باپ نے خریدا تھا تم میرے باپ کی ملکیت ہو اس لیے اپنے جانے نہ جانے کے بارے میں تم خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے اس میں میرے باپ کی اجازت ضروری ہے!"

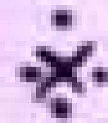
قلبی، زیفو سے اس قسم کی گفتگو کی امید نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی رہی سہی امید بھی ٹوٹ گئی، سوگواری سے جواب دیا۔" تمہارے والد میرے اس فیصلے میں اس لیے مزاحم نہیں ہوں گے کہ وہ خود بھی یہی چاہتے ہیں لیکن اگر تم بھی یہی چاہتی ہو تو میں تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دوں گا!"

اس کے بعد قلبی نے زیفو کے باپ کے سامنے اپنا مدعا رکھا اس نے نہایت خوشی سے اسے وطن چلے جانے کی اجازت دے دی۔

قلبی زیفو سے سرسری ملاقات کر کے قرطاجنہ کی بندرگاہ میں داخل ہوا، اس وقت اس کے تصور میں پنارس کی زمین تھی، جہاں اس کے بزرگوں کا قبرستان تھا۔ عزیز رشتے دار تھے اور جہاں کے آب و گل سے اس نے جنم لیا تھا۔

وہ ایک تجارتی جہاز میں بیٹھ کر یونان روانہ ہو گیا اور ہینی بال کا سفارشی خط اس نے ایک واقف کے ذریعے زیغو کے پاس یہ کہہ کر بھیج دیا کہ "ہینی بال کا یہ سفارشی خط شکریے کے ساتھ اسے واپس کر دیا جائے اور اسے بتا دیا جائے کہ فلبی بیگھوڑے کا آدمی نہیں ہے اور یہی بات ثابت کرنے کے لئے اس نے زیغو کی سریع الحصول آغوش کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے!"

زیغو نے ہینی بال کا خط پڑھا اور فلبی کے زبانی پیغام کو جب خط کی عبارت سے ملا کر مسئلے کو سمجھنے کی کوشش کی تو یہ سب کچھ عقدۂ لاینحل بن کر رہ گیا۔ ہاں بس ایک بات البتہ اسے کسی حد تک سکون پہنچاتی رہی کہ اس نے محبت کا اعتبار نہ کرنے والے متعصب فلبی کے سامنے خود کو کبھی سستا نہیں ثابت کیا اور یہ کہ اس نے ہمیشہ اپنے بزدل کے فیصلے کو بے چون و چرا تسلیم کیا ہے۔


واجدہ تبسم


نتھ
اُترائی



بالاخانے کی دلہن





اس نے گھوڑے کو پیپل کے نیچے چھوڑا اور لگام قریب ہی لگے ہوئے امرود کے درخت کی ایک شاخ سے پھنسا دی۔ ابھی سورج غروب نہ ہوا تھا۔ ہلکی زردی مائل دم توڑتی شعاعیں عالیشان مکان کی سرخ کھپریلوں پر پڑ رہی تھیں۔ اندر سے مختلف سازوں کی آوازیں آ رہی تھیں اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ مکان کے آس پاس ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ تھے۔ رنگ برنگے کھلے ہوئے پھولوں کے درمیان سے گزرتا ہوا جب وہ دروازے پر پہنچا تو ایک دبلے پتلے نوجوان نے اس کا راستہ روک لیا، بولا۔ "یادر خان واپس جاؤ، آج کلیانی نہیں ملیں گی۔"

یادر خان کے اداس چہرے میں غصّے کی آمیزش ہو گئی۔ "کیوں، کیا بات ہے؟ میں کلیانی سے ملے بغیر واپس نہ جاؤں گا۔"

ابھی ان دونوں میں ردّ و کد جاری تھی کہ اندر سے ایک نہایت حسین عورت نمودار ہوئی۔ اٹھارہ انیس کا سن گلے میں پڑے ہوئے قیمتی موتیوں کے ہار کو پیٹ تک جانے سے سینے کی بلندیوں نے روک لیا تھا۔ آنکھیں بادام کی طرح جن میں خمار بھرا ہوا تھا۔ اوپر کا ہونٹ پتلا نیچے کا موٹا، لمبی لمبی انگلیاں، رنگ اتنا صاف کہ رگوں میں دوڑتا ہوا خون صاف دکھائی دیتا تھا۔ یادر خان نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "کلیانی! تمہاری محفل کا یہ آج کیسا نیا دستور ہے کہ یہ نہائی میرا راستہ روک رہا ہے۔"

کلیانی کی نظریں یادر خان کی بغل پر گئیں جہاں ایک قیمتی شال دبا ہوا تھا۔ وہ مسکرا

رہی تھی۔ نہالی کو ہاتھ سے ہٹا کر ایک طرف کر دیا اور کچھ آگے بڑھ کر یاور خان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ بولی۔ "میں تو تمہارے فراق میں المیہ گیت گا رہی تھی اور یہ نہالی تمہارا راستہ روکے کھڑا ہے، آؤ، اندر میرے ساتھ آؤ۔"

نہالی ایک طرف ہو گیا۔ شرمندہ ہو کر کہنے لگا۔ "راستہ میں نے اپنی مرضی سے تھوڑی روکا تھا۔ جمنا کاکی نے مجھے اس کا حکم دیا تھا۔"

جب کلیانی یاور خان کو لے کر اندر بڑھی تو اسے پتہ چلا کہ اس کے پاؤں میں گھنگرو بندھے ہوئے ہیں۔

اندر کا سماں ہی کچھ اور تھا۔ سفید چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں اور ان پر جگہ جگہ گاؤ تکیے رکھے ہوتے تھے۔ چھت سے لٹکے ہوئے جھاڑ فانوس ابھی سے روشن کر دیے گئے تھے۔ کمرے کے آخری سرے پر سرخ ریشمی غلاف چڑھا ہوا تکیہ کسی معزز مہمان کی آمد کا منتظر معلوم ہوتا تھا۔ اس سے پانچ سات قدم دور سازندے اپنے اپنے ساز سنبھالے بیٹھے تھے۔

یاور خان کا خیال تھا کہ کلیانی اسے اسی مخصوص گاؤ تکیے کے سہارے بٹھا دے گی لیکن وہ اسے ایک عام سے گاؤ تکیے کے پاس لے کر بیٹھ گئی۔ یاور خان با دلِ ناخواستہ بیٹھ گیا، ہوشیار کلیانی نے اس کے چہرے ہی سے احساسات کا اندازہ لگا لیا۔ کہنے لگی۔ "وہ نشست گاہ بھی تمہارے ہی لیے ہے لیکن اس وقت تم یہیں بیٹھو۔"

اس کے بعد اس نے یاور خان کی بغل سے شال کھینچ لیا اور سامنے پھیلا کر، بے چینی سے بنائی کے نقش و نگار دیکھنے لگی۔ ہلکی کتھئی رنگ کی شال کی بنائی میں بنے ہوئے سرخ اور نیلے پھول بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ کلیانی خوشی سے پاگل ہو گئی۔ بولی۔

"بہت خوب! مجھے بہت پسند آیا تمہارا یہ تحفہ۔"

تحفے کی پسندیدگی اور شرفِ قبولیت بخشنے سے یاور خاں کو بڑی خوشی ہوئی ——

"کلیانی!" یاور خان کہنے لگا۔ "تھوڑی دیر پہلے تک میں بہت ڈر رہا تھا کہ معلوم نہیں، تمہیں یہ شال پسند بھی آئے گی یا نہیں، اب جو تم نے پسند کر لی ہے تو میں بے حد خوش ہوں۔"

ابھی کلیانی کوئی جواب بھی نہ دے سکی تھی کہ ایک دروازے سے ایک ادھیڑ عمر عورت اندر آ گئی۔ یاور خان کی طرف ناگواری سے دیکھا، لیکن جب نظر شال پر پڑی تو ناگواری میں کچھ کمی آ گئی۔ کلیانی سے کہنے لگی۔ "کلیانی جب تجھے یہ معلوم ہے کہ اس وقت توقیر خان بھی تشریف لانے والے ہیں تو تو نے ان صاحبزادے کو کیوں روکے رکھا ہے؟"

توقیر خان کا نام سنتے ہی یاور خان کا چہرہ فق ہو گیا۔ یہ اس کے چچا تھے اور جائداد اور جاگیر کا سارا انتظام انہی کے ہاتھ میں تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ بھی یہاں آنے لگے ہیں۔

کلیانی نے جواب دیا۔ "کاکی! یہ سخت بداخلاقی کی بات ہے کہ میں انہیں دروازے پر ہی سے واپس کر دیتی!"

کاکی نے بے رخی سے جواب دیا۔ "لیکن یہ بات بھی تو بداخلاقی میں داخل ہے کہ اس جگہ چچا بھتیجے کا آمنا سامنا ہو جاتے، آخر ہمیں بھی تو اپنے پیشے کے آداب اور اخلاق کا خیال رکھنا چاہیئے" کاکی یہ کہہ کر واپس چلی گئیں۔

کلیانی کھڑی ہو گئی اور یاور خان کو افسوس سے مخاطب کیا۔ "یاور! مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میں تمہیں زیادہ دیر تک نہ بٹھا سکوں گی!"

یاور خان بھی مجبور ہو گیا' کلیانی اسے دروازے تک چھوڑنے گئی یاور خان نے جانے سے پہلے حسرت سے کلیانی کو دیکھا تو اس نے ادا سے نظریں جھکالیں، کہنے لگی۔ "میں تمہیں چاہتی ہوں' صرف تمہیں، لیکن تمہارا چچا توقیر خان بھی مجھے چاہنے لگا ہے، ہمارا پیشہ ایسا ہے کہ انہیں دھتکار بھی نہیں سکتی، اب تمہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟"

یاور خان نے پیچھے مڑ کر دور تک دیکھا کہ کہیں چچا توقیر خان آ تو نہیں رہے، پھر کہنے لگا۔ "کلیانی! تم تو جانتی ہی ہو کہ مجھے لڑکیوں سے نفرت ہے گھر میں جب سے لڑکی پیدا ہوئی ہے دل نہیں لگتا۔ تم سے مل کر یہ سوچا تھا کہ یہاں کچھ دیر غم غلط کر لیا کروں گا لیکن اب شاید یہ بھی ممکن نہ رہے!"

کلیانی نے گھبرا کر کہا۔ "اب تم جاؤ۔ پھر بات کروں گی اس موضوع پر!"

یاور خان نے اس پر ایک الوداعی نظر ڈالی اور واپس ہوا لیکن اسی وقت شام کے دھندلکے میں اس نے دیکھا کہ کئی گھوڑے پیپل کے درخت کے نیچے آ کر کھڑے ہو گئے' یاور خان نے خوفزدہ ہو کر اِدھر اُدھر چھپنے کی جگہ تلاش کرنا چاہی' دروازہ بند ہو چکا تھا' وہ مہندی کے جھنڈ کی طرف بڑھا اور اس میں روپوش ہو گیا۔ اس نے ان آنے والوں کو درختوں کی جھریوں سے دیکھا' چچا توقیر خان اپنی نوکیلی مونچھیں ہلال کی طرح اوپر اٹھائے اور یک مشتی گھنی داڑھی میں حنا لگاتے دروازے کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا چار مصاحب پیچھے پیچھے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں قیمتی کپڑوں کے تحائف تھے۔ دستک سے پہلے ہی دروازہ کھل گیا اور کلیانی کا مسکراتا ہوا چہرہ ایک بار پھر نمودار ہو گیا' یہ مسکراہٹ بھی بالکل ویسی ہی تھی جیسی تھوڑی دیر پہلے یاور خان کے لئے تھی' اسے افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا وہ عورتوں سے یوں بھی نفور تھا اور انہیں قابلِ اعتبار بالکل نہ سمجھتا تھا۔ اب یہ اعتبار بالکل ہی اٹھ گیا۔ اس نے بوجھل قدموں سے چل کر گھوڑے کی لگام پکڑی' فوراً ہی یہ احساس ہوا کہ چچا توقیر خان نے یقیناً اس کے گھوڑے کو پہچان لیا ہو گا اور شاید وہ اسے اِدھر اُدھر تلاش بھی کریں۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اچک کر گھوڑے پر سوار

ہو گیا اور دریائے چنبل کے کنارے کنارے دور تک بھگاتا چلا گیا۔ بے مقصد یوں ہی اور جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ وہ اتنی دیر تک گھومنا پھرنا چاہتا تھا، جتنی دیر تک اس کے خیال میں چچا توقیر خان کلیانی کی محفل میں وقت گزارتے لیکن پھر کچھ سوچ کر گھر چل دیا۔

سخت اندھیرا، ہو کا عالم، تاروں کی مدھم روشنی میں آبادی کے مکانات طلسماتی سایوں کی طرح نظر آرہے تھے، جب اس نے اپنا گھوڑا اصطبل میں سائیس کے سپرد کیا تو اسے یہ تشویشناک پیغام ملا کہ "اندر چچا توقیر خان اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں!"

وہ اس انتظار اور بے چینی کی وجہ سے واقف تھا، خوف سے اس کا دل دھڑکنے لگا اس خوف میں چچا کا ادب، احترام اور ان کی بزرگی کی دہشت شامل تھی، توقیر خان اس کا محض چچا ہی نہیں تھا خسر بھی تھا۔

بیوی نے بیزاری سے شوہر کو دیکھا اور بھوکی شیرنی کی طرح دہاڑی۔ "بابا جان کہتے ہیں کہ تم مجھے طلاق دے دو!"

یاور خان نے اطمینان سے پوچھا۔ "وجہ؟"

اسی لمحے توقیر خان بھی اندر داخل ہوا اور شال یاور خان کے منہ پر مارتا ہوا بولا۔ "تمہیں شرم نہ آئی اس قیمتی اور یادگار شال کو اس کنچنی کو تحفے میں پیش کرتے ہوئے! یہ ہمارے خاندان میں شہنشاہ ہند سکندر لودھی کے عطیے کی حیثیت سے یادگار چلا آرہا تھا لیکن تم نے اسے اس دو ٹکے کی کنچنی کے حوالے کر دیا!"

یاور خان کوئی جواب نہ دے سکا۔ توقیر خان دیر تک لعنت ملامت کرتا رہا اور دو چار فقروں کے بعد طلاق کا مطالبہ کرتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ یاور خان جیسے اوباش اور عیاش سے اس کی لڑکی کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ جب وہ بک جھک کر چلا گیا تو یاور خان نے بیوی سے پوچھا "کیا تم بھی طلاق چاہتی ہو؟"

"ہاں!" بیوی نے بے تامل جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ تم طوائفوں کے پاس جاتے ہو، تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے!"

یاور خان نے جواب دیا۔ "لیکن جہاں میں جاتا ہوں، وہیں تمہارے بابا جان بھی تشریف لے جاتے ہیں، اور تمہاری طرح تمہاری اماں کو بھی ان سے طلاق حاصل کر لینی چاہیئے!"

بیوی نے غیر جذباتی آواز میں کہا "ان کی دوسری بات ہے!"

"کیوں، ان کی دوسری بات کیوں ہے؟"

"اس لئے کہ اماں بوڑھی ہو چکی ہیں!"

"واہ!" یادر خان ہنسا۔ "خوب یہ خوب رہی۔ تمہارے باداجان بھی تو بوڑھے ہو چکے ہیں انہیں تو اور زیادہ نیکوکار ہونا چاہیئے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی!" بیوی نے حتمی انداز اختیار کیا۔ "میں طلاق چاہتی ہوں!"

"میں خوب جانتا ہوں کہ تم لوگ طلاق پر کیوں بضد ہو!"

بیوی نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تم کیا جانتے ہو؟"

یادر خان نے ٹھیرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "تمہارا مہر دو لاکھ اشرفی قرار پایا تھا اور میری جاگیر کی مالیت بھی اتنی ہی ہو گی گویا تم لوگ اس طرح میری جاگیر کو ہتھیانا چاہتے ہو!"

یہ کہہ کر وہ پنگوڑے میں سوئی ہوئی بچی کے پاس چلا گیا۔ فرشتوں جیسی معصومیت لئے وہ سو رہی تھی، کچھ دیر کھڑا وہ اسے دیکھتا رہا، بچی سوتے ہی میں کسی لمحے منہ بسورنے لگتی اور کسی لمحے مسکرا دیتی، پھر کراہت سے اس نے منہ پھیر لیا اور بیوی کے قریب پہنچ کر بولا۔ "اگر تم لڑکی کی جگہ لڑکا پیدا کرتیں تو شاید میں اوباش نہ ہو جاتا۔ اس میں بھی قصور تمہارا ہی ہے!"

بیوی نے غصے سے جواب دیا۔ "بیکار کی باتیں ہیں، کوئی عورت بھی اس پر قادر نہیں ہوتی کہ اپنی مرضی سے لڑکی یا لڑکا پیدا کر سکے۔"

یادر خان کے چہرے پر نفرت اور بے زاری کی شکنیں پڑ گئیں، وہ چیخا۔ "مجھے لڑکیوں سے نفرت ہے، نفرت ہے، میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا!"

بیوی نے خوفزدہ ہو کر بچی کو گود میں اٹھا لیا اور بھاگ کر باپ کی طرف چلی گئی۔

اس کے بعد بیوی اور بچی کو اس سے چھپا دیا گیا۔ توقیر خان کو اس کا بالکل یقین تھا کہ جنونی یادر خان کسی وقت بھی جوش نفرت سے بچی کو ہلاک کر دے گا۔ یادر خان پہلے ہی اذیت کا شکار تھا اب اور زیادہ اداس رہنے لگا۔ چچا کی طرف سے روز بروز دباؤ بڑھنے لگا کہ ان کی لڑکی کو طلاق دے کر آزادی دی جائے، ابھی جوان ہے، اس کا دوسرا گھر بسایا جا سکتا ہے، لیکن یادر خان اس پر بالکل تیار نہ تھا کیونکہ اس کی عاقبت اندیشی اسے بتا رہی تھی کہ جس دن بھی اس نے بیوی کو طلاق دی، اسے اپنی جاگیر سے ہاتھ دھونا پڑ جائے گا۔ وہ گم سم رہ کر وقت گزارنے لگا۔

وہ کئی روز تک دن میں برابر کلیانی سے ملنے جاتا رہا لیکن اس سے ملاقات نہ ہو سکی، جمنا کاکی اسے نہایت خوش اخلاقی سے خوش آمدید کہتیں جب بھی وہ جمنا کاکی سے کلیانی کی بابت پوچھتا یہی جواب ملتا کہ وہ کچھ دنوں کے لئے فتح پور گئی ہوئی ہے۔ جمنا کاکی اس سے دل جوئی کی باتیں کرتیں، بیوی سے محرومی اور کلیانی کی دوری نے جمنا کاکی میں حسن بھرنا شروع کر دیا —— ادھر جمنا کاکی بھی ایک سوچے سمجھے منصوبے پر عمل پیرا تھیں، ان کی عمر کوئی پینتیس چھتیس سال رہی ہوگی، کسے ہوئے جسم میں اب بھی بلا کی کشش تھی، جب تک کلیانی سامنے رہتی، جمنا کاکی کا حسن ماند پڑ جاتا لیکن اس کے ہٹتے ہی ان میں بلا کی دلکشی اور جاذبیت محسوس ہونے لگتی، آخر کلیانی کی عدم موجودگی میں وہ جمنا کاکی کی طرف مائل ہو گیا۔ جمنا کاکی اسے اپنی سریلی آواز میں گیت سناتی رہتی جو کچھ اس کے پاس تھا، آہستہ آہستہ جمنا کاکی کو منتقل ہوتا رہا۔ اس کا دل بھی جمنا کاکی کی طرف شدت سے راغب ہوتا رہا یہاں تک کہ وہ جمنا کاکی کے لئے دل میں کسک سی محسوس کرنے لگا۔ کسی کسی وقت کلیانی یاد آتی تو دکھ ہوتا لیکن یہ خیال زیادہ دیر تک نہ قائم رہتا۔

اس صورتِ حال کو کئی ماہ گزر گئے، وہ نہ بیوی کی شکل دیکھ سکا نہ کلیانی کی، اسے عورت درکار تھی، وہ جمنا کاکی کی صورت میں حاصل تھی لیکن پھر اس سے بھی دل اکتا گیا اب اسے کسی اور کی تلاش رہنے لگی، اس تبدیلی کو جمنا کاکی نے بھی محسوس کر لیا۔

اب وہاں کا جانا بھی کم ہو گیا اور دینے لینے میں بھی کمی ہو گئی، جاگیر سے اس کے حصے کی سالانہ رقم جو ملی تھی وہ تقریباً ختم ہو چکی تھی، اس نے جاگیر کے ناظم سے مزید رقم کا مطالبہ کیا تو معلوم ہوا چچا نے اسے منع کر رکھا ہے، اسے غصہ تو بہت آیا لیکن کچھ کر نہ سکتا تھا، عورت کی خواہش نے اسے ایک بار پھر جمنا کاکی کے حضور میں پہنچا دیا لیکن دل میں شرمندہ تھا۔ پاس رقم نہ تھی، اور کئی دن کی غیر حاضری کے بعد وہ جمنا کے پاس پہنچا تھا، اسے خوب معلوم تھا کہ اس کوچے میں رقم کے بغیر جانے کا کیا مطلب ہوتا ہے، جمنا کاکی نے اس کا جوش و خروش سے استقبال کیا اور پاس بیٹھ کر جدائی کے گلے شکوے کرنے لگی۔ جمنا کاکی نے جس قسم کا بناؤ سنگھار کر رکھا تھا۔ اس سے شبابِ خفتہ گویا بیدار ہو گیا تھا۔ دل سے اتری ہوئی جمنا کاکی پھر اچھی لگنے لگی۔ جب جمنا نے اس سے نہ آنے کی وجہ معلوم کی تو اس نے جواب دیا۔ "جمنا! تم سے میں کوئی بات نہیں چھپانا چاہتا، قصہ دراصل یہ ہے کہ میرے حصے کی جاگیر کا انتظام بھی میرے چچا توقیر خان ہی کے ہاتھ میں ہے، آج کل ان سے ذرا کشیدگی چلی آ رہی ہے، مجھے جو سالانہ

رقم ملی تھی وہ تقریباً ختم ہو چکی ہے، مزید رقم مل نہیں سکتی۔ اس کے لئے کم از کم مجھے تین ماہ انتظار کرنا پڑے گا۔" پھر کچھ نادم ہو کر بولا۔" اور یہاں خالی ہاتھ آتے اچھا نہیں لگتا۔"

جمنا کاکی کچھ دیر سناٹے میں رہیں، یاور خان کی شکل دیکھتی رہیں، پھر اوپری دل سے بولیں۔ "تمہیں آنا جانا تو نہیں بند کرنا چاہیئے تھا۔ تم یقین کرو، مجھے تم سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے، جب نہیں آتے تو دل بجھا بجھا اور اداس اداس رہتا ہے۔"

یاور خان نے جمنا کو سینے سے لگا لیا اور فرطِ جوش میں اس کے بوسے لینے لگا۔ ابھی وہ کچھ زیادہ تجاوز نہ کر سکا تھا کہ ایک دروازے سے کلیانی نمودار ہوئی اور دونوں کو اس حال میں دیکھ کر ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ جمنا کی، اس کی طرف پشت تھی اور یاور خان کا چہرہ، اس کا سارا جوش خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ کلیانی کے چہرے کی حیرت غصے میں تبدیل ہونے لگی، اس کے ہونٹ کپکپائے وہ چیخ کر بولی۔ "کاکی!"

جمنا کاکی سہم کر الگ ہو گئیں اور پلٹ کر کلیانی کو دیکھا، کلیانی اسے خونخوار نظروں سے گھور رہی تھی۔

کاکی نے شرمندگی سے پوچھا۔ "اپنی ماسی کے پاس سے کب واپس آئیں؟"

کلیانی نے کوئی جواب نہ دیا اور یاور خان کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں لئے چلی گئی، جمنا کاکی معلوم نہیں کدھر گم ہو گئیں، کلیانی شرمندہ یاور خان کو گاؤ تکیے کے سہارے بٹھا کر خود بھی سامنے بیٹھ گئی اور پھر برس پڑی۔ "تمہیں کاکی سے تعلقات بڑھاتے شرم نہ آئی، وہ میری ماں ہیں، ماں اور بیٹی سے بیک وقت تعلقات رکھنا کس مذہب میں جائز ہے؟"

یاور خان گردن جھکائے کلیانی کی ڈانٹ پھٹکار سنتا رہا اور چپ رہا لیکن جب کلیانی حد سے بڑھی تو اسے بھی بولنا پڑا کہنے لگا۔ "کلیانی! میں تم سے محبت کرتا ہوں، جب میں تم سے مایوس ہو گیا اور چچا تو تیر تم سے ملنے جلنے لگے تو میں نے مجبوراً جمنا کاکی سے دل لگا لیا۔ جمنا کاکی میں تمہاری شبیہ جھلک پائی جاتی ہے۔"

کلیانی نے طنزیہ کہا۔ "تم جھوٹ بولتے ہو، مشابہت کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اگر ماں میں بیوی کی مشابہت آ جائے تو اس سے بھی بیوی ہی کی طرح تعلقات قائم کر لئے جائیں۔"

یاور خان نے کلیانی کو ڈانٹ دیا۔ "بس زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں، زبان

بند کر دو۔"

کلیانی نے بھی چیخ کر کہا۔ "تم آئندہ یہاں مت آنا، اگر آئے تو میں تمہیں دھکے دے کر نکلوا دوں گی۔"

یادر خان نے کہا۔ "یہاں آنے سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ جمنا کا کی سے ملنے سے تم مجھے نہیں روک سکتیں۔"

"پھر وہی بے شرمی کی بات!"

یادر خان نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "خوب، اس کوچے میں بھی شرم و حیا پائی جاتی ہے، یہ بات مجھے نہیں معلوم تھی۔"

کلیانی نے لاجواب ہو کر اسے گھور کر دیکھا۔

یادر نے مزید کہا۔ "کلیانی! اگر اب تک تمہیں معلوم نہیں تھا تو جان لو کہ تم جس کوچے سے تعلق رکھتی ہو، یہاں صرف ایک ہی رشتہ ہوتا ہے، تم اور تمہاری جمنا کا کی بکنے والی شے ہیں اور ہم لوگ خریدار ہیں، جب جس پر طبیعت آئے گی قیمت ادا کر کے خرید لیں گے۔"

کلیانی اپنی اہانت پر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔

یادر خان جانے کے لئے جیسے ہی کھڑا ہوا، کلیانی نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا۔ تحمل ہو کر بولی۔ "تم نے ہماری جس حیثیت کی بابت ابھی نشان دہی کی ہے، میں اس کے لئے شکر گزار ہوں۔" اس کے بعد وہ ملحقہ کمرے کی طرف گئی اور دوسری طرف جھانک کر دیکھا اور مطمئن ہونے کے بعد مغموم لہجے میں کہنے لگی۔ "یادر خان! معلوم نہیں کیوں میں تمہیں چاہنے لگی تھی، تمہیں نہیں معلوم کہ جب تمہارے چچا یہاں آتے تھے تو انہیں میں نے ہی یہاں سے کاٹنے کی یہ تدبیر کی تھی کہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے اپنی ماں کے پاس چلی گئی تھی، میرا خیال ہے جمنا کا کی نے بھی اس خطرے کو محسوس کر لیا تھا اور اسی لئے انہوں نے یہ چال چلی اور تم اس کے شکار ہو گئے۔"

یادر خان بھی چونک پڑا اور کلیانی کی باتیں کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگیں۔ بولا۔ "اب بھی کیا گیا ہے کلیانی! اگر تم وعدہ کرو کہ میرے چچا کو اسی طرح مسترد کرتی رہو گی تو میں بھی تم سے یہ وعدہ کرنے کو تیار ہوں کہ اب میں جمنا کا کی کو نظر بھر کے دیکھوں گا بھی نہیں۔"

کلیانی نے جواب دیا۔ "یہ ساری باتیں یوں کھڑے کھڑے نہیں ہو سکتیں، کل کسی وقت

آجاؤ، آخر میں بھی تو تم سے کچھ ٹھوس وعدے چاہوں گی۔"

یادر نے حیرت اور سوالیہ نظروں سے کلیانی کو دیکھا۔"کیسے وعدے؟"

کلیانی نے کہا۔"کل دوپہر کے بعد دو ساعتوں کے لئے کاکی تمہارے چچا کے ساتھ کہیں جائے گی، تم اسی وقت آجانا' بس تم سے کھل کر کچھ باتیں کروں گی۔"

یادر خان نے حیرت سے پوچھا۔"لیکن تم تو ابھی ابھی چلی آرہی ہو اپنی ماں کے پاس سے، تمہیں اپنی کاکی کے منصوبے کا کس طرح علم ہوگیا؟"

کلیانی نے جواب دیا۔"یہ بات نہالی نے مجھے آتے ہی بتادی تھی۔"

یادر خان کے لئے یہ انکشاف بھی نیا تھا کہ کاکی جمنا سے چچا توقیر کے تعلقات بھی ہیں۔ اسے جمنا سے بھی نفرت ہوگئی۔ جاتے جاتے آہستہ سے بولا۔"کل دوپہر کے بعد میں ضرور آؤں گا، تم میرا انتظار کرنا۔"

یادر خان رات کو دیر تک جاگتا رہا۔ چچا نے اس کی بیوی اور بچی کو کچھ اس طرح غائب کیا تھا جیسے کبھی ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ معلوم نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی لیکن جب آنکھ کھلی تو اس کے آس پاس کا منظر ہی کچھ عجیب اور ہولناک تھا' چچا توقیر نے اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کیا تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا' وہ گھبرا کر بیٹھ گیا' اس کے آس پاس چھ آدمی اور تھے اور ان سب کے ہاتھوں میں خنجر اور تلواریں چمک رہی تھیں، ان کے چہروں سے بے رحمی اور آنکھوں سے خوں خواری ٹپک رہی تھی۔ چچا نے ہاتھ کا کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔"یادر! اس پر دستخط کردو۔"

یادر لڑنے کے لئے آمادہ تھا' اس نے خوف زدہ ہوتے بغیر پوچھا۔"اس کاغذ میں کیا لکھا ہے؟"

"یہ بعد میں بتایا جائے گا!" چچا نے کہا۔"پہلے دستخط کردو۔"

یادر نے خشمگیں نظروں سے چچا کو دیکھا اور جواب دیا۔"اگر دستخط نہ کروں تو؟"

ایک وحشی آگے بڑھا اور خنجر کی نوک اس کے پہلو میں کچھ اندر اتار دی اور بولا۔"اگر دستخط نہ کیے تو یہ خنجر یہاں سے اندر داخل ہو جائے گا۔"

دوسرے وحشی بھی ذرا قریب پہنچ گئے۔

یادر نے کاغذ ہاتھ میں لے لیا اور اسے پڑھنا چاہا۔ یہ طلاق نامہ تھا جس میں یادر کی طرف سے یہ لکھا گیا تھا کہ وہ بخوشی اپنی بیوی کو طلاق دے رہا ہے اور حق مہر میں اپنی جاگیر اس کے نام منتقل کر رہا ہے۔ اس نے ایسا محسوس کیا جیسے اس کے نیچے سے زمین کھسکی جا

رہی ہے اور آسمان سر پر آ رہا ہے'، اس نے نہایت کرب سے کہا۔ "یہ تو طلاق جبری ہے، کیا فقہ اسے مان لے گی۔۔؟"

بچّا نے جواب دیا۔ "تم دستخط کر دو، اگر فقہ نہیں مانے گی تو تم اسے از روئے فقہ کالعدم قرار دے دینا۔"

یادر نے سوچا اگر اس نے دستخط نہ کیے تو یہ ظالم اس کے ساتھ کوئی مروّت نہ برتیں گے اور اسی وقت اس کی تکہ بوٹی کر دیں گے اور اگر دستخط کر دے گا تو فقہ اسلامی کی رو سے اس طلاق کو کالعدم قرار دے دینے کا حق اور اختیار تو اسے حاصل ہی رہے گا۔

اس نے بے بسی سے چچا کو دیکھا اور اشک بار آنکھوں اور لرزتے ہاتھ سے کاغذ پر دستخط کر دیے۔

چچا جب اپنے آدمیوں کے ساتھ واپس ہونے لگے تو انہوں نے یادر کو تسلی دی! بولے "یہ میں نے محض اس لئے کیا ہے کہ مجھے تمہاری طرف سے اس بات کا اطمینان نہ تھا کہ تمہارے ہوتے ہوتے میری بیٹی اور نواسی کی زندگی محفوظ ہے، اب تم آزادی سے رہو، تم سے کوئی مزاحم نہ ہوگا، میری بیٹی عدت کے دن گزار کر اپنے ماموں کے لڑکے احمد خان سے وابستہ ہو جائے گی۔"

یادر خان کیا بولتا' وہ تو یہ بازی ہار چکا تھا۔ جب چچا چلے گئے تو وہ اٹھا اور دروازہ کھولنے کی کوشش کی وہ باہر سے بند تھا' چچا اپنے آدمیوں کے ساتھ اب بھی باہر موجود تھے اور غالباً انہیں یہ معلوم تھا کہ ان کے ہٹتے ہی یادر باہر آنے کی کوشش کرے گا۔ جیسے ہی دروازہ ہلا' باہر سے چچا نے کہا۔ "یادر! میں نے دروازے باہر سے بند کر لئے ہیں' تم صبح تک یہیں آرام کرو، فجر کی نماز کے بعد تمہارے کہے بغیر ہی یہ دروازے کھل جائیں گے اور ہاں ایک بات بطورِ خاص ذہن نشین رکھو کہ اگر تم نے انتقام لینے کی کوشش کی تو اس کا نتیجہ بہت برا نکلے گا۔ میں نے اس کا بھی بندوبست کر لیا ہے!"

یادر قبل از وقت کچھ بھی نہ کہنا چاہتا تھا۔ چپ چاپ بستر پر گر گیا اور صبح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ پہلو کے زخم سے خون رِس رہا تھا اور اس میں شدید سوزش ہو رہی تھی۔

صبح کچھ کھائے پیے بغیر ہی وہ گھر سے نکل گیا۔ دوپہر سے پہلے پہلے اس نے کئی عالموں سے طلاق جبری کا مسئلہ پوچھا تو سبھوں نے متفقہ یہ فیصلہ دیا کہ طلاق ہو چکی۔ یادر بضد

تھا کہ اس طرح کیسے طلاق ہو سکتی ہے لیکن علما نے کہا کہ اگر تم طلاق نامے پر دستخط نہ کرتے تو طلاق نہ ہوتی، یاور نے کہا کہ اگر میں دستخط نہ کرتا تو قتل کر دیا جاتا۔ علما نے کہا۔ وہ تو درست ہے لیکن قتل کیے جانے کی صورت میں قاتلوں سے قصاص بھی تو لیا جا سکتا تھا۔

یاور نے کہا۔ "قصاص کون لیتا؟ جن کو قصاص لینے کا حق پہنچتا ہے، وہی تو قاتل ہوتے!"

علما نے کہا۔ "کچھ بھی ہو فقہ یہی کہتی ہے کہ طلاق ہو گئی۔"

اب یاور کے لئے دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ دوپہر کے ذرا دیر بعد وہ کلیانی کے پاس پہنچا۔ کلیانی کو ابھی تک کچھ بھی نہ معلوم تھا کہ اب یاور صاحبِ جاگیر نہیں رہا۔ جمنا کاکی چچا توقیر کے ساتھ کہیں سیر سپاٹے کو چلی گئی تھیں، گھر میں نہالی تھا اور کچھ سازندے تھے۔ پورے گھر پر سکوت اور سناٹا طاری تھا۔ کلیانی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

یاور مخصوص گاؤ تکیے سے کولہے ٹکا کر بیٹھ گیا۔ کلیانی اس کے سامنے جا بیٹھی۔ ابھی باتیں شروع بھی نہ ہوئی تھیں کہ نہالی بھی آ گیا اور یاور خان کے قریب جا بیٹھا۔ کلیانی نے اسے اٹھانا چاہا لیکن وہ نہ اٹھا۔ اسے اس خدمت پر کاکی نے مامور کیا تھا۔ دونوں کو بات کرنا مشکل ہو گیا۔

یاور خان تو جیسے اپنے حواس ہی میں نہ تھا، پوچھا۔ "ہاں اب بتاؤ تمہیں مجھ سے کیا باتیں کرنا ہیں!"

کلیانی نے اشاروں میں بات شروع کی۔ "تمہاری بیوی کا کیا بنا؟ اختلافات کچھ کم ہوتے یا ویسے ہی چل رہے ہیں ابھی؟"

یاور خان کو اس ذکر سے تکلیف پہنچ رہی تھی، کہنے لگا۔ "اس کے علاوہ باتیں کرو تو اچھا ہے!"

کلیانی نے نیا سوال کیا۔ "سنتی ہوں جتنی مالیت کی تمہارے حصے کی جاگیر ہے اتنا ہی تمہاری بیوی کا حقِ مہر ہے!"

"ہاں!" یاور نے بیزاری سے کہا۔ "لیکن میں کہتا ہوں کہ کیا آج اس موضوع کے علاوہ کسی موضوع پر گفتگو نہیں ہو سکتی؟"

کلیانی نے گویا نیا موضوع چھیڑا۔ "آج تم ضرورت سے زیادہ اکھڑے اکھڑے، رنجیدہ نظر آتے ہو، کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ کیوں؟"

"ہاں، بالکل پوچھ سکتی ہو!" یاور نے کہا۔ "بس یہ سمجھ لو کہ میں زندگی سے

عاجز ہوں!"

"کیوں، خیریت تو ہے؟"

یاور نے پوچھا۔ "کلیانی! تم ایک بات بتاؤ اور دیکھو جواب میں لاگ لپیٹ نہیں ہونی چاہیئے!"

"پوچھو!"

یاور نے کہا۔ "اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور اس کے حق مہر میں اپنی جاگیر اس کے نام کردی اور اس وقت میں بالکل قلاش ہوں تو تم میرے ساتھ کیسا سلوک کروگی؟"

کلیانی کو اس کی باتوں پر یقین نہ آیا۔ بولی۔ "میں نہیں سمجھتی کہ تم اتنی بعید از عقل باتیں بھی کرسکتے ہو۔"

یاور نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔ "تم میری باتوں پر یقین کرو یا نہ کرو لیکن یہ سب کچھ ہو چکا، اب میں بالکل مفلس و قلاش ہوں کیا ان حالات میں بھی تم میرا ساتھ دے سکتی ہو؟"

کلیانی کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آرہی تھیں۔ نہالی کی سمجھ میں بھی یہ باتیں نہیں آرہی تھیں۔ یاور نے محسوس کرلیا کہ نہالی ان دونوں کی مخبری کی خدمت پر تعینات ہے تو اسے غصہ آگیا، نہالی کو غصے سے مخاطب کیا۔ "تم یہاں فضول بیٹھے ہو، اب میں ایک مفلس تماشائی ہوں، مجھ سے بالکل نہ ڈرو اور ذرا سی دیر کے لیے یہاں سے ہٹ جاؤ۔"

کلیانی نے بھی اسے آنکھیں دکھائیں، نہالی باہر چلا گیا۔

یاور نے سب کچھ صاف صاف اسے بتادیا تو کلیانی نے افسردگی سے کہا۔ "ان حالات میں اگر میں تمہارے ساتھ چلنا بھی چاہوں تو تم مجھے کہاں لے چلوگے، تمہارے پاس نہ تو کھانے کو رقم ہوگی نہ سر چھپانے کو ٹھکانا، پہلے ان دونوں کا کوئی انتظام کرلو، اس کے بعد میرے پاس آؤ پھر میں کچھ سوچوں گی۔"

یاور خان کھسیا کر ہنسنے لگا۔ بولا۔ "میں تو تمہارے بلاوے پر اس وقت آگیا تھا ورنہ میں تم لوگوں کی فطرت سے واقف ہوں۔"

کلیانی چڑ گئی اور خفا ہو کر بولی۔ "اس وقت تم پریشان ہو اس لیے معقول باتیں بھی تمہاری سمجھ میں نہ آئیں گی۔"

یاور خان نے اٹھنا چاہا تو کلیانی نے کہا۔ "یاور خان! تم یقین کرو یا نہ کرو لیکن

میں یہ کہتی ہوں کہ مجھے تم سے محبّت ہے لیکن میرا خاندان ایسا ہے جس کی محبت کا یقین نہیں کیا جاتا اگر تم میرا امتحان کرنا چاہو تو جب کبھی تم سر چھپانے کی جگہ حاصل کر لو اور معاشی حالت سدھار لو تو میرے پاس آجانا، میں کسی بھی طرح یہاں سے نکل چلوں گی!"

یاور خان نے یقین نہ کرنے والے لہجے میں کہا "شکریہ۔ لیکن میں بھی تمہیں دھوکے میں رکھنا پسند نہیں کرتا۔ میرے دل میں تمہارے لئے انسیت ضرور ہے لیکن شاید اسے محبت نہیں کہا جا سکتا، تم مجھے اچھی لگتی ہو لیکن اب ایسا بھی نہیں ہے کہ اس دنیا میں تنہا تمہی کو اتنا حسن ملا ہے، اور بھی حسین شکلیں ملیں گی، اور جب مجھے رہنے کا ٹھکانہ اور ذریعۂ معاش میسّر آجائے گا تو کیا ضروری ہے کہ میں تمہی سے ملنے کی فکر کروں۔ رقم پاس ہو تو حسینوں کی کیا کمی۔"

کلیانی کے دل کو ان کھری کھری باتوں سے سخت چوٹ لگی۔ بولی۔ "تم صرف عورت اور شباب کی ہوس رکھتے ہو، تم محبّت کے پاکیزہ جذبے سے بالکل واقف نہیں" پھر کچھ رک کر کہا۔ "اسی لئے تو تم کو مجھ میں اور جمنا کاکی میں کوئی فرق نہیں محسوس ہوتا۔"

وہ آبدیدہ ہو گئی اور اس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔

یاور خان نے کئی بار اٹھنا چاہا لیکن کلیانی نے اس ملاقات کو آخری سمجھ کر اٹھنے نہ دیا، یہاں تک کہ جمنا کاکی بھی گھوم پھر کر آگئیں۔ یاور خان سے جیسے ہی نظریں ملیں، کاکی نے ہنس کر پوچھا۔ "یاور کیسے ہو؟ خیریت سے تو ہو؟"

یاور نے پھیکے لہجے میں جواب دیا۔ "خیریت کہاں؟ اس دنیا میں خیریت کہاں ہے۔ پھول اپنا سینہ چاک کر لیتے ہیں اور ہوا مضطربانہ خاک اڑاتی پھرتی ہے!"

جمنا کاکی نے کلیانی کو ہٹ جانے کا اشارہ کیا وہ چپ چاپ چلی گئی تو انہوں نے ایک قیامت خیز انگڑائی لی۔ یاور کو ایسا محسوس ہوا جیسے چولی مسک گئی ہو۔ اس کا گمان گزرا کہ اب جمنا کاکی گھر کی ساری روداد کرید کرید کر پوچھیں گی لیکن کاکی نے بالکل برعکس سوال کیا۔ "یاور! کئی دن ہوتے میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے مور بھنور اور بازو بند درکار ہیں، نئی وضع کے مور بھنور، جن کی شکل مور کی طرح ہوتی ہے اور کانوں میں پہنے جاتے ہیں، بہت جی چاہتا ہے کہ انہیں پہنوں، تم نے ان کی فراہمی کا وعدہ بھی کر لیا تھا لیکن پھر شاید بات ذہن سے نکل گئی۔"

یاور خان نے اپنی بدلی ہوئی حالت کا اظہار کر دیا۔ سب کچھ بتا کر کہنے لگا۔ "جمنا! تمہیں اپنی فرمائشوں کی تعمیل کے لئے کچھ دنوں انتظار کی زحمت گوارا کرنا ہوگی۔ سرِدست میں ان

حالات میں نہیں ہوں کہ تمہاری یہ حقیر سی خواہش پوری کر سکوں۔"

جمنا کاکی نے نگاہیں بدلیں، بے مروتی سے بولیں۔ "تو جناب جب آپ ان برے حالات میں مبتلا ہو چکے ہیں اور پلے بھی کچھ نہیں رہا تو کیا ضروری ہے کہ تماش بینی بھی بدستور کرتے رہیں، یہ جگہ جہاں آپ اس وقت تشریف فرما ہیں، بازار کی طرح ہے، رقم کے بغیر بازار جانے کا خیال ہی دل میں نہ لانا چاہیئے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہم لوگوں نے اس ذلیل پیشے کو ذریعۂ معاش کے طور پر اختیار کر رکھا ہے، یہاں کسی قلاش یا مفلس کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔"

یادر خان پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ فوراً کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ "جمنا معاف کرنا، اب تک تو میں اس غلط فہمی میں تھا کہ شاید تم مجھے چاہنے لگی ہو لیکن میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے بروقت ہوشیار کر دیا۔"

جمنا کاکی نے قینچی کی طرح زبان چلائی، بولیں۔ "چاہنے والہنے کا کھیل شریف زادیاں ہی کھیلتی ہیں، ہم ٹھہرے کاروباری لوگ، گھوڑی گھاس سے آشنائی کرے گی تو کھائے گی کیا؟"

یادر خان نے ایسا محسوس کیا جیسے کمرہ گردش میں ہو۔ لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکلا اور ایک طرف روانہ ہوا، کہاں اور کیوں جا رہا ہے، اسے کچھ پتہ نہ تھا۔

وہاں سے نکل کر اس نے ایک جوا کھیلنا پسند کیا۔ آگرے پر بابر کا قبضہ ہو چکا تھا، لودھیوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی لیکن پٹھانوں کا حسن خان میواتی اب بھی ہمت نہ ہارا تھا اور حکومت کی بازیابی کی کوششیں کر رہا تھا، اس نے رانا سانگا سے معاملہ کر لیا اور پٹھان اور راجپوت آپس میں اتحاد کر کے اس نئے مغل حملہ آور اور فاتح کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ اس آویزش میں یادر خان چاہتا تو بابر کے مخالفین کا ساتھ دیتا کیوں کہ اس طرف اس کے ہم قوم تھے اور فتح کے زیادہ امکانات بھی انھی کے حق میں تھے لیکن اس نے بابر کا ساتھ دینا طے کیا۔ اس کا چچا توقیر، رانا سانگا اور حسن خان میواتی کے ساتھ تھا۔ آناً فاناً آگرے، بیانہ اور اس کے گرد و پیش کے صاف ستھرے اور پُرامن مطلع پر جنگ کی بھیانک گھٹائیں چھانے لگیں، آبادیاں جنگ کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لیے اِدھر اُدھر منتقل ہونے لگیں، لیکن توقیر خان کو حسن خان میواتی اور رانا سانگا کی فتح اور شکست کا یقین تھا، اس نے اپنے خاندان کی منتقلی کو غیر ضروری سمجھا، اب توقیر خان محض ایک

سپاہی تھا، افغان سپاہی۔ شمشیر دستاں کو اولیت حاصل ہو گئی تھی اور طاؤس و رباب کو عقب میں ڈال دیا گیا تھا۔

یاور خان کے جی میں کتنی بار آئی کہ وہ کلیانی کے پاس جائے اور جمنا کا کی سے ملے۔ مطلقہ بیوی اور بچی کو بھی دیکھنے کو جی چاہتا تھا لیکن ان سب کے خلاف نفرتیں اس کے قدم پکڑ لیتی تھیں۔ وہ بابر کی فوج میں سپاہی کی حیثیت سے داخل ہوا اور چھ ماہ کے اندر ہی ایک ہزاری منصب حاصل کر لیا، اب اس کے پاس رقم بھی تھی اور اعزاز بھی۔ جب زیادہ دل گھبراتا اور نفسانی خواہشات تنگ کرتیں تو وہ کلیانیوں اور جمنا کابیوں کے پاس چلا جاتا۔ وہ اب شادی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، اسے عورت سے نفرت ہو گئی تھی اور وہ اسے بیوی بنا کر رکھنے کو تیار نہ تھا۔

جمادی الآخر کی ۹ تاریخ تھی اور منگل کا دن ـــــ کہ بابر نے اپنی چوبیس ہزار فوج کی صف بندی کی۔ پھر بارہ تاریخ کو اس نے یہ جگہ چھوڑ دی اور دو میل آگے بڑھ کر بیانہ کے قریب قصبہ کانوہ میں مقیم ہو گیا، ابھی ان لوگوں نے خیمے بھی کھڑے نہ کیے تھے رانا سانگا اور حسن خان میواتی کی افواج کیڑے مکوڑوں کی طرح نمودار ہوئیں، گرد و غبار میں سورج چھپ گیا اور زمین لرزنے لگی، ہاتھیوں کی قطاریں سب سے آگے تھیں، راجپوتوں اور پٹھانوں پر مشتمل دو لاکھ فوجی اور دو ہزار جنگی ہاتھی بابر کی چوبیس ہزار افواج کے سامنے کھڑے اس کی قلت کا مذاق اڑا رہے تھے، مغلوں کی ہمتیں جواب دینے لگیں لیکن بابر اپنی تقریروں سے ان کی ہمتیں بندھاتا رہا۔

دونوں فوجیں آندھی طوفان کی طرح آگے بڑھیں اور ایک دوسرے میں گھس گئیں، نعرے، شور پکار، زخمیوں اور دم توڑتے مریضوں کی چیخیں میدان کو سر پر اٹھائے لے رہی تھیں۔ یاور خان اپنے گھوڑے کو ادھر ادھر دوڑا کر بچا توقیر خان کو تلاش کرتا رہا بڑی مشکلوں سے قلب کے قریب میسرے میں توقیر کی جھلک دکھائی دی۔ وہاں تک پہنچنا آسان کام نہ تھا۔ اس نے کمان میں تیر جوڑا اور نشانہ لے کر تیر جو چھوڑا تو وہ توقیر کے حلق کو چھید کر دوسری طرف نکل گیا اور توقیر چیخ مار کر گر گیا۔ اس نے لب بھینچ کر کہا۔ "حساب کتاب برابر ہو گیا، یہ تھا میرا انتقام!"

اس نے سوچا اب جب کبھی امن ہو گا تو وہ اپنی مطلقہ بیوی اور بچی سے ملنے ضرور جائے گا اور اب انہیں ملنے سے کوئی بھی نہ روک سکے گا۔

شام کے ہوتے ہوتے قسمت کا فیصلہ بابر کے حق میں ہو چکا تھا حسن خان میواتی قتل ہوا اور رانا سانگا جان بچا کر بھاگ نکلا، قرب و جوار کی دشمن بستیوں میں آگ لگا دی گئی

اور ان کی آبادیوں کو تہ تیغ کر دیا گیا اور اس میں بچے، بوڑھے، جوان، بیمار، عورت اور مرد کا کوئی خیال نہ رکھا گیا۔ بابر نے حکم دیا کہ مقتولوں کے سروں کا ایک مینار تعمیر کیا جائے، آناً فاناً سروں کا مینارہ کھڑا کر دیا گیا۔

چچا توقیر کا سر بھی مینارے میں لگ گیا۔ یاور نے چچا کے سر کو پہچان لیا، ہلالی مونچھیں اور یک مشتی داڑھی میں سازشی اور بد دیانت چہرہ دور سے پہچانا جا سکتا تھا، اس نے قریب جا کر چچا کے منہ پر تھوک دیا اور کہنے لگا۔ "تم نے مجھ پر ظلم کیا تھا، خدا نے تمہیں اس کا بدلہ دیا کہو اب کس حال میں ہو اور تم پر کیسی گزر رہی ہے!"

چہرے نے کوئی جواب نہ دیا۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن بصارت سے محروم تھیں، کان اپنی جگہ پر تھے لیکن سن نہ سکتے تھے۔ کئی دن بعد وہ ہمت کر کے اپنے آبائی گھر گیا لیکن اب یہاں کچھ بھی نہ تھا، پوری آبادی قتل کی جا چکی تھی، انہی میں اس کی بیوی اور بچی بھی شامل تھی کلیانی کا گھر تو موجود تھا لیکن وہاں متنفس ایک بھی نہ تھا۔ اس کے پتھر دل پر اس انقلاب کا کوئی اثر نہ ہوا، وہ فوج میں واپس گیا اور اپنے فرائض پوری تن دہی، مستعدی اور خوش اسلوبی سے انجام دینے لگا۔ اس طرح ایک سال گزر گیا۔

ایک دن وہ بابر کے دستر خوان پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا بابر کے رعب سے لوگوں کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور کھانے کے لئے ہاتھ نہایت ادب اور تکلف سے اٹھ رہے تھے بابر کے قریب ایک قاب میں حلوے جیسی کوئی چیز رکھی تھی، شریکِ طعام ایک پٹھان نے اس قاب کو بے تکلفی سے اٹھایا اور اِدھر اُدھر چمچے کی جستجو میں نظر دوڑائی جب چمچہ نہ مل سکا تو اس نے کمر میں اڑسے ہوئے خنجر کو نکالا اور اس کی نوک سے قاب کی حلوہ نما شے کھانے لگا۔ بابر نے دزدیدہ نگاہی سے اس جری پٹھان کو دیکھا اور اپنے وزیر سے کہا۔ "ہمیں اس پٹھان میں سرکشی اور تمرد کے آثار ملتے ہیں، کیوں نہ اسے گرفتار کر کے قید خانے میں ڈال دیا جائے۔"

بابر نے بات ترکی میں کی تھی لیکن پٹھان اس کے لبِ لباب کو پا گیا۔ کھانے کے بعد وہ باہر نکلا۔ یاور خان اس کے پیچھے پیچھے لگا ہوا تھا۔

یاور خان نے اسے مخاطب کیا۔ "دوست! کیا میں آپ سے آپ کا تعارف چاہ سکتا ہوں؟"

پٹھان نے جواب دیا۔ "میرا نام فرید خان ہے، میں بھی پٹھان ہوں۔"

یاور خان نے پوچھا۔ "آج کھانے کے دوران کچھ بدمزگی سی ہو گئی؟"

فرید خان نے جواب دیا۔ "ہاں، یہ مغل خود کو معلوم نہیں کیا سمجھتے ہیں ہم تو یہ جانتے ہیں

کہ اگر ہمارے پٹھان بھائی ایکا کرلیں اور ہمارا ساتھ دے جائیں تو میں ان مغلوں کو یہاں سے اس طرح نکال باہر کروں جس طرح دودھ سے مکھی نکال دی جاتی ہے۔"

یادر کو اس کی باتوں میں خوش فہمی محسوس ہوئی، ضرورت سے زیادہ خوش فہمی، اس نے پوچھا۔ "تم جا کہاں رہے ہو؟"

پٹھان نے جواب دیا۔ "اپنی جاگیر جونپور، پھر وطن سہسرام چلا جاؤں گا، اب مجھے مغلوں کے دربار میں ٹھیرنے سے خطرہ محسوس ہوتا ہے۔" اس نے جاتے جاتے پوچھا۔ "کیا تم بھی پٹھان ہو؟"

"ہاں!" یادر خان نے جواب دیا۔ "کیوں؟"

فرید خان نے کہا۔ "اگر کبھی تم پر وقت پڑے تو ہمارے پاس سہسرام چلے آنا۔ مجھے فرید خان کے علاوہ شیر خان بھی کہتے ہیں!"

فرید خان چلا گیا، یادر خان کو اس پٹھان میں کچھ غیر معمولی خصوصیات نظر آئیں، اس نے سوچا کہ اگر واقعی اس پر کوئی وقت پڑا تو وہ ضرور سہسرام جائے گا۔ یادر خان نے شیر خان کے جانے کے بعد تین سال بابر کی خدمت میں گزار دیے اور اس درمیان اس نے کئی بار یہ کوشش کی کہ اس کی جاگیر واگزاشت ہو جائے لیکن ناکام رہا، اب وہ جاگیر کسی مغل سردار کے نام منتقل ہو چکی تھی۔ یادر جیسے دوسرے کئی پٹھان سردار اور منصب دار جو یہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے یا ناقدری کے شکار ہیں، ہندوستان کے خود مختار درباروں کا رخ کر رہے تھے۔ یادر نے سن رکھا تھا کہ بنگال اور بہار کے بعض حکمران آزاد یا نیم آزاد زندگی گزار رہے ہیں، سہسرام میں اس کا پٹھان دوست شیر خان موجود تھا۔ لیکن وہ سردست شیر خان کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا، سہسرام سے پہلے بنارس کے جنوب میں چنار گڑھ تھا جہاں مفتوح ابراہیم لودھی کا نمائندہ تاج خان نامی افغان اب بھی حکمران تھا اور سننے میں آیا تھا کہ اس کے پاس سابق ہندوستانی شہنشاہ ابراہیم لودھی کا خزانہ اب بھی محفوظ ہے، یادر خان نے چنار گڑھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

چنار گڑھ جانے سے پہلے وہ اپنی جاگیر میں گیا، اب اس کی حویلی میں کوئی سمرقندی رہ رہا تھا، یہاں سے وہ کلیانی کی طرف گیا، اب وہاں کلیانی اور جمنا کا کی جگہ کلیانی کی ماسی اور اس کی دو لڑکیاں رہ رہی تھیں۔ کلیانی کی بابت اسے یہ معلوم ہوا کہ دارالحکومت کے آتے دن کے ہنگاموں سے تنگ آ کر ہندوستان کے کسی پرسکون علاقے میں چلی گئی ہے، اب جاگیر میں دلچسپی کی کیا چیز باقی رہ گئی تھی؟ اس نے خاموشی سے مشرق کا رخ کیا۔ چنار گڑھ اس کا

کا مستقر تھا۔

تاج خان نے اس کا پرجوش استقبال کیا اور اسے اپنی مصاحبت میں رکھ لیا۔ یہ بڑی پُرفضا جگہ تھی۔ یہاں کا قلعہ بڑا مستحکم تھا تاج خان مغلوں کی بابت معلومات حاصل کرتا رہا۔ اسے خدشہ تھا کہ جلد یا بہ دیر مغل حکمران چنار گڑھ کو بھی اپنی حرص کا نشانہ بنائیں گے، وہ یادر خان سے اس خطرے سے محفوظ رہنے کے مشورے کرتا رہتا۔ یادر خان نے مشورہ دیا کہ آس پاس کے افغان حکمرانوں اور قلعہ داروں کو مغلوں کے خلاف متحد ہو جانا چاہیئے۔ لیکن یادر خان یہ بھی خوب جانتا تھا کہ اس کے اس مشورے پر پٹھان عمل نہ کر سکیں گے، خود تاج خان کی اپنی اولادوں سے نہیں بن رہی تھی۔ تاج خان کی کئی بیویاں تھیں لیکن ان میں سب سے چہیتی لاڈو نامی بیوی تھی اور وہی تاج خان کی ملکہ بنی ہوئی تھی۔ یادر خان کو یہ جان کر بڑا دکھ ہوا کہ چنار گڑھ میں بھی ایک عورت ہی نفاق اور اختلاف کا سبب بنی ہوئی ہے۔

اس نے چنار گڑھ میں کئی برساتیں گزاریں، یہاں زندگی گزارنا دو بھر ہو گیا۔ چھوٹی سی آبادی میں کوئی بازارِ حسن نہ تھا، اور نفرت کے باوجود وہ عورت کی ضرورت شدت سے محسوس کرنے پر مجبور تھا۔ جب وہ تاج خان کی مصاحبت میں ہوتا اور زنان خانے سے چوڑیوں کے کھنکنے یا زمزمہ بار قہقہوں کی آوازیں سنائی دیتیں تو اس کی بڑی بری کیفیت ہو جاتی، اس پر ایک دورہ سا پڑتا اور جی میں آتا کہ وہ دیوانہ وار تاج خان کے چھوٹے سے محل سرا میں گھس جائے اور مدتوں کے رکے بندھے سیلِ نفسانی کے بند کھول دے لیکن اس کے انجام پر غور کرتا تو سارا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا۔ تاج خان اس کی اس کیفیت کو کسی نہ کسی طرح محسوس ضرور کر رہا تھا ہمیشہ یہی مشورہ دیتا کہ "یادر خان شادی کر لو"۔

یادر خان کہتا۔ "عورت نے میرا بہت دل دکھایا ہے، اس پر سے میرا اعتبار اٹھ گیا ہے"۔

تاج خان ہنس دیتا۔ اور جواب دیتا۔ "بے وقوف! اس دنیا میں قابلِ اعتبار تو کوئی شے بھی نہیں، ہر شے ناقابلِ اعتبار ہے!" اس کے بعد وہ اپنے جوان لڑکوں کا ذکر چھیڑ دیتا اور کہتا۔ "میں تو ان پر بھی اعتبار نہیں کرتا، دولت اور جاگیر کے لئے یہ اولادیں کسی وقت بھی مجھے ہلاک کر سکتی ہیں!"

یادر خان کو اس پر یقین نہ آتا اور ہنس کر کہتا۔ "تم تو مجھ سے زیادہ وہمی نکلے!"

تاج خان کہتا۔ "اولاد کو بھی چھوڑو، دولت، جائداد، جاگیر، حکومت، موسم سردی گرمی، بچپن، جوانی، بڑھاپا اور زندگی، ان میں سے تم کس پر اعتبار کرو گے؟ یہ سبھی ناقابلِ

اعتبار ہیں، ہمیں شکوک اور اوہام میں مبتلا ہو کر چند روزہ عیش و عشرت کے لطف کو بدمزہ نہیں کرنا چاہیئے۔"

یاور خان چپ ہو جاتا۔

ایک دن یاور خان نے عورت کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا۔ تاج خان نے اس بے چینی اور اشتہا کو محسوس کر لیا، اس نے یاور خان کا سامنا ایک ایسی عورت سے کرا دیا جو حسن و شباب کا پیکر تھی، عمر کوئی پچیس چھبیس سال رہی ہوگی، اس کا شوہر مر چکا تھا اور اس شوہر سے ایک لڑکا بھی تھا۔ سات آٹھ سالہ یونس خان۔ یہ عورت یاور خان کو پسند آئی اور تاج خان نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا لیکن اسی رات کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے یاور خان بہت خوفزدہ ہو گیا۔

یاور خان کی رہائش تاج خان کے بالکل قریب ہی تھی۔ مدتوں کا بھوکا ترسا یاور خان دیر تک جاگتا جگاتا رہا، رات کے پچھلے پہر شور و غل بلند ہوا۔ پہرے دار چیخ چیخ کر واویلا کر رہے تھے۔ "ملکہ لاڈو قتل کر دی گئیں۔ ملکہ لاڈو کو ان کے سوتیلے بیٹے نے قتل کر دیا۔"

یاور خان نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور تلوار لے کر باہر نکل گیا وہاں لوگ مشعلیں لئے ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے تھے، اچانک ایک طرف سے ایک نوجوان بھاگتا ہوا آیا، اس کے ہاتھ میں خون آلود تلوار تھی، تھوڑی دور سے بھاگتے ہوئے تاج خان کی آواز گونجی۔ "کدھر جاتا ہے مردود، میں آ گیا ہوں تجھے جہنم واصل کرنے۔ اپنی ماں پر ہاتھ اٹھاتے تجھے شرم نہ آئی؟"

نوجوان ٹھہر گیا، مشعلوں کی روشنی میں یاور خان نے اسے پہچان لیا، یہ تاج خان کا بڑا بیٹا تھا۔

اب تاج خان بھی قریب آ چکا تھا۔ لڑکے نے باپ سے غصے میں کہا۔ "واپس جاؤ، ورنہ میں تمہیں بھی قتل کر دوں گا۔"

تاج خان نے پوچھا۔ "تو نے اپنی سوتیلی ماں پر ہاتھ کیوں اٹھایا؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "اس نے تمہیں دیوانہ بنا رکھا تھا اور اس کے ہوتے ہوئے ہمیں اپنی دولت اور جاگیر پر کوئی اختیار نہ تھا۔"

تاج خان پر محبت پدری حاوی آنے لگی، وہ چاہتا تو بیٹے کو زخمی کر سکتا تھا لیکن اس کے ہاتھ کی قوت جیسے زائل ہو گئی۔ مشعل بردار اور پہرے دار بھاگے چلے آ رہے تھے لڑکے نے ان کی آمد سے پہلے ہی تلوار کا ایک بھرپور وار باپ کی گردن پر رسید کیا جس سے

تاج خان کا سر یادر خان کے قدموں میں آگرا، لڑکا یہ جا وہ جا، نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تاج خان کا لاشہ پھڑکتا رہا، یادر خان کو ایسا لگا، جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہے۔

وہ ملول اور افسردہ بیوی کے پاس واپس گیا۔ چند لفظوں میں پیش آنے والے سانحے کا ذکر کیا اور پھر خاموش خاموش قدم اٹھاتا ہوا اس کمرے میں چلا گیا جہاں اس کا سوتیلا بیٹا یونس خان سو رہا تھا۔ وہ شامی شمع اس کے سرہانے روشن تھی، سانسوں کی آمد و رفت سے اس کا سینہ اور پیٹ مد و جزر کی کیفیت میں مبتلا تھا۔ داہنی طرف کھڑے ہو کر وہ کچھ دیر ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا، اسے ایسا لگا جیسے یونس خان جوان ہو چکا ہے اور تلوار لیے اس پر حملہ آور ہو رہا ہے اس کے جی میں آئی، کہ وہ یونس خان کا گلا دبا دے۔ پیچھے یونس خان کی ماں اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ یونس خان کے گلے کی طرف جھکا۔ پیچھے عورت کے تنفس میں شدت پیدا ہو گئی، وہ پیش آنے والے خطرے کی بو محسوس کر چکی تھی۔ یادر خان کے ہاتھوں نے جیسے ہی یونس کی گردن کو گرفت میں لیا، عورت چیخ کر اس سے چمٹ گئی۔ "یادر خان! تم یہ کیا کر رہے ہو؟"

یادر خان ہوش میں آگیا، ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی رہی اور اپنے چہرے کو کچھ اور جھکا کر دونوں ہونٹ یونس کے رخسار پر رکھ دیے اور اسے پیار کرنے لگا۔

عورت بار بار پوچھ رہی تھی۔ "یادر خان! تم یہ کیا کر رہے ہو؟"

یادر خان نے جذباتی آواز میں جواب دیا۔ "تمہارے بچے کو پیار کر رہا ہوں!"

عورت نے جلدی سے کہا۔ "لیکن اب یہ تمہارا بھی تو ہے!"

یادر خان نے تکلفاً اور رسماً کہا۔ "ہاں یہ اب ہمارا بھی ہے!"

یادر خان وہیں ایک طرف بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اسی طرح ایک دن اس نے اپنی بچی کو بھی ہلاک کرنا چاہا تھا کیوں کہ اس وقت یادر خان کے خیال میں لڑکی عزت و آبرو کی دشمن تھی اور وہ کسی کا خسر ہونا سخت ناپسند کرتا تھا، لیکن آج تاج خان کے قاتل بیٹے نے اس کی سوچ کا رخ بدل دیا تھا، لڑکی عزت و آبرو کی دشمن ہوتی ہے تو لڑکا جان اور مال کا۔ تاج خان سچ کہتا تھا کہ اس دنیا کی ہر شے ناقابل اعتبار ہے۔

عورت یادر خان کے فکرمند اور سوچ میں ڈوبے ہوئے چہرے کو دیکھتی رہی۔ آخر کچھ سمجھ کر اتنا ہی کہہ سکی۔ "میرا بیٹا یونس خان ایک شریف باپ کا بیٹا ہے، یہ تاج خان کے بیٹے جیسی کوئی حرکت نہ کرے گا تم اطمینان رکھو۔"

تاج خان کا قاتل بیٹا پکڑا گیا۔ لاڈو ملکہ معمولی زخمی ہوئی تھی علاج معالجے سے ٹھیک ہوگئی، قلعے کے امرا اور دانشمندوں نے سوچا کہ اب تاج خان کی موت کے بعد قلعے کی حفاظت بہت مشکل ہے، انھوں نے اس کا یہ حل نکالا کہ لاڈو ملکہ کو اس پر آمادہ کرلیا کہ وہ سہسرام کے شیر خان سے شادی کر کے قلعے کا نظم ونسق اس کے حوالے کردے، لاڈو تیار ہوگئی اور یہ کام بہت جلدی انجام پاگیا۔ شیر خان، یادر سے مل کر بہت خوش ہوا اور اسے اپنی فوج کے ایک بازو کی سرداری بخش دی۔

آگرے میں بابر کا انتقال ہوچکا تھا اس کی جگہ ہمایوں تخت نشیں ہوا۔ اب جو زندگی کا طوفانی عہد شروع ہوا تو ایسا لگا جیسے کبھی ختم ہی نہ ہوگا۔ شیر خان کی ہمایوں سے آویزش شروع ہوگئی، یادر خان کے شب و روز مختلف محاذوں پر گزرنے لگے۔ ہمایوں چنار گڑھ کی طرف بڑھا تو شیر خان نے رہتاس پر قبضہ کرلیا، یہاں تک کہ کئی سال کی کش مکش کے بعد بنارس کے شمال میں چوسا کی جنگ میں ہمایوں کی شکستِ فاش نے شیر خان کو شیر شاہ بنا دیا۔ یادر خان جوش و خروش سے شیر خان کا ساتھ دے رہا تھا اسے اپنی جاگیر یاد آرہی تھی، اور اسے یقین ہو چلا تھا کہ اگر شیر خانی فتوحات کا دائرہ اسی طرح وسیع ہوتا رہا تو آگرہ زیادہ دور اور زیادہ دنوں کا نہیں ہے۔

پھر ایک دن شیر خان نے اسے یہ خوش خبری سنائی کہ رات خواب میں، میں ہمایوں کے ساتھ رسول اللہ ؐ کے دربار میں پہنچا۔ حضور ؐ نے ہمایوں کے سر سے تاج اتار کر میرے سر پر رکھ دیا اور ہدایت کی کہ "شیر خان! عدل و انصاف سے حکومت کرنا۔" خواب بیان کر کے شیر خان نے کہا۔ "اب ہمیں ہندوستان کی بادشاہت تک پہنچنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔"

دونوں کا آخری مقابلہ قنوج کے قریب دریائے گنگا کے کنارے ہوا، ہمایونی فوج ایک لاکھ سپاہیوں پر مشتمل تھی اور شیر خانی سپاہ پچاس ہزار پر، زور کا رن پڑا۔ ہمایوں شکست کھا کر فرار ہوگیا اور شیر خان آگے بڑھ کر آگرے میں داخل ہوگیا۔ اب وہ شیر خان نہیں، شیر شاہ تھا۔ شاہِ عالم شیر شاہ، کیونکہ اس نے اپنے لئے یہی خطاب پسند کیا تھا، یادر خان تقریباً تیرہ چودہ سال ادھر ادھر گزار کر پھر اپنے وطن واپس آگیا تھا۔ دریائے چنبل اسی طرح رواں دواں تھا اس کا آٹھ سالہ یونس خان اب تقریباً سولہ سال کا ہوچکا تھا جب وہ اپنی بیوی اور یونس خان کو لے کر اپنی جاگیر پہ گیا تو اسکی آنکھیں بھر آئیں، اب یہاں کوئی توقیر خان نہ تھا، پورا علاقہ تنہا اسی کے تسلط میں تھا۔ ابھی وہ چین سے بیٹھا بھی نہ تھا کہ اسے تین سال کے لئے پھر باہر جانا پڑ گیا۔ شیر شاہ مختلف محاذوں پر الجھا

ہوا تھا۔ یاور خان کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑ رہا تھا۔ اس کی طبیعت جنگ و جدل سے الجھنے لگی تھی، اس نے ان معرکوں میں کئی بار ایسے زخم کھائے تھے کہ زندگی سے مایوس ہو گیا تھا۔ اس نے شیر شاہ سے درخواست کی کہ اسے چند سالوں کے لئے جاگیر میں واپس جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ شیر شاہ نے اس کی درخواست منظور کر لی۔

اپنی حویلی میں داخل ہوتے ہی اس نے پہلی بار المناک اور زیر و بم میں گزرتے ہوئے ماضی کو دیکھا۔ وہ سارے نشیب و فراز جن سے وہ گزر چکا تھا، باری باری یاد آتے رہے، بیوفا بیوی، بے گناہ بچی، عیار اور لالچی چچا سبھی یاد آئے، اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں، اس کی یہ دوسری بیوی بہت اچھی تھی۔ اور اس سے ابھی تک کوئی شکایت نہ پیدا ہوئی تھی، انیس سالہ یونس بھی حد درجہ سعادت مند نکلا تھا۔ وہ اپنی اس زندگی سے بہت خوش اور مطمئن تھا۔ وہ یونس کو لے کر جاگیر میں اِدھر اُدھر نکل جاتا اور دونوں مل کر گھڑ دوڑ کی مسابقت کرتے، جب یونس اسے پیچھے چھوڑ دیتا تو یاور خان بہت ہنستا اور بہت خوش ہوتا۔ اس نے یونس کو سپاہیانہ کرتبوں میں طاق کر دیا تھا۔

اس نے کئی بار مہندی کے درختوں کے جھنڈ میں کھپریلوں والے اس مکان کو دیکھا جہاں کلیانی اور جمنا کا کی رہا کرتی تھیں اور آخری معلومات تک کلیانی کی ماسی اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ آکر رہنے لگی تھی، پھر آہستہ آہستہ اس میں یہ تبدیلی رونما ہوئی کہ وہ ہر روز کسی نہ کسی وقت اُدھر سے گزرتا ضرور، کئی بار جی چاہا کہ وہ گھوڑے سے اتر کر اندر جائے لیکن کچھ سوچ کر باز رہا۔

سردیاں شباب پر تھیں، صبح شام بتیسی بجنے لگی تھی، چاند کی سات تاریخ تھی، کمزور چاندنی اور سرد رات، ہر طرف سکوت ہی سکوت تھا۔ وہ آگرے سے واپس آ رہا تھا، جب وہ کلیانی کے مکان کے پاس سے گزر رہا تھا تو اسے گانے کی آواز سنائی دی، اس نے بے ارادہ گھوڑے کی لگام کھینچ لی اور کچھ دیر گھوڑے کی پشت پر بیٹھے بیٹھے ہی سوچتا رہا پھر گھوڑے سے اتر پڑا اور گھوڑے کی لگام پکڑ کر آہستہ آہستہ پیپل کے درخت کی طرف بڑھا۔ اب وہاں امرود کا درخت نہیں تھا، لگام کو پیپل کے ایک ٹنڈ سے پھنسا دیا اور مہندی کے جھنڈ کی طرف چل پڑا۔ اب درخت پہلے سے بڑے تھے وہ انہیں دونوں ہاتھوں سے اِدھر اُدھر ہٹاتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا اور آہستہ آہستہ دستک دینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے دروازہ کھولا، شمع اس کے ہاتھ میں تھی اس نے روشنی میں یاور خان کو دیکھا اور پوچھا۔ "جناب کو کس سے ملنا ہے؟"

یاور خان کو اس تیس بتیس سالہ مرد میں تنہائی کی شباہت محسوس ہوئی۔ اس کے

منہ سے خود بخود نکل گیا۔ "مجھے کلیانی سے ملنا ہے، کیا وہ اندر موجود ہیں؟"

مرد نے ایک بار پھر غور سے یاور خان کو دیکھا اور مسکرا کر جواب دیا۔ "ذرا ٹھیرو، خبر کرتا ہوں۔"

وہ اندر واپس گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر عورت کے ساتھ واپس آیا۔ مرد نے شمع یاور خان کی طرف بڑھا دی، عورت نے اس کی روشنی میں خوب اچھی طرح یاور خان کو دیکھا اور ہونٹوں پر اداس مسکراہٹ لا کر بولی۔ "یاور خان!"

یاور خان نے جواب دیا۔ "ہاں یاور خان!" اس کے بعد اٹک اٹک کر پوچھا۔ "اور تم۔ شاید تم کلیانی ہو!"

"ہاں میں کلیانی ہوں!" کلیانی نے نظریں جھکا لیں۔

دونوں کا عجیب حال تھا، شاید دونوں جو کچھ دیکھ رہے تھے اس پر انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

یاور خان نے کہا۔ "مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ تم یہیں ہو!"

کلیانی نے جواب دیا۔ "لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ تم یہیں ہو اور تمہاری جاگیر تمہیں واپس مل چکی ہے۔"

یاور خان کے دل میں کلیانی کی محبت عود کر آئی، شکایتاً بولا۔ "جب تمہیں یہ معلوم تھا کہ میں یہیں ہوں تو تم نے مجھ سے ملنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟"

کلیانی نے حسرت سے کہا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تمہیں میری موجودگی کا جیسے ہی پتہ چلے گا تم خود ہی بھاگے چلے آؤ گے۔"

"خوب!" یاور خان نے کہا۔ "مجھے تو یہ معلوم ہوا تھا کہ تم کہیں چلی گئی ہو!"

"ہاں گئی تو تھی لیکن کہیں اور دل نہ لگا، واپس آگئی!"

یاور خان نے پوچھا۔ "جمنا کاکی کہاں ہیں؟"

کلیانی نے منہ بسور کر جواب دیا۔ "پچھلے سال سورگباش ہو گئیں!"

یاور خان کو دکھ پہنچا، افسوس کرتا ہوا بولا۔ "بہت اچھی تھیں جمنا کاکی!"

نہالی نے اکتا کر کہا۔ "اب اندر ہی چل کر باتیں کرو، میرا تو شمع پکڑے پکڑے ہاتھ دکھنے لگا۔"

کلیانی نے بھی چونک کر کہا۔ "ہاں یہ تو میں بھول ہی گئی تھی، اندر آؤ۔ وہاں جی بھر کے باتیں ہوں گی۔"

یادر خان ان کے ساتھ اندر چلا گیا۔

اندر جو ٹھاٹھ تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب کلیانی کے پاس بہت کچھ ہے، چھت سے لٹکے ہوئے جھاڑ فانوس بہت قیمتی تھے اور کمرے کو بہت زیادہ آراستہ کر دیا گیا تھا، سارے گاؤ تکیے ریشمی تھے۔ اس وقت کمرہ سونا تھا سازندے بھی کہیں دبکے ہوئے تھے۔

کلیانی نے یادر خان کو اسی جگہ بٹھایا، جہاں وہ پہلے بیٹھا کرتا تھا، اور خود اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ نہالی اندر چلا گیا، یادر اس آتش رفتہ کے سراپے کا جائزہ لیتا رہا۔ کلیانی کا دمکتا ہوا حسن اب پھیکا پڑ چکا تھا۔ چہرے پر ہلکی سی سیاہی بھی محسوس ہوتی تھی، لیکن احتیاط اور حفاظت کی وجہ سے جسم میں تناؤ اور کساؤ اب بھی موجود تھا اور جس نے اس کو نوجوانی یا جوانی میں نہ دیکھا ہو، وہ اب بھی اسے دل دے سکتا تھا۔ یادر خان کو کلیانی اب بھی اچھی لگ رہی تھی۔

کلیانی نے شوخی سے پوچھا۔ "سنتی ہوں تم نے ایک لڑکے کی ماں سے شادی کر لی!"

"ہاں کر تو لی!" یادر خان نے جواب دیا۔ "بڑی نیک عورت ہے!"

کلیانی نے کہا۔ "عورتیں ساری ہی نیک ہوتی ہیں، تمہاری پہلی بیوی کیا بری تھی!"

"وہ بہت بری تھی!" یادر خان نے کہا "وہ خود تو بری تھی ہی لیکن اس کا باپ اس سے بھی زیادہ برا تھا!"

"تھا تو وہ تمہارا ہی چچا!"

"اس سے کیا ہوتا ہے، برا تو برا ہی کہلائے گا!"

کلیانی کچھ سوچتی ہوئی بولی۔ "رانا سانگا کی شکست اور بابر کی جیت نے تمہارے خاندان کو بالکل برباد کر دیا۔ مغلوں نے گھروں میں گھس گھس کر قتل عام کیا ہے اسی میں تمہاری بیوی اور بچی کو بھی قتل کر دیا گیا" پھر جھرجھری لے کر بولی۔ "اب بھی جب اس خون خرابے کو یاد کرتی ہوں تو کانپ کانپ جاتی ہوں۔" پھر یادر خان سے پوچھا۔ "سچ بتانا تمہیں اپنی پہلی بیوی اور بچی کی یاد اب بھی کبھی آتی ہے یا نہیں؟"

یادر خان نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "مجھے ان کے ذکر تک سے نفرت ہے!"

"خوب!" کلیانی بولی۔ "آدمی کو اتنا جذباتی بھی نہیں ہونا چاہیئے!"

یادرخان کو کچھ سردی سی محسوس ہوئی تو کلیانی نے اسے کمبل اڑھا دیا اور پیروں پر شال ڈال دی۔

یادرخان نے کہا۔ "اب میں چلوں گا!"

"کہاں؟"

"گھر!"

"چلے جانا، جلدی بھی کیا ہے!" کلیانی خود بھی شال اوڑھ کر بیٹھ گئی۔ "تقریباً پندرہ سال بعد ملاقات ہوئی ہے ہم دونوں کی!"

"ہاں!" یادرخان کو اب وہ اتنی اچھی لگنے لگی تھی کہ سینے سے لگا لینے کو جی چاہنے لگا بولا۔ "کلیانی! ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گی؟"

"نہیں، کہو، برا کیوں مانوں گی تمہاری کسی بات کا؟"

یادرخان ماضی کی یاد دلاتا ہوا بولا۔ "تمہیں خوب یاد ہو گا کہ جب میں تمہاری عدم موجودگی میں تمہاری ماں جمنا کا کی طرف راغب ہو گیا تھا تو تم نے اس پر بہت غصہ کیا تھا!"

"ہاں یاد ہے!" کلیانی نے کہا۔ "اور یہ بھی یاد ہے کہ تم نے مجھ سے کیا کچھ کہا سنا تھا!"

یادرخان نے شرمندگی سے کہا۔ "بعد میں، میں نے بہت کچھ سوچا تو اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس وقت میں ہی غلطی پر تھا مجھے بیک وقت تم دونوں سے تعلقات نہیں رکھنے چاہیئے تھے!"

کلیانی ہنسنے لگی، بولی۔ "نہیں تم غلطی پر نہیں تھے، بعد میں جب میں نے اس پر غور کیا تو پتہ چلا کہ میں خود غلطی پر تھی۔ تم نے سچ ہی کہا تھا کہ یہ کوچہ ہی دوسرا ہے یہاں سب کچھ چلتا ہے۔"

یادرخان اور زیادہ شرمندہ ہو گیا۔ "میں بہت زیادہ شرمندہ ہوں کلیانی، مجھے اور زیادہ شرمندہ نہ کرو۔"

کلیانی نے ایک نشتر اور اتارا۔ "جمنا کاکی میری ماں تھی اور تم ہم دونوں کے عاشق تھے تمہیں یاد ہے نا جب میں نے تمہیں اس سے منع کیا تھا تو تم نے یہ کہا تھا کہ یہاں صرف ایک ہی رشتہ ہوتا ہے، میں اور جمنا کاکی بکاؤ چیزیں تھیں، اور تم ان کے خریدار تھے جب جس

پر طبیعت آ ئے گی، قیمت ادا کر کے خرید لو گے !"

یادر خان میں اب مزید صبر کا یارا نہ تھا۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا، بولا۔" مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے کلیانی تم مجھے کیوں شرمندہ کر رہی ہو !"

کلیانی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بٹھانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔" میں تمہیں خفا ہو کر ہرگز نہ جانے دوں گی، ابھی تمہیں کچھ دیر اور بیٹھنا پڑے گا۔"

"لیکن اس شرط پر کہ اب ماضی کا ذکر نہیں چھڑے گا !"

"منظور !" کلیانی بولی۔" لیکن میں نے جو کچھ کہا، اس سے تمہیں چھیڑنا یا ستانا مقصود نہ تھا، میں تو اس حقیقت کا اعتراف کر رہی تھی جو اٹل اور ناقابل تردید ہے !"

یادر خان پھر بیٹھ گیا۔ پوچھا۔" کیا میں اب بھی تم سے ملنے کے لئے آ سکتا ہوں ؟"

"بالکل۔ تمہارا اپنا گھر ہے، جب چاہو آؤ، تمہیں کون روک سکتا ہے بھلا ؟"

"شکریہ !" یادر خان نے کہا۔" کلیانی ! میں تمہارے لئے دل میں اب بھی کسک محسوس کرتا ہوں۔"

"خیر اب یہ باتیں تو کرو نہیں، یہ ساری فضول باتیں ہیں !"

"تمہیں یقین نہیں آتا کیا ؟"

"بھلا یقین آئے بھی تو کس طرح ؟"

"کیوں یقین دلانے کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے ؟"

کلیانی ایک دم سنجیدہ ہو گئی، بولی۔" اگر میرے لیے تمہارے دل میں کسک ہوتی تو تم مجھے یاد ضرور کرتے اور میری خبر ضرور لیتے !"

یادر خان نے جواب دیا۔" تمہاری خبر کس طرح لیتا، تم یہاں تھیں ہی کب ؟"

کلیانی نے کہا۔" میں صرف دو سال باہر رہی، اس کے بعد پھر یہیں آ گئی۔"

یادر خان چپ ہو رہا۔ کلیانی پھر بولی۔" دل میں کسک میرے لئے ہوتی ہے اور شادی کسی اور سے رچاتے ہو، خوب۔" وہ ہنسنے لگی۔" یادر خان ! تمہاری وہی بات ٹھیک ہے جو تم نے پندرہ سال پہلے کہی تھی، ہم بازار کی بکاؤ چیزیں ہیں، جب طبیعت للچائے، قیمت ادا کر دو، مزے لو ٹو اور پھر گھر کی راہ لو۔"

یادر خان غصے میں کھڑا ہو گیا۔" اچھا میں چلتا ہوں کلیانی اگر تم یہی چاہتی ہو کہ

میں آیندہ یہاں نہ آؤں تو صاف صاف کہہ سکتی ہو، مخمل میں لپیٹ کر جوتے لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

کلیانی شوخی سے مسکراتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ "ارے تم خفا ہو گئے، خوب، شاید اب مجھ میں وہ پہلی جیسی دلکشی نہیں رہی، اسی لئے میں نے تمہارے لئے دوسرا بندوبست کر رکھا ہے، میری محبت کو دیکھو مجھے تم سے اتنی محبت ہے کہ میں نے تمہاری واپسی کی امید میں پال پوس کر دوسری کلیانی جوان کر رکھی ہے!"

اس کے بعد وہ یاور خان کو چھوڑ کر اندر چلی گئی، یاور خان اس کی باتوں کا جو مطلب سمجھا تھا، اس کے انتظار میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ کچھ دیر بعد جب کلیانی واپس آئی تو وہ تنہا نہ تھی، ایک نہایت حسین اور نازک اندام نوجوان لڑکی اس کے ساتھ تھی، کلیانی نے پیار سے اسے حکم دیا۔ "شانتا بیٹی انہیں سلام کرو۔"

شانتا نے نہایت لجا کے ایک ادا کے ساتھ یاور خان کو سلام کیا۔ یاور خان نے اشاروں میں سلام کا جواب دے کر کلیانی کو اس طرح دیکھا، جیسے پوچھ رہا ہو۔ "یہ کون ہے کلیانی؟"

کلیانی نے چچا توقیر کا ذکر چھیڑا اور ان سے تعلقات کی داستان سنا کر بولی۔ "یہ انہی کی یادگار ہے!"

یاور خان دزدیدہ نگاہوں سے شانتا کے شباب اور دلکشی کا جائزہ لیتا رہا۔ اب وہ یہاں سے فوراً چلے جانے پر تیار نہ تھا۔ حسن پرستی کا جذبہ عود کر آیا، شانتا اس سے کہیں زیادہ حسین تھی جتنی کلیانی ہوا کرتی تھی۔

کلیانی اس کے احساسات پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی، بولی۔ "یاور خان! کھڑے کیوں ہو، تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ جاؤ!"

یاور خان بیٹھ گیا۔ کلیانی شانتا کے ساتھ اس کے روبرو بیٹھ گئی۔

کلیانی کچھ دیر بعد بولی۔ "اب آج تو اتنا وقت نہیں ہے لیکن جب پھر کبھی آؤ گے تو میں تمہیں شانتا کا گیت بھی سنواؤں گی اور ناچ بھی دکھاؤں گی، دیکھ کر دنگ رہ جاؤ گے، اتنا اچھا تو مجھے بھی نہ آتا تھا۔"

یاور خان کسی کش مکش کا شکار تھا۔ کلیانی اس کی نفسی کیفیات خوب سمجھ رہی تھی پوچھا۔ "یاور خان! سچ بتانا اب میں کیسی لگ رہی ہوں؟"

یاور خان لاجواب تھا۔

کلیانی نے کہا۔" تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، صاف کہہ سکتے ہو کہ شانتا زیادہ اچھی لگ رہی ہے!"

یاور خان نے کہا۔" لیکن یہ تمہاری بیٹی ہے!"

"اس سے کیا ہوتا ہے، جمنا کاکی بھی تو میری ماں تھیں؟"

"ہاں!" یاور خان شرمندہ تھا، پانی پانی ہو رہا تھا۔

کلیانی نے دلاسا دیا۔ ڈھارس بندھائی، کہنے لگی۔" یاور خان! اس کوچے میں اخلاقیات کا کیا کام، تم جوانی میں صحیح سوچ رکھتے تھے، یہ بازار ہے یہاں گاہک اور سوداگر میں بس ایک ہی رشتہ ہوتا ہے، تمہیں شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، اگر تمہیں شانتا اچھی لگے تو اسے بھی اسی طرح حاصل کر سکتے ہو جس طرح مجھے اور جمنا کاکی کو حاصل کیا تھا!"

پہلے تو یاور خان یہ محسوس کر رہا تھا کہ کلیانی اسے چھیڑ رہی ہے لیکن اب یہ محسوس ہونے لگا کہ کلیانی اس سے کاروبار کر رہی ہے، وہ اس سے دولت کھینچنا چاہتی ہے، اپنی لڑکی شانتا کو دولت کے عوض اس کے حوالے کرنا چاہتی ہے، یاور خان کا دل ڈانواڈول ہونے لگا۔ شانتا کے زہد شکن شباب اور خرد دشمن حسن نے اسے بے بس کر دیا اور اسے یہی سمجھایا کہ یہ بازار ہے، یہاں وہ اشیا بھی خرید سکتا ہے اور اشیا کا بار دانہ بھی خرید سکتا ہے، گھوڑی بھی خرید سکتا ہے اور گھوڑی کی جوان ہو جانے والی بچی بھی خرید سکتا ہے، وہ دونوں ہی سے متمتع ہو سکتا ہے، اس نے کلیانی سے وعدہ کر لیا کہ وہ پھر آئے گا اور شانتا کے فن سے لطف اندوز ہو گا۔

دوسرے دن کلیانی اور شانتا کی صحبت میں اس نے کئی ساعتیں گزار دیں، شانتا کا گانا بھی سنا اور رقص بھی دیکھا۔ وہ شانتا کے چہرے میں چچا توقیر کی شباہت تلاش کرتا رہا شانتا کی ناک اور آنکھیں بالکل چچا جیسی تھیں، اسے شانتا پر افسوس اور مرحوم چچا پر غصہ آ رہا تھا کہ ان کا خون اس گندے ماحول میں زندگی گزار رہا تھا۔ کئی بار جی میں آئی کہ وہ اس سے شادی کر لے اور عزت و آبرو سے گھر لے جا کر رکھے، اسے اس کوچے سے گھن آنے لگی، جہاں شرفا اپنا خون چھوڑ آتے ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آلودہ زندگی گزارتا رہتا ہے، وہ چاہتا تو رقم دے کر شانتا سے لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ لیکن مرحوم چچا کا خیال آتے ہی وہ رک جاتا۔

کلیانی اسے زیادہ سے زیادہ موقع دیتی رہی، لیکن پھر اس نے یہ بات بھی محسوس

کی کہ در پردہ نگرانی بھی کرتی ہے، رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ یادر خان شانتا کے لئے تڑپنے لگا۔ اس نے اس پر بے تحاشا دولت صرف کردی۔ گھر میں بیوی سے ان بن رہنے لگی، وہ کہتی۔ "اگر تمہیں یہی کچھ کرنا ہے تو مجھے چنار گڑھ پہنچا دو!"

یادر خان کہتا۔ "اری نیک بخت! وہاں بات کچھ ایسی ہے کہ میں سرِ دست زبان نہیں کھول سکتا، عزت آبرو پر آپڑی ہے!"

ایک دن یادر خان نے بیوی سے اجازت طلب کی، پوچھا۔ "اگر میں دوسری شادی کرلوں تو تم برا تو نہیں مانو گی؟"

بیوی نے جواب دیا۔ "اب اس عمر میں؟ اگر میں چپ رہوں گی تو لوگ کیا کہیں گے؟"

"مجھے لوگوں کی کوئی پروا نہیں!" یادر خان نے کہا۔ "بس تم اجازت دے دو۔"

بیوی نے بے دلی سے کہا۔ "کرلو لیکن اس کنچنی کو یہاں نہ لانا اس کے رہنے بسنے کا کہیں اور بندوبست کردینا۔"

یادر نے کہا۔ "چلو ایسا ہی کردوں گا!"

اس کے بعد وہ کلیانی کے پاس پہنچا اور اس سے بولا۔ "کلیانی! آج میں تم سے کچھ خاص باتیں کرنا چاہتا ہوں!"

کلیانی نے غور سے اسے دیکھا، بولی۔ "کب؟ ابھی کروگے وہ باتیں؟"

"ہاں!" اور وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر شانتا کو تلاش کرنے لگا۔ "شانتا کہاں گئی؟"

کلیانی نے جواب دیا۔ "اندر ہوگی، بلوا دوں؟"

"ہاں، بلوا دو!"

کلیانی خود گئی اور شانتا کو بلا لائی، دھانی ریشمی ساری میں اس کا حسن پھٹا پڑ رہا تھا۔

یادر خان نے کلیانی کو ٹالنا چاہا، بولا۔ "کلیانی! میں ذرا تخلیہ چاہتا ہوں!"

"شوق سے!" وہ کھڑی ہوگئی۔ "میں جانتی ہوں لیکن ذرا احتیاط رکھنا!"

"مطمئن رہو، اس میں چچا توقیر کا خون ہے، میں کسی اور طرح اسے ناجائز سمجھتا ہوں!"

جب کلیانی جانے لگی تو یادر خان نے اسے چند اشرفیاں تھمادیں، وہ

چلی گئی۔

شانتا سر جھکا کر بیٹھ گئی، یادر خان نے ٹھوڑی میں انگلیاں دے کر چہرہ اوپر اٹھایا اور محبت سے دریافت کیا۔" شانتا! میں کلیانی سے بات کرنے سے پہلے تم سے ایک اجازت چاہتا ہوں!"

شانتا اس کی شکل دیکھنے لگی۔

یادر خان نے کہا۔" شاید تمہیں نہیں معلوم کہ تمہاری رگوں میں میرے چچا کا خون دوڑ رہا ہے!"

شانتا نے آہستہ سے کہا۔" ہاں پھر؟"

یادر خان نے کہا۔" پھر یہ کہ میں تمہیں یہاں نہیں دیکھنا چاہتا!"

شانتا چپ رہی، شاید اس کا مطلب نہیں سمجھ رہی تھی۔

یادر خان نے پوچھا۔" کیا تم میرا مطلب سمجھ گئیں؟"

شانتا نے نفی میں گردن ہلا دی، یادر خان مسکرانے لگا۔ بولا۔" تم بہت بھولی ہو شانتا" اور یہ بھی شاید اس لئے کہ تمہاری رگوں میں ایک شریف شخص کا خون دوڑ رہا ہے!" پھر کچھ ٹھہر کر کہا۔" شانتا! میں تمہیں اس ماحول سے نکال لے جانا چاہتا ہوں، تم میرے ساتھ یہاں سے نکل چلو!"

"کہاں؟"

"جہاں میں لے چلوں" یادر خان دل کی بات مارے شرم کے کہہ نہیں پا رہا تھا۔" شانتا تم یقین کرو میں تمہیں بہت اچھی طرح رکھوں گا!"

شانتا نے کہا۔" یہاں بھی مجھے کوئی تکلیف نہیں!"

یادر خان نے کہا۔" اوہ، تم میری بات کیوں نہیں سمجھتیں شانتا! میں تمہیں اس آلودگی سے نکالنا چاہتا ہوں تم مجھ سے شادی کر لو!" یہ کہتے کہتے وہ جیسے پسینے میں شرابور ہو گیا۔

شانتا نے ساڑھی کا کونا دانتوں تلے دبا لیا اور مسکرانے لگی۔" تم مجھ سے شادی کرو گے! لیکن میں تم سے شادی نہیں کروں گی!"

"کیوں؟" یادر خان کا دل ڈوبنے لگا۔

"یہ ماں جی سے پوچھ لو!" شانتا نے جواب دیا۔

یادر خان نے سوچا ماحول اور پیشے کا رنگ پوری طرح شانتا پر چڑھ چکا ہے،

وہ شادی وادی کے چکر میں کیوں پڑنے لگی۔ پھر بھی اسے موہنے کے لئے یاور خان نے چپکے سے پچاس اشرفیاں تھما دیں، بولا "انہیں کہیں چھپا دینا کلیانی کو نہ بتانا۔ پھر اور دوں گا!"

شانتا نے جواب دیا۔ "میں ان سے کوئی بات نہیں چھپاتی، یہ اشرفیاں بھی انہی کو دے دینا۔"

یاور خان نے بے بسی سے سوچا کہ اب یہ بات کلیانی سے براہِ راست کر لینی چاہیئے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر کلیانی کو بہت زیادہ دولت کا لالچ دیا گیا تو وہ یہ بات مان لے گی!

لیکن جب اس نے یہی بات کلیانی سے کہی تو اس نے اسے ہنسی میں اڑا دیا۔ کہنے لگی۔ "یاور خان! اتنی باریکیوں میں کون جاتا ہے تم تو بس یہ سمجھو کہ اس کوچے میں سب کچھ رواہے یہاں کچھ بھی ناجائز نہیں، سب کچھ جائز ہے، اس کوچے میں رشتوں کنبوں کا کہاں گزر ہے، ہم سب بکاؤ ہیں، قیمت دو، مال لو، خواہ مخواہ کیوں چکروں میں پڑتے ہو۔"

یاور خان نے تھک کر کہا۔ "کلیانی! یہ معاملہ ہی دوسرا ہے۔ میں نے جو پیشکش کی ہے اس پر خوب غور کر لو، یہ سودا ہر قیمت پر ہونا ہے۔"

کلیانی نے شرارتاً پوچھا۔ "میرے لیئے اب تو کسک نہیں ہوتی تمہارے دل میں ؟"

"ہوتی کیوں نہیں!" یاور خان نے مکاری سے جواب دیا۔ "شانتا کے لئے کسک نہیں ہوتی بلکہ یہ تو معاملہ ہی کچھ اور ہے!"

کلیانی نے جواب دیا۔ "معاملہ وا ملہ کچھ نہیں، یہ کیوں نہیں کہتے کہ شانتا بہت حسین ہے گدرائی ہے، اس میں رس ہے اور جو کچھ اس میں ہے، مجھ میں نہیں ہے!"

یاور خان نے کہا۔ "تم بہت شریر ہو کلیانی ستانا تمہیں خوب آتا ہے!"

کلیانی نے جواب دیا۔ "تم مردوں سے کم ہی کم۔"

یاور خان زیادہ باتوں کا خواہشمند نہ تھا۔ کہا۔ "تمہیں میری پیش کش قبول کرنا پڑے گی، اس کے لئے میں اپنی آدھی جاگیر تک تمہیں دینے کو تیار ہوں!"

کلیانی نے دکھائی سے جواب دیا۔ "آدھی کیا اگر تم ساری جاگیر دے دو تب بھی یہ

کام نہ ہوگا !"

یادر خان نے کہا۔ "مجھے جلدی نہیں ہے پہلے خوب سوچ سمجھ لو، اس کے بعد کوئی جواب دینا، میں شاشا کے ساتھ تمہیں بھی اپنے گھر لے چلنے کو تیار ہوں !"

"خوب !" کلیانی کھلکھلا کر ہنس دی۔ "شاشا نے پوری طرح فتح کر لیا ہے تمہیں، سوچوں گی !"

یادر خان کو امید بندھی اور وہ امید و بیم لئے گھر واپس گیا۔

سہ پہر کو نہالی یادر خان کے پاس پہنچ گیا، اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگا، وہ سمجھا، کلیانی نے رات بھر غور و فکر کر کے اس کی پیشکش قبول کر لی ہے اور نہالی کو بلانے کے لئے بھیجا ہے، وہ نہالی سے بات کیے بغیر اندر چلا گیا اور بیوی سے کہا۔ "جیسی کہ مجھے امید تھی، بات بن گئی ہے، میں شاشا سے عنقریب شادی کر لوں گا !"

بیوی نے جواب دیا۔ "شوق سے کرو لیکن میں یونس کو لے کر چناد گڑھ چلی جاؤں گی !"

یادر خان نے حیرت سے پوچھا۔ "تم تنہا جانا چاہو تو جا سکتی ہو یونس کو لے کر کیوں جاؤ گی ؟"

"وہ خود بھی ان حالات میں یہاں نہیں رہنا چاہتا وہ کہتا ہے اماں یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل چلو کہیں !"

یادر خان نے افسوس سے کہا۔ "وہ تمہارا بیٹا ہے۔ لیکن میں یہی کہوں گا کہ تم دونوں یہیں رہو، میں اپنی آدھی جاگیر یونس کے نام لکھنے کو تیار ہوں !"

بیوی سوچ میں پڑ گئی، یادر خان نہالی کے پاس چلا گیا اور پوچھا۔ "ہاں اب بتاؤ کیسے آنا ہوا ؟"

نہالی کہنے لگا۔ "کلیانی شاشا کو لے کر آگرے چلی گئیں، انہیں آپ سے کوئی کام ہے کہہ گئی ہیں کہ میں آپ کو لے کر آگرے پہنچوں !"

یادر خان کو پکا یقین ہو چکا تھا کہ بات بن چکی ہے اور کلیانی آگرے سامان کی خریداری کے سلسلے میں گئی ہے، وہ اسی وقت تیار ہوا اور نہالی کے ساتھ آگرے روانہ ہو گیا راستہ زیادہ دیر کا نہ تھا۔ مغرب سے پہلے آگرے پہنچ گیا۔ ٹھہرنے پر وہ سا تان دکھا تھا۔

دکانوں میں روشن دیئے دھواں دھواں نظر آرہے تھے۔

نہالی نے اسے ایک شاندار حویلی میں پہنچا دیا، لیکن یہ حویلی ہندوانہ مزاج کی تھی گھٹی گھٹی، تنگ تنگ، کلیانی نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ بولی۔ "یاور خان! تم سے ایک ضروری کام آپڑا ہے، کیا کر دو گے؟"

یاور خان نے ٹوہ لینے کے انداز میں پوچھا۔ "کیسا کام؟ کچھ کھل کے بتاؤ۔"

کلیانی نے پوچھا۔ "شیر شاہ کے دربار میں تمہاری کتنی پہنچ ہے؟"

یاور خان نے شیخی جھاڑی۔ "بہت، بادشاہ ہم پر بہت مہربان رہتا ہے۔"

کلیانی اسے لئے ہوئے ایک بند کوٹھری کے سامنے پہنچی۔ کوٹھری کے سامنے ایک غمزدہ جوان سر پکڑے بیٹھا ہوا تھا، کلیانی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یاور خان! یہ میرے تایا کا لڑکا ہے کوٹھری میں اس کی جورو بند ہے!"

جوان نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا، یاور خان اس کی ڈبڈبائی آنکھیں دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ پوچھا۔ "کلیانی! یہ معاملہ کیا ہے؟"

کلیانی نے کہا۔ "وہی تو بتانے جا رہی ہوں۔ یاور خان! ہمارا خاندان برا نہیں ہے ہم لوگ برے دھندوں میں پڑ گئے ہیں، ورنہ دوسرے لوگ عزت و آبرو کے پیشے کرتے ہیں، یہ میرے تایا کا لڑکا، پنساری ہے، چوک میں اس کی بڑی دکان ہے، کل اس کی جورو اپنے گھر میں برہنہ نہا رہی تھی باہر ہاتھی پر سوار بادشاہ کا بیٹا گزر رہا تھا اس کی ــــــ برہنہ جورو پر نظر پڑ گئی اور ازراہِ مذاق ہنس کر اس کی طرف پان کا بیڑا۱؎ اچھال دیا۔ عورت غریب شرم سے پانی پانی ہو گئی اور خودکشی کرنے ہی والی تھی کہ اس کا دو سروں کو پتہ چل گیا اور پکڑ دھکڑ کر اس کو کوٹھری میں بند کر دیا!"

یاور خان نے حیرت سے پوچھا۔ "پھر اس معاملے میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

کلیانی نے کہا۔ "میرے تایا کے بیٹے کو شیر شاہ تک پہنچا دو، ایسا ظلم تو نہیں ہونا چاہیئے!"

یاور خان نے موقع غنیمت جانا۔ پوچھا۔ "اور اس میرے معاملے میں کیا سوچا تم نے؟"

"اس پر میں بعد میں بات کروں گی؟"

یاور خان نے پوچھا۔ "سرِدست بس اتنا بتا دو کہ جواب ہاں میں ہو گا یا

نہیں ہیں ؟"

کلیانی نے جواب دیا۔ "شانتا ایک شرط پر تمہارے گھر چلی جائے گی، معلوم نہیں اسے تم مانو گے بھی یا نہیں۔"

یادر خان نے سرشار ہو کر کہا۔ "اگر شانتا کسی شرط پر میرے گھر جا سکتی ہے تو میں ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔"

دوسرے دن صبح ہی یادر خان نے کلیانی کے تایا ناد بھائی کو شیر شاہ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مقدمے کی روداد سن کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اس نے اسی وقت بیٹے کو گرفتار کر کے دربار میں بلوا لیا۔

درباری دم بخود تھے کہ دیکھئے کیا فیصلہ ہوتا ہے، بیٹے نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ شیر شاہ نے فوراً ہی مقدمے کا فیصلہ سنا دیا۔ "مجرم کی بیوی کو برہنہ کر کے اسی جگہ بٹھایا جائے اور فریادی کو ہاتھی پر سوار کر کے اس راہ سے گزارا جائے، جب فریادی کی نظر مجرم کی برہنہ بیوی پر پڑے تو وہ اسی طرح پان کا بیڑا اس پر اچھال دے۔"

دربار پر سناٹا طاری ہو گیا۔ یادر خان کنکھیوں سے کلیانی کے تایا ناد بھائی کو دیکھنے لگا۔

شیر شاہ نے گرج کر کہا۔ "فیصلے کی تعمیل ہو!"

مدعا علیہ قدموں میں گر گیا، اس کی آواز رندھ گئی۔ "غلام نے انصاف پا لیا غریب پرور، یہ ناچیز شہزادے سے بدلہ نہیں لینا چاہتا۔"

بڑے بڑے میدانوں میں شیر کی طرح اکڑ جانے والے بادشاہ پر رقت طاری ہو گئی، اٹک اٹک کر بولا۔ "ہم نے رسول اللہ سے تاج شاہی لیتے وقت یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم حکومت عدل و انصاف سے کریں گے ہم اس وعدے سے کس طرح پھر سکتے ہیں!"

یادر خان نے دست بستہ عرض کیا۔ "جب مدعا علیہ خود معاف کر رہا ہے تو جہاں پناہ کو بھی خاموشی اختیار کرنی چاہیئے۔"

کلیانی اور دوسرے افراد کو اس فیصلے کی توقع نہیں تھی، وہ رات انہوں نے خوشی اور انبساط میں گزار دی، یادر خان نے جب بھی شانتا کی بات چھیڑی اس نے یہی کہا "بات گھر چل کر کروں گی۔"

کلیانی نے یاور خان کو دو ہفتے تک دم دلاسے دیے اس کے بعد ایک دم یہ شرط لگادی کہ "آدھی جاگیر شانتا کو دے دو!"

اس نے آدھی جاگیر شانتا کے نام لکھ دی اور کلیانی پر اعتماد قائم کرنے کے لئے کاغذات اس کے حوالے کر دیے کیونکہ اسے یہ اطمینان تھا کہ اگر کلیانی قول و قرار سے پھر گئی تو شیر شاہی عہد میں وہ اسے مزہ بھی چکھا دے گا۔

ادھر شادی کی بات پکی ہو گئی ادھر بیوی نے روانگی کی تیاریاں شروع کر دیں یاور خان خاموشی سے سب دیکھتا رہا۔ اس نے اس عورت کے ساتھ بڑے اچھے دن گزارے تھے اس کی جدائی سے دکھ محسوس کر رہا تھا۔ یونس خان بھی چلا جائے گا۔ اس نے بیوی کو روکنا چاہا تو بیوی نے رکنے کی یہ شرط لگادی کہ آدھی جاگیر یونس خان کے نام لکھ دو، کیونکہ اب تمہارا اعتبار نہیں رہا، تم کسی وقت کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہو۔"

یاور خان پس و پیش میں پڑ گیا۔ آدھی جاگیر شانتا کے نام منتقل کر چکا تھا، اب آدھی، بیوی یونس خان کے نام منتقل کرانا چاہتی تھی اور اس نے بیوی سے وعدہ بھی کر رکھا تھا۔ اب ان حالات میں عقل کام نہ کرتی تھی کہ کیا کرے، آخر وہ نتیجے پر پہنچا کہ آدھی جاگیر یونس کے نام کر دینی چاہیے، شادی کے بعد شانتا کی جاگیر تو اسے مل ہی جائے گی، اور یونس خان ساتھ ہی رہے گا۔ اس پر بھی خود اسی کا تصرف رہے گا۔ اس نتیجے پر پہنچتے ہی اس نے خلوص کے ساتھ بقیہ آدھی جاگیر یونس خان کے نام منتقل کر دی۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ دن تاریخ کے لئے کلیانی کے پاس پہنچا تو کلیانی نے اس سے کچھ عجیب سی باتیں شروع کر دیں، اس نے ایک بار پھر ماضی کا ذکر چھیڑ دیا اور یاور خان سے پوچھا۔ "یاور خان وہ بھی کیا دن تھے جب تم اور تمہارے چچا، دونوں ہی مجھ پر دولت اور وقت صرف کر رہے تھے!"

یاور خان نے بے دلی سے کہا۔ "ہاں وہ بہت برے دن تھے۔"

کلیانی نے پوچھا۔ "وہ برے دن کیوں تھے؟"

یاور خان نے جواب دیا۔ "میرے مقابلے میں چچا مرحوم کو اپنی عمر کا خیال کر کے تم سے کنارہ کشی ضرور اختیار کر لینی چاہیے تھی۔"

کلیانی نے مسکرا کر شرارت سے اسے دیکھا، بولی۔ "اس کوچے میں عمر یا دوسرے آداب کیا حیثیت رکھتے ہیں بھلا؟"

یاور خان نے منطق سے اسے زیر کرنا چاہا، بولا۔ "اس کوچے سے باہر تو ہم دونوں چچا بھتیجے تھے ہم دونوں جس معاشرے سے چل کر تمہارے کوچے تک آتے تھے اس کے تو کچھ آداب ہیں، ان آداب کا چچا مرحوم کو ضرور خیال رکھنا چاہیئے تھا!"

کلیانی نے کہا۔ "تمہی کنارہ کشی اختیار کر لیتے!"

یاور خان نے حیرت سے کہا۔ "وہ کیوں؟"

"یہ اس لیے کہ وہ تمہارے بزرگ تھے ان کا ادب تم پر لازم تھا!"

یاور خان نے اپنے حق میں دوسری دلیل دی۔ "اگر تم ان کی ہم عمر ہوتیں تو میں ضرور کنارہ کشی اختیار کر لیتا تم میری ہم عمر تھیں، میرے جوڑ کی تھیں، میرے مقابلے میں تم سے چچا مرحوم کا عشق، عشق نہیں بوالہوسی تھا۔" یہ کہتے کہتے وہ شرما گیا کیونکہ عمر کا وہی فرق اب شاننا اور اس کی عمر کے درمیان پایا جاتا تھا۔

کلیانی نے نشتر چبھویا۔ "کیا تمہاری شاننا سے محبت بھی بوالہوسی کا نتیجہ ہے کیونکہ تم دونوں کی عمروں میں وہی فرق موجود ہے جو کبھی تمہارے چچا کی اور میری عمروں میں پایا جاتا تھا۔"

یاور خان نے ایک نئی دلیل کا سہارا لیا۔ "لیکن یہاں میں شاننا کا واحد طلب گار ہوں، اس لئے اب ان باتوں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

کلیانی نے صفا جواب دیا۔ "لیکن یہ شادی نہیں ہو سکتی!"

یاور خان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، سناٹے میں آ گیا، پوچھا۔ "کیوں، شادی کیوں نہیں ہو سکتی، میں نے اس شادی کی شرط میں اپنی آدھی جاگیر شاننا کے نام لکھ دی ہے، یہ تو سراسر دغابازی ہے تمہاری!"

کلیانی نے جاگیر کے کاغذات یاور خان کے منہ پر مار دیتے اور چیخ کر بولی۔ "مجھے نہیں چاہیئے تمہاری جاگیر، سنبھالو اپنی جاگیر کے کاغذات، میری شاننا کو جاگیر کی کمی نہیں ہے!"

یاور خان نے نرم رویہ اختیار کیا۔ "تم ناراض ہو گئیں؟ آخر کوئی وجہ بھی تو معلوم ہو اس خفگی کی؟"

کلیانی انتہائی جذباتی ہو رہی تھی، بولی۔ "تم اپنی عمر دیکھو اور شاننا کی عمر دیکھو، تمہیں یہ بات کہتے ہوتے شرم آنی چاہیئے تھی!"

یاور خان نے مایوسی سے کہا۔ "جب ایسی بات تھی تو تمہیں یہ بات یہاں

تک نہیں بڑھانی چاہیئے تھی! میں نے تو تمہاری خواہش پر اپنی آدھی جاگیر شانتا کے نام کر دی تھی۔"

کلیانی نے جواب دیا۔ "بات جاگیر کی نہیں ہے، دونوں کی عمروں کے فرق کی ہے۔ اب ایک دوسرے جاگیر دار کا رشتہ شانتا کے لئے آگیا ہے یہ جاگیردار نہ صرف شانتا کا ہم عمر ہے بلکہ تمہاری ہی جتنی جاگیر کا مالک بھی ہے!"

یادور خان کی وہ کیفیت تھی جیسے سر پر آسمان پھٹ پڑا ہو، پوچھا۔ "کون ہے وہ جاگیردار؟"

کلیانی نے کہا۔ "وہ کوئی بھی ہو، تمہیں اس سے کیا مطلب؟"

یادور خان نے مردہ دلی سے پوچھا۔ "کیا اس نے اپنی جاگیر شانتا کے نام لکھ دی ہے؟"

"ہاں لکھ دی ہے!" کلیانی نے جواب دیا۔ "کیا تم وہ کاغذات دیکھنا چاہتے ہو؟"

"ہاں!" یادور خان نے عالم خواب میں کہا۔ "لیکن کلیانی، میں یہ جتائے دیتا ہوں کہ شانتا کی کسی اور سے شادی نہیں ہو سکتی!"

کلیانی نے خوشی میں کہا۔ "کیسے نہیں ہو سکتی کسی اور سے شادی! وہ شانتا کا ہم عمر ہے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے تم خود یہ فیصلہ دے چکے ہو کہ اگر تمہارے مقابلے میں شانتا کا کوئی اس کا ہم عمر امیدوار ہوتا تو تم اس سے دستبردار ہو جاتے!"

یادور خان نے غصے میں کہا۔ "ہاں لیکن اب بات کچھ اور ہو گئی ہے تم نے مجھ سے فریب کیا ہے دھوکا دیا ہے، تمہیں اور شانتا کو اس دھوکا دہی کی سزا ضرور ملے گی اور ساتھ ہی اس جاگیردار کو بھی، جو خواہ مخواہ ہمارے درمیان میں آگیا ہے۔"

پھر کچھ ٹھیر کر بولا۔ "مجھے وہ دوسرے کاغذات بھی دکھاؤ، جو تمہیں کسی دوسرے نوجوان جاگیردار نے دیئے ہیں!"

کلیانی نے کہا۔ "تم وہ کاغذات ضائع تو نہیں کر دو گے؟"

یادور خان نے اپنے کاغذات دوبارہ کلیانی کے حوالے کر دیئے بولا۔ "انہیں ضمانت میں رکھ لو۔"

کلیانی نے یادور خان کے کاغذات قبضے میں کیئے اور اندر سے دوسرے کاغذات لاکر یادور خان کے سامنے ڈال دیئے۔ یادور خان نے جھپٹ کر کاغذات اٹھالیئے اور ان کے

اندراجات پڑھتے ہی اسے چکر سا آگیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا سا چھا گیا۔ انتہائی کرب سے پوچھا۔ "یہ یونس خان کو کس طرح پھانسا تم نے ؟"

کلیانی نے تلملا کر جواب دیا۔ "ہم نے نہیں، خود یونس خان نے شانتا کو پھانسا ہے !"

"خوب !" یادر خان پھیکی ہنسی ہنسنے لگا۔ "تو تمہارا کیا خیال ہے ؟ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ یہ شادی واقعی ہو جائے گی ؟"

کلیانی نے طنز سے کہا۔ "خیال ! خیال کی بھی ایک ہی رہی، میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ یہ شادی ہو کر رہے گی، اسے کوئی بھی نہیں روک سکتا !"

یادر خان نے کاغذات اپنے قبضے میں رکھے اور کھڑا ہوتا ہوا بولا۔ "کلیانی ! بات آن کی ہو گئی ہے، میں یہ کاغذات لئے جا رہا ہوں، میرے کاغذات تم اپنے پاس رکھو، شانتا کی شادی مجھی سے ہو گی، تمہیں یہ بات بالکل زیب نہ دیتی تھی، جب میں یہاں آ جا رہا ہوں تو میرے بیٹے یونس کو یہاں نہیں آنے دینا چاہیئے تھا۔"

کلیانی چراغ پا ہو گئی۔ "اس کوچے میں سب کچھ جائز ہے یہ سبق تم ہی نے مجھے دیا تھا، میں اسے کس طرح بھلا سکتی تھی بھلا ؟"

یادر خان غصے میں جانے لگا۔ "تم جو چاہو کہو لیکن میں صرف ایک بات جانتا ہوں، شادی یونس سے نہیں ہو سکتی، مجھ سے ہو گی، یہ ضد اور آن کی بات ہے اور کچھ نہیں !"

کلیانی نے بھی اسی اعتماد سے جواب دیا۔ "اور میں یہ کہتی ہوں کہ یہ شادی تم سے نہیں ہو سکتی، ذرا ٹھیرو میں شانتا کو بلاتی ہوں !"

شانتا کے خیال سے یادر خان جاتے جاتے ٹھیر گیا۔ تھوڑی دیر بعد بنی سنوری شانتا اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی وہ چونک پڑا۔ حیرتوں کے پہاڑ تھے کہ اس پر پے در پے ٹوٹ رہے تھے شانتا کی شکل میں ہو بہو اس کی پہلی بیوی سامنے کھڑی تھی، وہی کپڑے، وہی زیورات، سب کچھ وہی حتیٰ کہ شال تک وہی تھا جو کبھی اس نے کلیانی کو پیش کیا تھا اور پچا تو پیر خاندان کی یادگار سمجھ کر واپس لے گئے تھے۔

یادر خان کا سر پھٹنے لگا۔ اس نے سہمے سہمے لہجے میں پوچھا۔ "کلیانی ! یہ سب کیا ہے ؟ میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

کلیانی کا دل بھر آیا، ہونٹ تھرتھرانے لگے آنکھیں بھر آئیں۔ "شانتا میری بیٹی

نہیں ہے، میں بانجھ ہوں، یہ تمہاری بیٹی ہے۔"

"میری بیٹی!" یادرخان کو چکر آگیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔

"ہاں تمہاری بیٹی!" وہ کہنے لگی۔ "تمہارے چلے جانے کے بعد میں تمہارے چچا کے گھر بیٹھ گئی تھی، پھر جب رانا سانگا کی شکست کے بعد اس بستی کو تہ تیغ کیا گیا تو مجھے کنچنی سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا، مجھے نہیں معلوم تمہاری بیوی کا کیا حشر ہوا۔ اس بچی کو ظالموں نے چھوڑ دیا تھا، یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ مجھے اس بچی کے ساتھ ہی تمہاری بیوی کے چند صندوق بھی مل گئے تھے جن میں اس کے زیورات اور کپڑے رکھے ہوئے تھے!"

یادرخان تصویر حیرت بنا کلیانی کو دیکھتا رہا۔ کلیانی نے مزید کہا۔ "میں نے اپنا پیشہ ترک کر دیا تھا، سازندوں کو رخصت کر دیا تھا لیکن شانتا کو رقص و موسیقی کی تعلیم ضرور دی تھی، مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم دوبارہ پھر اپنی جاگیر پر واپس آؤ گے!"

پھر گہرا سکوت چھا گیا۔ دونوں خاموش ہو گئے، شانتا نے شرم سے منہ پھیر لیا، یادرخان اور کلیانی سر جھکائے روتے رہے۔ یکایک کلیانی نے سر اٹھایا۔ بولی۔ "یہ بات میں نے شانتا کو بھی نہیں بتائی تھی!" پھر شانتا سے بولی۔ "شانتا بیٹی! یہ تمہارے باپ ہیں انہیں سلام کرو۔"

شانتا کی بھی عجیب حالت ہو گئی۔ اس نے دلہنوں کی طرح گھونگٹ نکال لیا اور خالص ہندوانے انداز میں یادرخان کے قدموں میں جھک کر پیر پکڑ لیے۔

کلیانی نے مزید کہا۔ "اب شانتا تمہاری ہے جس سے چاہو شادی کر دو، رہا نام کا مسئلہ تو یہ نام میں نے رکھا تھا، اب تم اس کا کوئی اسلامی نام رکھ سکتے ہو!"

یادرخان نے جوش دیوانگی میں سر دیوار سے ٹکرا دیا اور پے در پے اتنی ضربیں لگائیں کہ پورا سر اور چہرہ لہولہان کر لیا۔ خنجر پاس نہ تھا ورنہ شاید خودکشی کر لیتا۔ کلیانی نے بہت زیادہ سنبھالنے کی کوشش کی لیکن نہ سنبھال سکی جب یادرخان پر بے ہوشی نے غلبہ کیا تب قابو میں آیا۔

یادرخان جب ہوش میں آیا تو اپنے آس پاس ایک مجمع دیکھا، کلیانی، شانتا، بیوی اور یونس خان سبھی موجود تھے، اس نے انہیں دیکھا اور شرمندگی سے آنکھیں بند کر لیں، شب و روز کی تیمارداری سے جب یادرخان کی حالت سنبھلی تو اسے چپ لگ چکی تھی

صحت مند ہونے کے بعد اس نے شانتا کی جاگیر اس کے نام اور یونس کی یونس کے نام رہنے دی، اس نے کلیانی سے کہا۔ "شانتا تو یونس سے منسوب ہو جائے گی، اب تم نے کیا سوچا ہے اپنے لئے؟"

کلیانی نے جواب دیا۔ "اب تک جو پاپ کیے ہیں انہیں دھونے کے لئے ہمیشہ کے لئے ہردوار چلی جاؤں گی۔"

یادر خان نے کہا۔ "تم چاہو تو میرے ساتھ رہ سکتی ہو!"

کلیانی نے جواب دیا۔ "وقت گیا بات گئی، اب یہ نہیں ہو سکتا!"

یادر خان نے آہستہ سے کہا۔ "ان حالات میں تو اب میں بھی یہاں نہیں رہ سکتا میں بھی کہیں چلا جاؤں گا۔"

کلیانی نے پوچھا۔ "کہاں چلے جاؤ گے؟"

یادر خان نے اداس لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے بھی اس کا علم نہیں۔"

یونس اور شانتا کی شادی ہو گئی، کلیانی ہردوار چلی گئی، یادر خان بھی کہیں چلا گیا اور پھر کبھی واپس نہ آیا، کچھ کہتے وہ کہیں ڈوب مرا اور کچھ کا یہ خیال تھا کہ کلیانی کے ساتھ ہردوار چلا گیا۔ کیونکہ ان کے دلوں میں جو عشق سویا ہوا تھا پوری شدت اور توانائی سے جاگ چکا تھا۔ وہ عشق جہاں ذات پات کی تفریق نہیں ہوتی، خاندان اور نسل کی روایات کا پاس نہیں کیا جاتا۔





الیاس سیتاپوری
کی
منتخب
تاریخی
کہانیاں

اندر کا آدمی

تاریخ کا تجسس، رومان کا کیف اور زبان و بیان کا پرشکوہ سحر ایک قاری جو کچھ چاہتا ہے ان کہانیوں میں موجود ہے۔ یادگار تاریخی کہانیاں جو اردو ادب میں سنگ میل ثابت ہوئیں۔

عمدہ کاغذ، رنگین ٹائیٹل اور فوٹو آفسیٹ سے عمدہ طباعت۔ قیمت: ۱۰ روپے

(علاوہ محصول ڈاک)

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲